اسلام کا نظریۂ حیات

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ، ایم اے - ایل - ایل - بی

کی انگریزی کتاب ISLAMIC IDEOLOGY کا ترجمہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ ، لاہور - پاکستان

اسلام کا نظریۂ حیات

از

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ترجمہ : قطب الدین احمد

نظرثانی : شاہد حسین رزاقی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ ، لاہور - پاکستان

بار اول
۱۹۵۷ء

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ناظم ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، نے
رپن پرنٹنگ پریس ، بل روڈ ، لاہور میں باھتمام میرزا
محمد صادق چھپوایا اور کلب روڈ ، لاہور سے شائع کیا

عرض مترجم

پیش نظر کتاب جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی بلند پایہ تصنیف ISLAMIC IDEOLOGY کا ترجمہ ہے جو اسلامی لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ اور ڈاکٹر صاحب کے وسیع علم ، عمیق مطالعہ اور اسلامی تعلیمات پر صحیح غور و فکر کا نتیجہ ہے ۔ مسلمانوں میں ایسے اصحاب علم کا قحط ہے جو اسلام کے اساسی عقائد و اصول کو ان کی اصلی معنویت قائم رکھتے ہوئے نئے اسلوب میں مغربی دنیا کے سامنے پیش کر سکیں ۔ یہ کام وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو قدیم و جدید دونوں علوم پر کامل عبور رکھتا ہو اور ہر مسئلہ کی صحیح تشریح و توضیح کر سکے ۔ ڈاکٹر صاحب میں یہ صلاحیت پوری طرح موجود ہے اسلئے وہ ایک ایسی کتاب پیش کرنے میں کامیاب ہوئے جو ایک طرف تو مغربی دنیا کے سامنے نجات و سعادت کی راہیں کھولتی اور دعوت فکر و نظر دیتی ہے اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو جمود و بے حسی اور تقلید پرستی کے طلسم توڑ کر اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتی ہے ۔ اس کتاب کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اردو میں اس کا ترجمہ کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی اور میں نے اپنی استعداد کے مطابق اس علمی سرمایہ کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مجھے اعتراف ہے کہ اصل زبان میں جو دل آویزی و رعنائی ہے وہ ترجمہ میں نہیں ۔ چنانچہ اس کتاب میں اگر کوئی خامی نظر آئے تو اس کو میری کوتاہی پر محمول فرمائیں ۔

قطب الدین احمد

فہرست

	عنوان	صفحہ
مقدمہ	-	۱
باب اول	- ایمان کی راہ میں موانع	۲۴
باب دوم	- مذہب فطرت اور فوق الفطریت ...	۴۰
باب سوم	- علاقۂ علت و معلول کا قرآنی تصور ...	۵۰
باب چہارم	- اسلامی خدا پرستی	۶۴
باب پنجم	- صفات الٰہی	۷۷
باب ششم	- صفات ذاتی	۹۳
باب ہفتم	- خدا کی قدرت کاملہ اور ہمہ خیریت ...	۱۱۶
باب ہشتم	- مذہب کا اسلامی تصور	۱۳۴
باب نہم	- عبادت و اطاعت	۱۷۸
باب دہم	- اخلاقیات اسلام	۲۰۰
باب یازدہم	امن اور جنگ	۲۶۹
باب دوازدہم	اسلامی مملکت کے اساسی تصورات ...	۲۸۷
باب سیزدہم	نظامہائے فکر کا تقابلی مطالعہ ...	۳۶۱
باب چہاردہم	تجدید و احیاء	۴۰۹
باب پانزدہم	پیغمبر اسلام اور حریت انسانی ...	۴۶۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمه

زیر نظر کتاب میں اسلام کے اساسی تصورات کو پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی - اسلام دنیا کے بڑے مذاهب میں ایک قدیم ترین اور ساتھ هی ایسا جدید ترین مذهب هے جس کو نوع انسانی کا ایک معتدبه حصه مانتا اور ایک گونه اس پر عمل پیرا هے - اسلام ایسا هی قدیم هے جیسے که خالق اور اس کی مخلوق - عالم انسانیت کی صفحۂ هستی پر نمود سے قبل یہی مذهب کائنات اور موجودات کا تھا ، اور یہی سلسله بعد میں دین فطرت سے موسوم هو کر قائم و جاری رها - قرآن کے عقیده کے مطابق اولین انسان جو پیرایۂ علم سے سنوارا گیا ، وه مسلم کہلایا - یه غیر محدود صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا تھا تا که اخلاق الٰہی کو اپنے میں سمولے اور کرۂ ارض پر خلیفةالله کہلانے کے قابل بن سکے - اس کی سابقه حالت ایک فردوسی نوعیت کی حامل تھی جس میں وه فطری طریقه پر زندگی بسر کرتا تھا ، اور اپنے ماحول سے فطری مطابقت پیدا کر کے اپنی جبلی سرگرمیوں سے وجه زیست حاصل کرتا تھا - فطرت سے اس کا یه ارتقاء نامساعد حالات سے متصادم هؤا - بعض دیگر مذاهب ، حیات انسانی کی ابتداء هبوط آدم سے کرتے هیں ، قرآن بھی اس انقلابی کیفیت کو اسی اصطلاح سے تعبیر کرتا هے ، جس نے انسان کو اختیار و اراده عطا کرکے یه امکانات اس میں ودیعت کردئے که وه فطرت اور خالق فطرت سے روگردانی کر سکے -

عیسائی اس قصہ میں یہ رنگ آمیزی کرتے ہیں کہ انسان نے خیر و شر کے شجر علم کا ممنوعہ پھل کھایا تھا ، جس کے باعث وہ جنت سے نکالا گیا ۔ قرآن کی رو سے یہ علم نہیں بلکہ جہالت کا کرشمہ تھا جو اس کے اخراج کا سبب ہؤا ۔ اختیار و ارادہ کا یہ غلط استعمال ہی وجہ افتادگی بن گیا ۔ مگر قرآن اس کے ہبوط پر اپنی عمارت کی بنیاد نہیں رکھتا ۔ اس کے نزدیک گناہ یا ثواب ، برائی یا بھلائی موروثی نہیں ہیں ۔ انسان کے ذمہ دارانہ وجود کا آغاز اختیار و علم کے عطا ہونے سے ہوتا ہے اور ابتدائے آفرینش میں آدم کی لغزش کے سبب انسانیت کسی فطری معصیت سے داغدار نہیں ہوئی ۔ نظام اخلاق پر ایمان ، جس کا حکم اسلام دیتا ہے ، انسان کے اختیار کو پہلے سے تسلیم کرتا ہے ۔ اگر انسان کی آفرینش گناہ کی جانب غیر اصلاح پذیر خلقی رجحان پر مبنی ہو ، تو خالق کائنات الوہیت سے زیادہ اہرمنیت سے موسوم ہوگا ۔ ایسا الٰہ خیر محض ہوسکتا ہے نہ عادل و منصف ۔ اس لئے اسلام ایسے باطل عقیدہ کی ، جس سے گناہ آدم وراثتاً منتقل ہوتا رہے ، پر زور تردید کرتا ہے ۔ اخلاق کی دنیا میں کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا ۔ مرد اور عورت کو وہی ملے گا جو انہوں نے کمایا ہے ۔ انسانیت کی ابتداء اس کے اختیار و ارادہ کے ظہور سے ہوتی ہے ، جو اپنا اظہار خالق ، یا فطرت ، یا طبعی قوانین کی خلاف ورزی سے کرتا ہے ۔ انسان اپنی زندگی کا آغاز کسی برگشتہ جبلت سے نہیں کرتا ۔ اس کی تمام جبلتیں ، حیوانات کی طرح ، زندگی کے تحفظ کی آلہ کار ہیں اور صرف باطل علم اور اختیار کی بے راہ روی سے بدنظمی واقع ہوتی ہے ۔ انسان کی خلقت فطرۃاللہ پر ہوتی ہے ، اور یہی سچا مذہب ہے ۔ آنحضرت ص کا ارشاد ہے کہ انسان فطرت الٰہی

پر پیدا کیا گیا ہے* ۔ وہ کوئی عقیدہ لے کر پیدا نہیں ہوتا، یہ اس کے ماں باپ ہیں جو اس کو یہودی ، نصرانی اور مجوسی بناتے ہیں۔ یہ کسی گمراہ جبلت کی توریت نہیں ، بلکہ ایک سماجی ورثہ ہے جو اس کو مصنوعی ، خود ساختہ عقائد کی پابندی پر مجبور کرتا ہے ۔ ان معنوں میں اسلام کوئی عقیدہ نہیں ، بلکہ ایک دین فطرت ہے ۔ اگر اس کی اندرونی فطرت صحیح طریقہ پر بیرونی فطرت سے مطابقت پیدا کرلے تو وہ اس کو اپنے آپ سے اور خالق کائنات سے ہم آہنگ کردے گی ۔

اسلام ایسا دین نہیں جس کو آنحضرت ص نے ایجاد کیا ہو ۔ آنحضرت ص کا یہ ارشاد ہے کہ آدم سے لے کر اس وقت تک جتنے سچے مذہبی معلم خدا کی طرف سے صداقت کی تبلیغ و تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے وہ صرف ایک ہی دین کے ماننے والے تھے ، جس کے لئے عربی میں لفظ اسلام ہے ۔ اسلام کے معنی امن اور خود کو مشیت الٰہی کے سپرد کر دینے کے ہیں ۔ ان دونوں مفہوم کا ایک ہی نفسیاتی مادہ ہے ۔ اللہ سے مراد کائنات کی تخلیقی اور حفاظتی مشیت و ارادہ رکھنے والی ہستی ہے ، اللہ سے مفہوم توافق و ہم آہنگی ہے ، اور جو چیز بھی مائل بہ آویزش ہوگی وہ عدواللہ قرار دیجائے گی ۔ جب تک کوئی اپنے ارادہ کو مشیت کلی کے سپرد نہ کر دے وہ خود اپنی ذات سے یا دوسروں سے یا اپنے گرد و پیش سے بالعموم مطمئن نہیں رہ سکتا ۔ گناہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ کوئی اپنی ذات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے ۔ یہ انانیت ہی ہے جو اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے کہ تمام کی بھلائی گویا

* و ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ ... فابواہ یھودانہ او ینصرنہ او یمجسانہ — (شیخین) ۔

هر ایک کی بھلائی ہے - بجز اسلام کے کوئی دوسرا مذہب ایسا نہیں جو اپنے وصفی نام سے موسوم ہو - عیسائیت حضرت عیسیٰ سے منسوب ہوئی ، بدھ مت گوتم بدھ کا مذہب کہلایا ، اور زرتشتیت زرتشت کا دین قرار پایا - محمدؐ نے اس کو روا نہیں رکھا کہ جس دین کی آپ نے تبلیغ فرمائی ہے وہ آپ کے بعد آپ کے اسم گرامی سے موسوم ہو - آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ یہ نہ صرف میرا ہی دین ہے بلکہ یہی دین عیسیٰ ، موسیٰ اور ان لاتعداد پیغمبروں کا تھا جو مختلف قوموں میں مبعوث ہوئے - "کوئی قوم ایسی نہیں جس کے لئے ہم نے ایک آگاہ کرنے والا نہ بھیجا ہو" * -

ایک مذہبِ اتحاد کی طرح اسلام نے وحدت ادیان کا اصول پیش کیا - تاہم اسلام صرف انہی مذاہب کی سچائی تسلیم کرتا ہے جو توحیدی مذاہب تھے - اس لئے اس کے عقیدہ میں وحدت ادیان کے تحت وہی مذاہب آسکتے ہیں جو خدا کی وحدانیت کے قائل تھے - دیگر تمام ادیان وحشت و جہالت کی یادگار ہیں جو انسان کو اس کے درجہ سے گرا کر حیوانیت کی سطح پر لے آتے ہیں - قرآن کہتا ہے ایسے آدمی مثل حیوان کے ہیں ، نہیں بلکہ وہ ان سے بھی فروتر ہیں † - جس مفہوم میں قرآن نے یہ اصطلاح استعمال کی ہے اس کی رو سے اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے - جہاں کہیں سچا دین ہوگا وہاں نجات کی اجارہ‌داری نہوگی - قرآن کہتا ہے نہ ابراہیمؑ یہودی تھے ، اور نہ عیسیٰؑ نصرانی تھے ‡ ، ان کا مذہب وہی ازلی وابدی اسلام تھا -

---

* و ان من امة الا خلافیها نذیر — فاطر ۲۴

† اولٰئک کالانعام بل هم اضل — اعراف ۱۷۹

‡ ما کان ابراهیم یهودیا ولا نصرانیا — آل عمران ۶۷

یعنی وہ مذہب جس میں خدا اور انسان کی مشیت ایک ہو جائے تاکہ وہ کامل ہم آہنگی پیدا ہو سکے جو نہ صرف انسانیت بلکہ تمام مخلوقات کے لئے ایک مثالی محرک اور منزل مقصود ہے۔ ''عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کا کوئی مذہب نہیں، یہودی کہتے ہیں عیسائیوں کا کوئی مذہب نہیں، دونوں اپنی ٹولیوں کے لئے نجات کی اجارہ داری کے دعویدار ہیں''*۔ قرآن سچائی اور نجات کی اجارہ داری کے جملہ تصورات کی بالکلیہ تردید کرتا ہے۔ نجات اور امن یہاں اور مابعد زندگی میں صرف اس کے لئے ہے جو خود کو خالق کائنات کے سپرد کردے اور نیک اعمال ہو۔ قرآن کی رو سے مذہب کے یہی لوازم ہیں۔ نظام اخلاق یا مکافات عمل پر خدا کی ہستی کے ساتھ ایمان، جو سرچشمہ ہے تمام اخلاق اور فطری نظام کا۔ یہی اعتقاد ایک انسان کے ایمان کی تکمیل کرتا ہے، بشرطیکہ وہ نیک اعمال ہو۔ اس کے بعد اسلام کی تمام چیزیں ضمنی نتائج ہیں جو منطقی طور پر اس بنیادی نظریہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جس نے بھی یہ نقطۂ نگاہ رکھا اس نے صداقت اور سچائی پالی خواہ وہ رسمی اسلام کے حدود میں ہو یا اس سے باہر۔ قرآن ایک سے زائد جگہوں پر مختلف طریق تعبیر سے اس صورت حال پر زور دیتا ہے:

ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصری والصابئین من آمن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولاھم یحزنون (بقرہ — ۶۲)

جو لوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لائے ہیں، وہ ہوں، یا وہ لوگ ہوں جو یہودی کہلاتے ہیں، یا نصاریٰ

* و قالت الیھود لیست النصاریٰ علی شی و قالت النصریٰ لیست الیھود علی شی — بقرہ ۱۱۳

اور صابی ہوں (کوئی بھی ہو اور کسی گروہ بندی سے
تعلق رکھتا ہو، لیکن خدا کا قانون نجات یہ ہے کہ)
جو بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا، اور
اس نے اچھے کام بھی کئے تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر
اپنے پروردگار سے ضرور پائیگا، اس کے لئے نہ تو کسی
طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

یہ محض مذہبی رواداری نہیں ہے جو بہت ہی منفی
حیثیت رکھتی ہے، بلکہ اہل ایمان کی برادری کو وسعت
دینے کے لئے مثبت احکام ہیں، جو ایمان و اعتقاد کے لوازم
رکھتے ہیں، خواہ وہ اپنے قوانین و رسوم میں کتنے ہی
مختلف کیوں نہ ہوں۔ ہر عقیدہ اور ضابطہ کی طرح اسلام
کے بھی خود اپنے شعائر و رسوم ہیں، لیکن وہ ان کو
نہایت ہی ذیلی اور ثانوی حیثیت دیتا ہے۔ مشتے نمونے از
خروارے، اسلام ہر مسلمان کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ
نماز ادا کرتے وقت اپنا رخ کعبہ کی طرف پھیر لیا کرے۔
مگر اس اندیشہ سے کہ کہیں اس کو اصل نہ قرار دے
لیا جائے، قرآن واضح طور پر کہتا ہے کہ "یہ اصل
نیکی نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر
لیا کرو، اللہ ہی کے لئے مشرق اور مغرب ہیں، تم جدھر
بھی اپنا رخ کروگے اسے اپنے سامنے پاؤگے۔ یہ حقیقی خوبی
نہیں کہ تم اپنا رخ کسی خاص سمت ہی پھیر لیا کرو" *۔

اسلام عام اصول بیان کرکے مطمئن نہیں ہو جاتا۔ یہ
ضروری سمجھا گیا کہ ایک ایسا طریق عمل اور ضابطۂ حیات

---

* لیس البر ان تولوا وجوهکم قبل المشرق والمغرب — بقرہ ۱۷۷
قل للہ المشرق والمغرب — بقرہ ۱۴۲

مہیا کیا جائے جو انفرادی اور اجتماعی اصول اپنے اندر مجتمع کرلے۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو ایک معین نظریۂ زندگی کا حامل ہے۔ کسی بڑے مذہب کا مبلغ ایسا نہیں جسے تاریخ نے معاشی، معاشری اور سیاسی زندگی جیسے اہم شعبہ ہائے حیات کے تمام پہلوؤں سے دو چار ہونے کے مواقع بہم پہنچائے ہوں۔ آپ نے ایک غریب گلہ بان اور مزدور کی طرح زندگی کی ابتداء فرمائی، ایک نوجوان کی حیثیت سے تجارتی کارواں کے ساتھ سیاحت فرمائی، ایک تجارتی کارندہ کی طرح کام انجام دیا، بعد ازاں ایک مثالی خوشگوار زندگی ایک شوہر اور ایک باپ کی حیثیت سے گذاری، ایک آگاہ کرنے والے کی طرح انسانی ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی۔ پہلے محبت سے اپنے دشمنوں کا دل موہ لیا، اور جب حالات نے مجبور کیا تو اقل ترین قوت سے اپنے ستانے والوں کو زیر کیا، جب ان پر کامیابی حاصل کی تو فراخ دلی اور فیاضی سے عفو و درگذر فرمایا، جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ نے ایک ایسی جگہ اور ایسے لوگوں میں مملکت کی داغ بیل ڈالی جہاں پہلے کچھ نہ تھا اور جن کا سیاسی شعور بجز قبائلی تنظیمات کے اور کچھ نہ جانتا تھا۔ آپ نے ایسے قوانین کا نفاذ فرمایا جو اپنے زمانہ سے بہت آگے اور انتہا درجہ بلند تھے، جن کا اس زمانہ میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے زمانۂ امن وجنگ میں بین الاقوامی تعلقات پر توجہ فرمائی۔ اور آخر میں ایک ایسا باہمی حق وانصاف کا نظام مرتب فرمایا جو حریت، اخوت اور مساوات پر مبنی تھا، جس کی تشکیل محض اخلاقی ضابطہ کی نہ تھی بلکہ ایک متعین اقتصادی مساوات کا خاکہ تھا۔ آپ کی جامع الصفات زندگی کے بوقلموں

نمونہ میں جو سنہری رشتہ تار و پود میں گتھا ہوا نظر آتا ہے، وہ یہی انسانیت اور سادگی کا رشتۂ زرنگار ہے۔ یہ سب کچھ ہونے پر بھی آخر میں مثل آغاز کے آپ وہی ایک سادہ اور متواضع انسان تھے۔ کیا تاریخ کوئی ایسا اسوۂ حیات پیش کرسکتی ہے جس میں ایک فرد کی ہستی تمام انسانیت کی زندگی اپنے اندر مرتکز کئے ہوئے اور سموئے ہوئے ہو؟

اسلام بحیثیت نظام زندگی کے ایک آئینہ اور نظارہ ہے حضور صلعم کی حیات طیبہ کا، اور اسی طرح قرآن آپ کی مبارک زندگی کا مرقع اور آپ کے اخلاق و عادات کا ضابطہ ہے۔ ایک شخص نے حضرت عائشہ رض سے عرض کیا کہ آنحضرت ص کے اخلاق و کردار بیان کیجئے، حضرت عائشہ رض نے ارشاد فرمایا ''کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ وہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا عکس و آئینہ ہے'' *۔

اسلام کی تیزرو اور ہمہ جہتی ترقی و اشاعت اور تہذیب و تمدن میں دنیا کی قیادت، اس کے اسی صحت بخش نظریہ اور ترقی پذیر نظام کے باعث تھی۔ اس کے سرعت سے پھیلنے کا سبب یہ تھا کہ وہ قانون اور معاشری عدل سے قبل انسانیت کی ان کثیر جماعتوں کو مساوات کی دعوت دیتا تھا جو ہر طرح کے ظلم و زیادتی کا شکار ہو رہے تھے۔ چند صدیاں گذرنے کے بعد اگرچہ اس کی یہ رفتار سست پڑگئی اور اسلام کے حریت افروز اور ترقی پذیر نظام نے بوقلموں رسمی اور تقلیدی مزعومات کیوجہ سے جمود اختیار کر لیا، تا ہم بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اسلام کا فقہی نظام بھی ترقی کرتا

---

* قالت الست تقرأ القرآن قلت بلیٰ قالت فان خلقه كان القرآن — مسلم، ابو داؤد، نسائی

رہا اور بڑے بڑے فقہاء قانون و رواج کے ایسے طریقوں کی نشر و اشاعت کرتے رہے جو نئے حالات سے مطابقت پیدا کر سکیں۔ لیکن ان کی یہ کوشش رہی کہ روح اسلام سے ، جو مماثل تھا عدل معاشری کے ، سرمو تجاوز نہونے پائے۔ حیات اسلامی کی نمود ایک نظام کی صورت میں ہوئی اور یہ آزادانہ نظام اس وقت تک قائم رہا جب تک زندگی کی امنگ مسلم قوم میں تخلیقی اور ترقی پذیر رہی۔

مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ اصول اسلام ابدی حیثیت رکھتے ہیں ، اور ایسے ہی وہ طریق عمل جسے شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں یہ کوشش کی جائے گی کہ اسلام کی اس ابدی و عالمگیر حیثیت کو منصۂ شہود پر لایا جائے۔ مصنف کتاب کا یہ اعتقاد ہے کہ شریعت کی اساس و بنیاد بھی قرآن کی تعلیمات اور مستند احادیث وسنت کے مطالعہ ونظر کے بعد ابدی حقائق پر ٹھہرتی ہے۔ یہ ایک ایسا مذہب ہے جو کبھی فرسودہ اور از کار رفتہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ایسا دین نہیں جو اپنے دن گذار کر ختم ہوچکا۔ انسان کی تاریخ فرسودہ معتقدات اور غیر ثقہ اذعانات کا قید خانہ ہے۔ مگر اسلام کسی ایسے اذعان پر ایمان لانے کے لئے مصر نہیں ہوتا جو بلا کسی ثبوت کے مان لیا جائے، یا جو عقل ، مشاہدہ ، اور تجربہ کے خلاف ہو۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سائنس نے تمام اذعانات کا خاتمہ کردیا ، مگر اس کی بنیاد خود موجودات کی وحدت و یک رنگی پر ہے ، جو از روئے اسلام نتیجہ ہے خدا کی وحدت ویکتائی کا۔ اسلام کا خدا ایک عقلی خدا ہے جو موجودات کو ایک اندازہ اور ناقابل تغیر قوانین کے مطابق ظہور بخشتا رہتا ہے۔ کیا یہ اعتقاد کوئی معقول

مادہ پرست بھی رد کر سکتا ھے؟ اسلام کہتا ھے مادہ وجود کا صرف ایک رخ ھے جو ایک طرح پر ظہور ھے روح انسانی سے ملتی جلتی چیز کا۔ کیا مادی فطرت پرستی اپنی طبعی موت نہیں مرچکی؟ مادہ پرست کا مادہ بھی کیا گھٹ گھٹا کر مجرد توانائی، مجرد ریاضی مسئلہ، اور ذہنی رمزو کنایہ ہو کر نہیں رہ گیا؟ کیا اعماق قلب میں گھس کر اور اس کی ناقابل تصور صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انسان روحانیت کی طرف مائل اور مادہ کی اندھی میکانیت سے برگشتہ نہیں ہوگیا؟ کیا نظریۂ ارتقاء اپنی گوناگوں توضیحات کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ انسان کو کائنات کے تخلیقی اور اصلاح پذیر رجحانات کی طرف نہیں لے آیا؟ کیا اخلاقی التزامات کی، آداب واطوار کے ظاھری تعلق ھی سے سہی، کامیابی کے ساتھ تردید کی جاسکتی ھے؟ کیا انسانیت کی وحدت کا اصول افراد وجماعت کی باھمی آویزش کے باوجود ایک ثابت شدہ حقیقت کا درجہ حاصل نہیں کرچکا؟ کیا یہ اعتقاد کبھی غیر معقول ہوسکتا ھے کہ مراتب ودرجات وجود، مادی، روحانی اور ذھنی سطح سے اوپر پھیلتے ھیں؟ کیا یہ کبھی ثابت کیا جاسکتا ھے کہ روح جسم کی پیدا کردہ اور اس کی خاص صفت ھے اور اس کے ساتھ فنا ہوجاتی ھے؟ کیا یہ کبھی ثابت کیا جاسکتا ھے کہ ھمارا مکانی و زمانی وجود جملہ موجودات کے ساتھ ھم زمان و مکان ھے؟ کیا یہ کبھی رد کیا جاسکتا ھے کہ حیات کو زیادہ سے زیادہ ھمہ گیر امتزاج و یک رنگی کی طرف سعی کرنی چاھئے، یا یہ کہ جزئیات جیتے، حرکت کرتے اور اپنا وجود کلیات میں رکھتے ھیں، اور تمام کلیات بالاخر ایک عظیم غیر محدود کل میں مل جاتے ھیں؟

اسلام کا مستقبل بالعموم مذہب کا مستقبل ہے۔ اگر مذہب میں باقی رہنے کی صفت ہے تو اسلام یقیناً زندہ رہیگا۔ مسلم اقوام ہر جگہ اس مرض میں مبتلا ہیں جس میں کہ ہمیشہ تقلید پسندیاں مبتلا رہی ہیں۔ اسلام کے عالمگیر عناصر زمانہ کے حشو و زوائد کے ساتھ ایسے گھل مل گئے ہیں کہ ان کا ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔ جو مذہب اذعانات سے خالی تھا، اس میں ہر طرح کے اذعانات جاگزیں ہوچکے ہیں۔ مسلمان نجات کے اجارہ‌دار بن بیٹھے ہیں جس کی برائیوں کے متعلق قرآن آگاہ کرچکا ہے۔ ان کا فقہی نظام بھی فرسودہ ہوچکا ہے، اور فقہاء کے فتاوے کی اندھی تقلید جزو ایمان سمجھی جا رہی ہے۔ ان کے ساتھ وہی ہو رہا ہے جو ان سے پہلوں کے ساتھ ہوچکا ہے۔ یہ ابدی قانون اور تغیر پذیر ضوابط کا فرق بھلا چکے ہیں۔ زندگی کے معنی تبدیلی کے ہیں۔ جب تک ایک جسم زندہ رہتا ہے، اس میں داخلی تبدیلیوں کے ساتھ خارجی تبدیلیاں بھی حالات کے لحاظ سے ہوتی رہتی ہیں۔ حیات ایک تخلیقی اور خود کو سنوارنے والی صدرنگی ہے۔ اسلام اصلی خوبیوں اور خدا کی وحدانیت کا ایک سادہ عقیدہ ہے۔ اس کے جملہ ابتدائی خود حفاظتی غزوات جو لڑے گئے وہ مذہبی تعصب وتشدد کو ختم کرنے کے لئے تھے۔ اس نے آزادی ضمیر اور دیگر مذاہب کے احترام کی تعلیم دی۔ اس نے غیروں کی محافظت کی، اور مساوی حقوق ایسوں کو عطا کئے جن کے معتقدات جداگانہ تھے۔ اس نے دیگر مذاہب کے راست‌باز پیروؤں کی بے‌انتہا تعریف کی۔ یہ ایک ایسا مذہب ہے جو زندگی کو قبول کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ نیکی، عقل، اور جد و جہد کے ذریعہ اس کی جملہ خوبیاں

درآغوش کرلے ۔ نٹشے نے مذاہب کی تقسیم اس طرح کی ہے
کہ ایک وہ ہیں جو حیات دنیوی کے خواہاں ہیں اور دوسرے
وہ جو اس سے گریزاں ہیں ۔ اسلام حیات دنیوی کا اثبات چاہتا
ہے ، یہ زندگی کی لطف اندوزیوں پر چند فطری اور عقلی پابندیاں
عائد کرتا ہے ، جسے قرآن حدوداللہ سے تعبیر کرتا ہے ۔ ایک
ایسا مذہب جو حیات انسانی کو کاملاً آغوش میں لئے ہوئے
ہو ، اور جو اس کے روبرو ناآشنائے حدود راہیں کھولتا ہو ،
کیا کبھی فرسودہ ہوسکتا ہے ؟

دنیا میں کوئی تحریک بھی مثل ساعقۂ سماوی کے اچانک ٹپک
نہیں پڑتی ۔ چنانچہ ایک انقلابی تحریک بھی اپنا ربط ، قریب یا
بعید ماضی سے رکھتی ہے ۔ اصلاحی تحریکیں بھی بہت کچھ
اپنا سرمایہ قوم کے تہذیبی ورثہ سے پاتی ہیں ۔ یہ ایک ملت
یا قوم ہی کے اندر ہوتا ہے جہاں نئے نظام کی تلقین کی جاتی
ہے ۔ معاشی ، معاشری ، اور تاریخی پس منظر ایک نئی تحریک
کے ذریعہ ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں ۔ پھر قوموں
میں نفسیاتی اختلافات ہوتے ہیں ۔ مختلف قومیں ایک ہی فلسفۂ
زندگی سے مختلف طریقہ پر متاثر ہوتی ہیں ۔ جب کوئی تحریک
مختلف‌الحال قوموں میں پھیلتی ہے تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ
وہ خود بدل جاتی ہے جیسے کہ وہ خود انہیں بدل دیتی ہے ۔
یہ تمام معاشری ، تاریخی ، اور نفسیاتی عوامل زندگی کی اضافیت
میں داخلاً موجود رہتے ہیں ۔ اسلام کا آغاز اور اس کا ابتدائی
ماحول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ۔ اس کے ابتدائی ترتیب وقیام
میں بہت کچھ ماضی کا ورثہ ہے ، جو نہ صرف عربوں سے
متعلق ہے بلکہ اس میں اسرائیلی اور سامی اقوام بھی بالعموم
شریک ہیں ۔ اسلام کے مذہبی نقطۂ نگاہ کا پس منظر اسرائیلی

ھے ، جو پورے قرآن سے ظاھر ھے ۔ اسلام اپنے آپ کو ابراھیمؑ اور تمام دیگر اسرائیلی پیغمبروں کا مذھب کہتا ھے ۔ جہاں تک مذھب کے اساسی اصول کا تعلق ھے اسلام کسی جدت پسندی کا دعویٰ نہیں کرتا ۔ اپنے بہت سے رسوم اور مذھبی معمولات میں ، اور نیز قوانین و احکام میں جو بالائی عمارت اس نے کھڑی کی ھے وہ قدیم روایات پر مبنی ھے ۔ مسلمانوں سے یہ کہا گیا ھے کہ وہ نہ صرف ان چیزوں پر ایمان لائیں جو محمد صلعم کے ذریعہ اتاری گئی ھیں ، بلکہ ان تمام پیغمبروں پر ایمان لائیں جو مختلف اقوام میں آپ ص سے قبل مبعوث ھوچکے ھیں ۔ اسلام انسان کے ثقافتی تسلسل اور اس کے اساسی اصول کی حقیقی وحدت کا زبردست ماننے والا ھے ۔

اگر نئے دین کی کسی قوم میں تبلیغ کی جائے تو یہ لازم ھے کہ وہ اس کے لئے قابل فہم بنایا جائے ۔ سچائی کو سمجھنے کے لئے خود سچائی جانی بوجھی ھونی چاھئے ، یعنی اس کا تعلق سمجھنے والے کے سابقہ علم و تجربہ سے ھونا چاھئے ۔ ذریعہ پیام رسانی وہ زبان ھو جو اس قوم میں رائج ھے ۔ یہ سادہ حقیقتیں خود قرآن نے بیان کی ھیں : ”ھم نے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جو قوم کو اس کی زبان میں مخاطب نہ کر سکے“ ۔ ”ھم نے قرآن کو صاف عربی زبان میں نازل کیا تاکہ لوگ اس کو سمجھیں“ ۔* زبان کسی قوم کی نفسیات اور اس کی زندگی کی آئینہ دار ھوتی ھے ۔ یہ اپنے الفاظ اور طرز ادا میں زندگی کے متعلق اس کا نقطۂ خیال پیش کرتی ھے ۔ اس لئے قرآن میں ھم بہت سی ایسی چیزیں پاتے ھیں جو قوم کی نفسیات میں رچ گئی تھیں ۔ کوئی اصلاح ایسی انتہا پسندانہ نہیں ھوتی کہ وہ قوم کو

* انا انزلنہ قرآنا عربیالعلکم تعقلون — یوسف ۲

اس امر پر مجبور کرے کہ وہ کسی کام کا آغاز ایک لوح سادہ سے کرے۔ ہر اصلاح بالعموم حالت موجودہ کے خلاف بغاوت اور معاصرانہ تصورات و رواجات کے دفیعہ کی کوشش ہوتی ہے۔ مشہور جرمن فلسفی ہیگل کے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک جواب دعویٰ (Antithesis) ہے جو کسی دعویٰ (Thesis) کے اندرونی تناقضات سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ لیکن یہ دعویٰ اور اس کی سابقہ حالت بالکلیہ ختم نہیں ہوجاتی، یہ اپنے جواب دعویٰ کے ساتھ عمل کرتی ہے تاکہ ایک نیا امتزاج (Synthesis) پیدا کرے۔ یہ زندگی کے ترقی پذیر اقتدار کے حصول کا عام طریقہ ہے۔ یہ قانون قرآن کا تسلیم شدہ ہے جبکہ وہ کہتا ہے کہ "کوئی آیت منسوخ نہیں ہوتی جب تک اس کے مماثل یا اس سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہ لے لے"۔* خوبی اور خرابی مطلق ہیں، لیکن ان کے تاریخی اظہارات تغیر پذیر اور اضافی ہیں۔ قرآن کی رو سے خدا اور قانون اخلاق مطلق ہیں اور ان پر ایمان جملہ صداقت اور مذہب کا لب لباب ہے، اور باقی تمام اضافی ہیں۔ مذاہب جو مطلق اور اضافی میں فرق و امتیاز نہیں کرتے، جب اپنی اضافی حیثیت سے گذر جاتے ہیں، فرسودہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ قرآن اس کا قائل ہے کہ کسی قوم کے قانون و رواج، طریقے اور رسوم تغیر پذیر اور اضافی ہوتے ہیں، جو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ متعین اور کارفرما ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ "بجز ذات حق کے ہر چیز فنا پذیر ہے"۔† روحانی حیثیت سے زندہ رہنے کے لئے انسان کو چاہئے کہ وہ اپنا رشتہ غیر تغیر پذیر ذات مطلق سے جوڑ لے تاکہ وہ خود تمام تبدیلیوں کا

* ما ننسخ من آیة او ننسہانأت بخیر منہا — بقرہ ۱۰۶
† کل شئی ھالک الا وجھه — قصص ۸۸

ایک قانون بن جائے۔ ابدی اسلام جس کے بنیادی اصول آدم ء
سے محمد صلعم تک ایک ہی رہے ہیں ، وہ محض قوانین ومعمولات ،
یا طریق عبادت کا کوئی نظام نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ چیزیں
عہد بہ عہد بدلتی رہتی ہیں ۔ اگر اضافی اور مطلق کو ناقابل تقسیم
کل کی حیثیت سے اختیار کیا جائے تو اس کو مذہب کا نام دیا
جاسکتا ہے ، مگر ایسا مذہب ہمیشہ کے لئے قائم نہیں رہ سکتا ۔
اسلام کی عظمت یہ ہے کہ وہ ابدی کو تبدیل ہونے والے اجزاء
سے متمائز کرتا ہے ۔ مذہب کی وحدت وکلیت جو اسلام کے
اساسی تصورات میں سے ایک ہے ، اس کی ابدی حیات کی ضامن
ہے ۔ اسلام کی یہی امتیازی خصوصیت ہے جس نے دور جدید کے
عارف برنارڈشا کو اس فیصلہ کے اعلان پر مجبور کیا کہ بنیادی
اسلام زمانہ آئندہ کا مذہب ہوگا۔ شا تمام تقلید پرستیوں اور
کل مفاد پرست نظامات کا سخت دشمن تھا ۔ ایک تخلیقی ارتقائی
کی حیثیت سے وہ حیات کا قائل تھا ، جو ہمیشہ نئے روپ بدلتی
رہتی ہے ، مگر ساتھ ہی وہ اسلام کی ہمیشہ رہنے والی صفت
اور مستقبل کو مانتا ہے ۔ قدرتاً وہ مسلمانوں کی ان تقلید
پرستیوں کو نہیں دیکھ رہا ہے جو بعد میں انہوں نے پیدا
کرلیں ، جس میں چند عقائد ورسوم مسخ ہو کر کل ماقبل اسلام
رسم پرستانہ ، تقلیدی مذاہب کی طرح ، باقی اور بدلنے والے
پہلوؤں کے مابین امتیاز کرنے سے محروم ہوجاتے ہیں ۔ اسلام
اپنا تعلق ماضی ، معاصر زندگی ۔ جبکہ اس کا ظہور ہؤا ۔
اور مستقبل سے رکھتا ہے ۔ ہمیشہ قائم رہنے کے لئے اسلام
کا زندگی کی بابت ایسا نظریہ ہونا چاہئے جو تمام زمانوں
میں جاری رہ سکے ، یا بالفاظ دیگر تمام تغیرات زمانہ سے بلند و
برتر رہے ۔ نظام حیات کا خاکہ کھینچتے وقت بھی وہ کوئی

بند اور سربستہ ایسی چیز نہ دے جس میں ترقی پذیر مطابقت کی صلاحیت نہ ہو۔ وہ زندگی کو ہر رخ پر بڑھنے اور ترقی کرنے کے لئے کھلا چھوڑدے۔ غیر محدود علم کا راستہ کھلا رہے، ادراک و فہم کے ذریعہ تسخیر فطرت کی راہیں باز رہیں، وحدت عالم اور انسانیت کا راستہ مفتوح رہے، تمام خدایان مکر و زور تخت سے اتار دئے جائیں اور ایک غیر مرئی، قادر کل، پرورش کنندہ ہستی کی پرستش کے لئے میدان ہموار ہوجائے۔ خدا اور انسان کے درمیان تمام واسطے ہٹا دئے جائیں تا کہ انسان اس حی و قیوم کے روبرو کھڑا ہوسکے۔ کوئی فوق‌العقل وحی و وجدان جو کچھ بھی ثابت کرے وہ عقل و فطرت کے خلاف نہ ہو۔ آئندہ سے کوئی انسان دوسرے انسان کو نہ پوجے، اور پیشہ‌ورانہ ملائیت تسلیم نہ کی جائے۔ انسان کی عالمگیر اخوت، جو ذات پات رنگ و خون کے امتیازات سے ماوراء ہے، اس کے حصول کی کوشش کی جائے۔ انسان زندگی کے تقاضوں پر لبیک کہے اور اس کے ساتھ حیات افروز ہم‌آغوشی اختیار کرے۔ تمام اقتصادی ناانصافیوں کی راہیں مسدود کردی جائیں اور معاشری عدل ومساوات قائم کی جائے۔ جو لذائذ دنیوی سے سرفراز ہیں وہ اپنی زائد از ضرورت دولت سے ان کے حق میں دست بردار ہوں جوتہی دست ہیں۔ انسانیت کے اختلاف کو دور کرکے انسانیت کو اس طرح جوڑا جائے کہ وہ اتحاد کا ایک نمونہ بن جائے۔ آقا و خادم، آجر و اجیر، مرد اور عورت میں باہم انصاف قائم کیا جائے۔ طاقتور کی ظلم و زیادتی سے کمزور کی حفاظت کیجائے۔ ضمیر و عبادت کی ایسی آزادی جس نے افتراق انگیز صورت اختیار نہ کی ہو، اس کا تحفظ کیا جائے۔ بجائے ہبوط آدم پر زور دینے کے عقیدۂ صعود آدم ایک زندہ ایمان کا جزولازمی

بنے - قرآن میں ایک مثالی انسان اس ہستی کو سمجھا جاتا ھے
جس کے آگے فطرت کی تمام مرئی اور غیر مرئی قوتیں یعنی
ملائیکہ سر بسجود ھوئیں - کیونکہ علم میں برتری کے
سبب یہ زمین پر خدا کا خلیفہ بنایا گیا - قرآن کہتا ھے جو
کچھ آسمان اور زمین میں ھے وہ سب انسان کے قبضہ وتصرف
میں دئے گئے ھیں بشرطیکہ انسان اپنی کنہ و حقیقت سے وفاداری
کرے اور اپنے ارادہ کو مشیت کلی کے موافق کردے* - اسلام
کے معنی امن وخوشحالی کی تسخیر اور تسلیم ورضا کے ذریعہ
اقتدار حاصل کرنا ھے - یہ سپردگی کسی فطری طاقت اور دنیوی
قوت کے آگے جھکنا نہیں ھے - قرآن کی رو سے اس کی اصل حقیقت
الوھیت کی حامل ھے ، کیونکہ خدا نے اس کے کالبد خاکی میں اپنی
روح پھونکی ھے - اس کی فطرت اپنے خالق کے ساتھ ایک طے شدہ
میثاق ھے اور اس میثاق الست کی تکمیل حیات جاوید ھے -

انسان ایک مقصد تلاش حیوان ھے - جب وہ غلط مطمح
نظر اپنے روبرو قرار دے لیتا ھے تو زندگی میں خاسر اور نامراد
ٹھہرتا ھے - اسلام نے ایک ایسا نصب العین اس کے آگے رکھدیا
ھے جہاں اس کی رسائی کا سلسلہ دائماً جاری رھتا ھے - خدا
مقصد حیات بھی ھے اور سرچشمہ حیات بھی ، اور خدا نام ھے
ازلی علم اور ابدی حسن و خوبی کا - علم وعشق انتہائی اقدار
ھیں جن سے اسلام تمام قدروں کا استخراج کرتا ھے ، جو باھم
مل کر حیات طیبہ کی تشکیل کرتے ھیں - خدا زندگی ھے ،
اور حقیقت زندگی اور ھر مرتبہ پر ایک زائد اور برتر زندگی
کا حامل ، علم مثل نور کے ھے - خدا کے متعلق قرآن کہتا ھے

* و سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض جمیعا ــــ جاثیہ ۱۳

الله نورالسموات والارض *

اور یہی نور انسان میں جو ہر عقل بن کر نمودار ہؤا۔ جو بھی حکمت سے سرفراز ہؤا اس نے خیر کثیر پایا۔

و من یؤت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیرا †

عشق الٰہی جو تمام زندگی کی تخلیق و نگہداشت کرتا ہے تمام علم صحیح کا سرچشمہ بن جاتا ہے، اور اس طرح علم و عشق تصوری طور پر متمائز رہتے ہیں مگر ان کی اصل ایک ہی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

ان الانسان لفی خسر ۔ الا الذین آمنوا و عملوا الصٰلحت ‡

انسانی زندگی ایک مسلسل ناکامی ہے، بجز اس کے جو ایمان لایا اور اعمال صالحہ کے ساتھ زندگی بسر کی۔ تمام کامیابی بجز اس راہ کے محض فریب نظر ہے، جو منتج ہوتی ہے حقیقی خسران و ناکامی پر۔

اسلام کا آغاز بحیثیت ایک مذہب کے ہؤا، اس نے ایک مملکت بنائی، اور آخر میں ایک تہذیب بن گیا۔ مذہب خدا پرستی اور نیک زندگی کا مجموعہ تھا، اور مملکت ایک ذریعہ تھی اس زندگی کی حفاظت کا۔ اسلام نے تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ایسی بہت سی چیزیں اپنے میں داخل کرلیں جنہیں انسانیت ہزاروں سال میں وجود بخشتی ہے، اور ایسی چیزیں رد کر دیں جو اس کے تخیلی خاکہ سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ جب اس کے ابتدائی تصورات کی رفتار سست پڑ گئی تو بہت سے غیر اسلامی تصورات و رسوم نے مسلمانوں میں اثر و نفوذ پیدا کرنا شروع کیا۔ اسلام کی سادہ اور جمہوری اشتراکیت کو

* نور ۳۵ † بقرہ ۲۶۹ ‡ والعصر ۲، ۳

شاہی اور جاگیردارانہ مملکتوں نے سخت دھکا پہنچایا۔ اسلام کی ابتدائی انقلابی تحریک بہت سی جوابی انقلابی تحریکات کا شکار ہوتی رہی۔ باوجود ان تمام موانع کے اسلام آٹھ صدی تک دنیائے انسانیت کی قیادت کرتا رہا۔ جدید تمدن کی شمع روشن کرنے کے بعد مسلمان قوم غیر اسلامی ملائیت اور خودسرانہ شاہیت سے پامال ہوتی رہی، یہانتک کہ جمود و بے حسی کی حالت طاری ہوگئی۔ جدید تمدن نے بہت سے اسلامی اصول و نظریات جزواً اپنے میں ضم کرلئے ہیں۔ گزشتہ دوصدیوں نے غیر مسلم اقوام کے عروج کو دیکھا۔ مغرب حاکمانہ اقتدار کے ساتھ اٹھا، اور ان اقدار حیات کو ٹھکرا دیا جو اس کے عروج وترقی کو ایک ہزار سال سے روکے ہوئے تھے۔ عیسائیت کا عقلیت اور مسلک انسانیت کے ذریعہ تجلیہ وتزکیہ کیا گیا۔ وہ اقدار جو عملی سائنس اور سرمایہ دارانہ صنعتی نظام نے مغرب کے دست تصرف میں دیا تھا وہ مسلمانوں کے بوسیدہ سیاسی ادارات پر غالب آگئے۔ مسلمان جنہوں نے دنیا کی قیادت و رہنمائی کی تھی ہر راہ میں پیچھے رہ گئے۔ عیسائی مبلغین اور سیاسی رہنماؤں نے یہ مبالغہ‌آمیز پروپیگنڈہ شروع کیا کہ چونکہ مسلمان قوموں پر ہرجگہ جمود طاری ہے اس لئے اسلام جو ان کی تہذیب کا مشترک لقب ہے، ان کی پس‌ماندگی کا ذمہ‌دار ہے۔ یہ پروپیگنڈا کرنے والے اس سادہ تاریخی حقیقت کو بھول گئے کہ جس اسلام کو یہ رجعت پسند کہہ کر مطعون کر رہے ہیں، یہ وہی اسلام تھا جس نے مسلم اقوام کو کبھی تمام ترقیوں کا پیشرو بنایا تھا۔ یہ اپنی مادی خوشحالی کو عیسائیت کی طرف منسوب کرتے تھے، مگر اس کی توجیہ سے قاصر تھے کہ یہ وہی عیسائی تہذیب وتمدن تھا جو ایک ہزار سال سے

زائد عرصه میں صرف قرون مظلمه کی تخلیق کرسکا ۔ اسلام کے متعلق ان پروپیگنڈا کرنے والوں کا یہی نظریه تھا که یه چند رسمی اور فرسوده تقلید پرستیوں اور انحطاط یافته سیاسی نظامات کا مجموعه ہے ۔ حقیقت میں یه اسلام نہیں بلکه اس کا کھلا سلبی پہلو ہے ۔ زیاده عرصه تک زنده و باقی رهنا ایک طرف یه پوری طرح زندگی تک نه گذار سکا ۔ اپنے درخشاں عہد میں بھی اسے بہت سے ایسے غیر اسلامی طریقوں سے نباه کرنا پڑا جو اس کے مزاج کے خلاف تھے ۔ مغرب اس راه کی طرف جس پر اسلام نے رهنمائی کی تھی ۔ کچھ دور تک جاده پیما هوسکا ۔ مغرب نے بھی علم کو آزادی بخشی جیسا که اسلام نے اپنے دور حیات میں اس کو آزادی عطا کی تھی ، اس نے اپنی حکومتوں کو جمہوری رنگ دیا ، بایں همه اس اسلامی اشتراکیت کا مقام حاصل نه کرسکا جس میں حاکم کا انتخاب قوم کرتی تھی ، جو فی الحقیقت خادم قوم هوتا تھا ۔ 'سیدالقوم خادمهم' ۔ جو کچھ بھی کوتاهیاں مسلم قوم میں هیں وه اسلام کے اصول کا نتیجه نہیں بلکه وه براه راست نتیجه هیں اس کے ترقی پذیر اصول کو ترک کرنیکا جو خوبی اور بھلائی بھی ترقی کرنے والی قوموں نے حاصل کی ہے وه اصلاً اسلامی آئین هی کی رهین منت ہے ۔

دنیا کی موجوده صورت حال یه ہے که کوئی قوم کاملاً اسلامی زندگی کی حامل نہیں ۔ مسلمان حکومتیں صرف جزواً مسلمان هیں اور ایسے هی مغرب بھی ۔ ابھی دنیا کو ایک ایسی قوم کا انتظار ہے جو ایک کامل اسلامی زندگی کا نمونه پیش کرسکے ۔ اسلام صحیح اور ممکن العمل نصب العین پیش کرتا ہے ۔ یه کوئی خیالی دنیا نہیں ، تصورات و عقائد هیں جنکو

حقیقت کا جامہ پہنانا اور ان کو تکمیلی وجود بخشنا کسی ایک ھی قوم اور ایک ھی عہد کا کام نہیں - بلکہ انسانی معاشرہ کی واقعی زندگی ھی ان نصب العینوں کے تدریجی حصول کو اپنی غرض و غایت قرار دے سکتی ھے - اور تو اور قرون اولیٰ میں ان تصورات کو جو اپنایا اور معاشرہ میں آزمایا گیا ھے ان میں بھی تاریخی مجبوریوں کا سراغ ملتا ھے - کیونکہ جب بھی تدریجاً ان کو اپنایا جائیگا تو لامحالہ اشیاء کی ترتیب مختلف زمانوں میں مختلف انداز کی ہوگی -

اسلام کی نشأۃ ثانیہ نہ مغرب کی اندھی تقلید سے ھو سکتی ھے اور نہ ان قانونی فرسودہ طریقوں کے تمسک سے جو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے سکتے - مسلمانوں کو اسلام کے اساس اصول پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ھے - ان کو اس احساس کمتری کا خاتمہ کرنا چاھئے جس میں کہ یہ مبتلا ھیں اور جو انہیں مغرب کی ھر پیش کردہ چیز کو اسلام کی مطابقت پر مجبور کرتی ھے - اسلام کو مسلمان قوموں اور ساتھ ھی مغرب کو بہت کچھ تعلیم دینا ھے - اسلام میں اخوت ، حریت ، اور مساوات کے تصورات انتہا درجہ ترقی پذیر اور حقیقی ھیں بشرطیکہ انہیں ٹھیک طرح سمجھا جائے اور عمل میں لایا جائے - مغرب کی سماجی اور سیاسی عمارتیں شکست و ریخت سے دوچار ھیں - کیا ھم اپنی تعمیر میں جو ھم کرنی چاھتے ھیں - ایسی عمارتوں سے ایک قصر بطور نمونہ تیار کریں جو ابدی قوانین کے توڑنے کے سبب ڈھائی جارھی ھیں؟ مغرب نے اپنی قوت و عظمت کی تعمیر قومیت اور صنعتی عدم مداخلت پر قائم کی ، جس نے سامراجی انتفاع اور سامراجی حرب و ضرب کی راھیں کھولدیں - اس باطل قصر مشید کے پرخچے فاشیت اور اشتمالیت کے ھاتھوں اڑچکے - کیا ھم ایسی مملکت

یا نسلی اور علاقائی قومیت کی پرستش کریں جو وطنیت کو ایک معبود کا درجہ دیتی ہے؟ کیا ہم اشتمالیوں کی معقولی مادیت کو پوجیں جو زندگی کی پیدائش و تقسیم دولت کے تحت جماعت سازی کرتی ہے۔ انسان ایک عبادت گذار حیوان ہے۔ وہ خداؤں کی ذہنی تخلیق کرتا اور مورتیاں بناتا ہے، وہ انہیں اس وقت تک پوجتا ہے جب تک بظاہر ان سے نفع حاصل ہوتا ہے، اور جب وہ اس کی مقصد برآری نہیں کرتے تو انہیں توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ مادہ پرست مغرب نے رحمت و عدل والے خدا کو چھوڑ کر اس کی جگہ دیگر خداؤں کو اپنے طاق دل میں سجایا ہے، مگر یہ خواہش کے آفریدہ خدا اس کو کبھی دائمی سکون وطمانیت نہیں بخش سکتے۔ یہ خدایان حرص و آز اپنے پجاریوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ ایسے عالم آشوب ہتھیار ایجاد کریں جن سے چند لمحات میں پوری انسانیت تباہ و برباد ہو سکے۔ ان اقوام میں زندگی جکڑی ہوئی، توڑی مروڑی ہوئی اور تہ و بالا ہو چکی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ زندگی کی غرض و غایت کیا ہے۔ انسان خود اپنے آپ سے، دوسروں سے، اور اپنے گرد و پیش سے بر سرپیکار ہے۔ کیا ہم اس وسیع بیمارستان جنون و وحشت سے، جس میں پر شور دیوانے بستے ہوں، کوئی حیات بخش اکسیر پاسکتے ہیں؟ کیا ہم ایسے حکیموں کے نسخے استعمال کریں جو خود کو تندرست رکھنے کے قابل نہ ہوں؟

مسلم اور غیر مسلم دنیا کی بازآفرینی وہدایت کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم ان عالمگیر اصولوں کو سمجھیں اور روبہ عمل لائیں جنہیں اسلام نے پیش کیا ہے، اور اپنی زندگی اس عقل و انصاف کے چوکھٹے میں بٹھائیں جو خدا کی طرف سے

انسان کو عطا کیا گیا ہے - پیش نظر کتاب اس نظریہ کی وضاحت میں ایک حقیر کوشش ہے - یہ زیادہ تر قرآن کے حوالہ جات اور مستند احادیث کے اقتباسات پر مبنی ہوگی - احکام و اسوۂ رسول ص اور ایسے صحابہ جو آپ کی تعلیمات کا سچا نمونہ تھے ان سے بھی استفادہ کیا گیا ہے - تمام فرقہ دارانہ مابہ‌النزاع مسائل سے بچ کر اسلام کے عام بنیادی اصول پیش کئے گئے ہیں - یہ ایک فلسفہ ہے اور ساتھ ہی زندگی کے لئے لائحہ عمل بھی - مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ دوسرے نظامات اور فلسفہ ہائے زندگی کے مقابلہ و موازنہ سے قبل اپنے اس عظیم ورثہ کو سمجھیں اور اس کی خوبیوں کی کماحقہ قدر کریں -

باب اول

ایمان کی راہ میں موانع

اس کتاب کا مقصد مذہب کے اساسی اصولوں کو قابل فہم اور قابل قبول طریقوں پر ان ارباب دانش کے سامنے پیش کرنا ہے جن کی نشو و نما مذہبی روایات میں نہیں ہوئی ہے، اور جو مذہب کی عقلیت اور ضرورت کو شک اور تذبذب کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ایسے بہت کم ہیں جو ان منتہیانہ مسائل پر فلسفیانہ غور و فکر کے عادی ہوں، خواہ یہ مسائل اخلاق سے متعلق ہوں یا ان کا تعلق عمومی طور سے عالم موجودات سے ہو۔ ہمارے علماء اس ورثہ سے بیگانہ ہیں جو ہمیں بڑے بڑے صاحبان فکر و نظر سے پہنچا ہے، جن میں سے اکثر وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ علماء مذہبی صداقتوں کے محافظ اور ماہر سمجھے جاتے تھے، جن کا فتویٰ مذہب کی صحیح تشریح کی طرح تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن گذشتہ دو صدیوں میں سائنس کی ترقی نے ان کو کہیں کا نہ رکھا، یہاں تک کہ ان علماء کا اخلاقی شعور زمانہ کی چیدہ اور منتخب جماعت کے اخلاق کا ساتھ نہ دے سکا۔ حکمیاتی مذہب فطرت کا نتیجہ مادی مذہب فطرت نکلا۔ فطرت کا مطالعہ میکانیت اور ریاضی اصول پر کیا جانے لگا، جس میں کسی مقصد و ارادہ کیلئے جگہ نہیں رہی۔ مذہبی شعور کے ارتقاء کے دوران میں خود سرانہ ارادہ واختیار رکھنے والے خداؤں کی کثرت نے ایک خالق کے تصور کی جگہ خالی کر دی، جو ہمہ داں اور ہمہ تواں ہستی تھی، اور یہ یگانہ ذات صاحب علم و ارادہ قرار پائی۔ مگر مذہب فطرت میں حقیقت الحقائق

ذات نہ ارادہ رکھتی تھی اور نہ مقصد ۔ اس میں کوئی ''یہ ہونا چاھئے'' نہ تھا بلکہ ' ایسا ہو ، کی بے مقصد میکانیت تھی ۔ مادہ اور توانائی کے قوانین نیک و بد سے بیگانہ اپنے نتائج کو روبہ عمل لاتے تھے ۔ یہ اخلاق سے ماوراء اور برائی بھلائی سے منزہ تھے ۔ اس حکمیاتی نظریہ نے دنیوی زاویۂ نگاہ کے ساتھ ہر قوم کے اصحاب رائے کو اپنی گرفت میں لےلیا ۔ فطرت کی یک رنگی اور علت و معلول کی جبریت نے ایک رحیم اور رہنما مشیت کے لئے کوئی مقام نہ چھوڑا ۔ کائنات سے خدا کو خارج کردیا گیا ، کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی ۔ لیپلیس (Laplace) فلکیات پر اپنی ایک تصنیف نیپولین کے پاس لے گیا تاکہ صلہ وانعام پائے ۔ نیپولین نے کتاب پر نظر ڈالی اور یہ کہا کہ کیا بات ہے کہ میں تمہاری کتاب میں کہیں خدا کا نام نہیں دیکھتا ۔ لیپلیس نے کہا ''حضور اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی''۔ لیپلیس ریاضیاتی طبعیات اور فلکیات کے حدود کے اندر کچھ زیادہ غلطی پر نہ تھا ۔ دینیات کو فلکیات سے خلط ملط کرنا گویا دونوں کو برباد کرنا تھا ۔ یہ اچھی نصیحت ہے کہ ''تو اپنے مالک کا نام بیکار نہ لے''۔ سائنس جہاں ان تعلقات سے بحث کرتی ہے جو فطرت کے مختلف مظاھر میں ھیں ، وھاں تھوڑی دیر کے لئے یہی بہتر سمجھا جاتا ھے کہ خدا درمیان میں حائل نہ ہو ۔ کائنات کے حکمیاتی طریق تفہیم میں خدا بالعموم عدم علم کی خالی جگہوں کو پر کرتا ھے ۔ یہ تمام حوادث کی آسان تشریح تھی ۔ مذھب فطرت کے نشو و ارتقاء نے اپنے حدود عمل اور منظر کو محدود کرلیا ھے تاکہ وہ مظاھر کے باھمی تعلقات پر اپنی توجہ مرتکز کرسکے ۔ حکمیاتی نگاہ کے لئے صرف دو اھم حقیقتیں رہ جاتی ھیں ، ایک طرف میکانی فطرت اور

دوسری طرف حکمیاتی تعلیل - یہی فطرت اور یہی عقل واحد حقیقتیں تھیں، جو ایک دوسرے پر اپنا عکس ڈالتی تھیں، بجز ان کے نہ کسی اور کا وجود تھا اور نہ کوئی شمار میں آتی تھیں۔ صداقت کو سمجھنے کا صرف حکمیاتی عقل ھی ایک ذریعہ تھی۔ جو چیز وزن و پیمائش کی متحمل نہ تھی وہ غیر موجود ھو کر رہ گئی - خدا اور اخلاقی اقدار ناقابل لحاظ سمجھے گئے اور اسی طرح نفس انسانی بھی - شعوریت جس نے حکمیاتی حقائق کا سراغ لگایا تھا، وہ خود بھی حقیقت ھونے سے خارج کر دی گئی - نہ وہ ذات شئے تھی اور نہ مظہر - بلکہ فوق المظہر کوئی چیز تھی، جو میکانی سببیت کے تحت خلیات دماغ کی غیر موثر ضمنی پیداوار ھے - حیات و نفس کی تشریح مادی اصطلاحات میں کی جانی چاھئے جو حقیقت اولیٰ فرض کئے جاتے تھے۔

حکمیاتی نظریہ نے اپنی یک طرفی اور کوتاہ نظری کے باوجود بڑی خدمت انجام دی ھے - اس نے نہ صرف انسان کے علم فطرت میں اضافہ کیا ھے بلکہ تہذیب کے دیگر دائروں میں بھی اس کے اثرات نفع بخش رہے ھیں - مدت دراز سے مذھب کے اساسی تصورات بھی فطرت کی کارگذاریوں کے متعلق حکمیاتی، اصنامی اور افسانوی توضیحات سے مل جل گئے تھے - انسان کا یہ وجدان کہ کل صداقتیں ایک اور باھم مربوط ھیں، بہت سی چیزوں کو بری طرح ملا جلا دینے کا باعث ھوا - واقعات اپنے اقدار کے ساتھ نہایت حیران کن طریقہ پر ایک دوسرے سے خلط ملط ھوگئے - ایک انسان جو مذھب پر اعتقاد رکھتا تھا، اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ تخلیق آدم کے متعلق ان تمام خرافات پر اعتقاد رکھے جن میں مذھبی حقائق لپٹے ھوئے تھے - جب حکمیاتی انسان نے مذھب کے خلاف

بغاوت کی تو اس کی اصل مزاحمت اپنے تحقیق شدہ علم فطرت کے ساتھ ان ھی خرافات اورمثالیہ افسانوں سے ھوئی جن پر حقیقت اصلیہ کی طرح کائناتی اور تاریخی واقعات پر ایمان لانا پڑتا تھا۔ سائنس نے جو انسانیت کی خدمت کی ھے، اس میں ایک یہ بھی ھے کہ اس نے ایک حد تک مذھبی اساسات کو نقلی حکمیاتی خرافات سے آزادی بخشی۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ مذھب و سائنس کا باھمی ربط زیادہ واضح صورت اختیار کرتا گیا، اور جو متنازع فیہ مسائل تھے وہ زیادہ سے زیادہ آجاگر ھوتے گئے۔

ھر عہد کی سائنس اپنا فلسفہ، بمنزلۂ زائد اعتقادات کے عمارت کے بالائی حصہ پر تعمیر کرتی ھے۔ میکانیت اور مذھب فطرت، انکارات کا مابعدالطبعیات بناتے ھیں۔ فطرت لاشخصی تھی، اور حکمیاتی استدلال فطرت سے لاشخصی بحث کرتا تھا، اس لئے کائنات یا انسان میں فردیت ایک فریب نظر تھی۔ تمام فطرت ایک ریاضیاتی حیثیت رکھتی ھے اور جیسا کہ مثلث اور دائروں میں کوئی ارادہ کارفرما نہیں، اور ان کے خواص منطقی طور پر تبعا پیدا ھوتے ھیں، ارادی طور پر نہیں، اس لئے ان کا اختیار بھی محض ایک مغالطہ ھے۔ ساری فطرت ایک جبریت کی نمود ھے، جس پر ایک بے رحم لزوم کار فرما ھے، لہذا اختیار ایک دھوکا ھے۔ یہ میکانیت اور مذھب فطرت کا فلسفہ ھے۔

میکانی مذھب فطرت جب عروج پر تھا تو حیاتیات نے اپنی ارتقائی منزلیں طے کرنی شروع کیں۔ عالم نباتات اور حیوانات کا حکمیاتی طریق پر صحت کے ساتھ قریبی اور گہرا مطالعہ کیا گیا۔ انقلابی مفروضات پیش کئے گئے۔ سائنس کے ھر عظیم انکشاف کی پہلی ضرب انسان کو کائنات میں اپنے مستحقہ

مقام سے ہٹانے کی خاصیت رکھتی تھی۔ اس اولین صدمہ سے یہ ہمیشہ اپنا توازن کھوتا رہا اور اپنا صحیح مقام پہچاننے کے قابل ہونے سے پہلے اسے کچھ عرصہ درکار ہوتا رہا۔ چنانچہ جب بطلیموسی نظام کی کوپرنیکس نے تغلیط کی اور کائنات کے ارضی‌المرکز نظریہ کی جگہ شمسی المرکز نظریہ نے لی، تو یہی ہوا۔ انسان ہمیشہ زمین کو جو اسی کا مسکن ہے مرکز کائنات سمجھتا تھا۔ تخلیق و پیدائش کا سارا ہنگامہ اسی کے گرد گھومتا تھا۔ اور اسی کا یہ خیال تھا کہ وہ اور اسکی دنیا کی تاریخ خدا کی توجہات کا مرکز ہیں۔ مذہبی نقطۂ خیال اس نظام شمسی اور اجرام فلکی کے تصور سے کچھ ایسا وابستہ ہوچکا تھا کہ اس مفروضہ کا اپنی جگہ سے ہل جانا بہت سوں کے نزدیک مذہبی معتقدات کی کھلی تباہی تھی۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد انسانیت نے اپنا کھویا ہوا توازن حاصل کرلیا، اور پیشوایان مذہبی تک یہ کہنے لگے کہ اس سے انسان کی نجات پر کیا اثر پڑتا ہے، خواہ زمین آفتاب کے گرد گھومے یا آفتاب زمین کے گرد، یہ کسی طرح مذہبی اعتقاد کا لازمی جزو نہیں ہے۔ ایمان کا کوئی اور مقام ہے جو ان تمام فلکیاتی مفروضات سے ماوراء ہے۔ کوپرنیکسی علم ہئیت کے اثرات کی طرح ڈاروینی مفروضہ بھی مذہبی معتقدات کی پراگندگی کا باعث ہوا۔ اصل انواع کے بارے میں ڈاروینی مفروضات نے اور علم‌الارض کے انکشافات نے مغرب کے مذہبی معتقدات میں بے حد کھلبلی پیدا کر دی۔ نہ تو زمین کی عمر چھ ہزار سال تھی اور نہ یہ چھ دن میں پیدا کی گئی۔ نباتات اور حیوانات کے انواع اپنے موجودہ جسم کے ساتھ نہیں پیدا کئے گئے، بلکہ یہ لاتعداد زمانوں کی کشمکش حیات، اتفاق تغیرات اور بقائے اصلح کے اصول کے تحت

رونما ہوئے ھیں - جہاں اصلح کا مفہوم محض بہیمی صلاحیت سے ھے ، جہاں اپنی مخالف قوتوں کا بیدردی کے ساتھ خاتمہ کیا جاتا ھے ، اور اپنے ماحول سے بہر نوع مطابقت پیدا کی جاتی ھے - ڈارون نے خود مذھب پر براہ راست کوئی حملہ نہیں کیا - لیکن بیان کیا جاتا ھے کہ مور کے درخشاں پروں نے اس میں تذبذب کے ساتھ ایک افسردگی کی لہر دوڑا دی کہ آیا یہ تمام حسن و زیبائی فی‌الحقیقت انتخاب طبعی کا نتیجہ ہوسکتی ھے - مگر اس مفروضے نے پوری دنیائے عقل پر قابو پالیا - ارضیات و حیاتیات جو مذھبی اعتقاد کا جزو لاینفک بن چکے تھے بسہولت تمام برطرف کردئے گئے - مذھبی معتقدات کو محفوظ تر مقام پر منتقل کرنا پڑا جہاں وہ مشاھدات کے حملوں سے مغلوب نہوسکے - کوپرنیکس نے زمین کی مرکزیت کا خاتمہ کردیا جس سے نتیجتاً انسان کی مستحقہ حیثیت متزلزل ہوگئی - ڈارون نے اس کی عظمت کا یہ کہہ کر خاتمہ کیا کہ انسان دون‌البشر مخلوق کی نسل سے ھے ، اور جانور سے کچھ ھی زیادہ پسندیدہ حیوان ھے - ریاضیاتی فلکیات اور طبعیات کو خدا کی ضرورت نہ تھی - اس نے انسان کو کائنات کا ایک بے بس اور مجبور جزو قرار دیا - نہ خدا کی کوئی ضرورت تھی اور نہ انسان کو کوئی خاص اھمیت حاصل تھی - ارتقا پسند حیاتیات ، حیوانی و نباتاتی زندگی اور ان کے تمام نظام ، مطابقت اور زیبائی کے متعلق یہ تصور کرتی تھی کہ یہ سب فطری قوتوں کا مظاھرہ ھے جو نیک و بد سے ماوراء ھیں - ان میں کوئی نظم و ترتیب کا شعور نہیں - انسان ، اس کے اخلاق ، اور اس کے اقدار جن کو وہ ابدی اور معروضی اھمیت دیتا تھا وہ تنازع للبقاء کے بیرحمانہ آلات سمجھے گئے - اپنی دانست میں حیاتیات

اور طبیعیات مذہبی اعتقاد سے عہدہ برآ ہوچکے تھے اور اس کا تمام زمانوں کے لئے خاتمہ کرچکے تھے۔ لیکن کیا حقیقتاً مذہب کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو چکا ہے؟ کیا در حقیقت اب ایک معقولی یا حکمیاتی آزاد خیال کے لئے یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ مذہب پر کسی نوع سے اعتقاد رکھ سکے؟ بایں ہمہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مذہب کا خاتمہ نہیں ہوا، اور بہت سے صاحبان عقل و تمیز سائنس کے کارناموں اور خدمات سے باخبر ہونے کے باوجود مخلصانہ طریقہ پر خدا کی ذات پر اس کے تمام مضمرات کے ساتھ اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہ کسطرح ممکن ہے؟ اس کی وضاحت زیر نظر کتاب میں رفتہ رفتہ ہمارے شرح و بیان سے ہوتی رہے گی۔

مذہب پر کج اندیشانہ تنقید کے تحت یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب اپنے بچاؤ کے لئے مسلسل ایک طرح کی رجعت قہقری اور گریزانہ طریق اختیار کرتا رہا ہے۔ یہ چند معتقدات کو بطور ضروریات کے مانتا ہے، لیکن جب وہ اعتقادات علم کے عروج و ترقی کے سبب کمزور پڑ جاتے ہیں تو ان کی جگہ بدل دی جاتی ہے اور کوئی محفوظ تر جائے پناہ اختیار کی جاتی ہے۔ مگر یہ مسلسل بنیاد کی تبدیلی کا اتہام، جس میں ایک چیز کو صحیح مان کر اس کی بے ثباتی پر چھوڑ دیا جائے، صرف مذہب ہی پر کیوں عائد کیا جاتا ہے۔ حکمیاتی طریق، دریافت حقائق میں ایک کامل و اتم طریقہ سمجھا جاتا ہے اور یہ یقین کیا جاتا ہے کہ یہ صرف معروضی حقیقت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ کیا سائنس کی ترقی ایک غلطی سے دوسری غلطی کی طرف نہ تھی؟ یا بہ الفاظ دیگر یہ ترقی ایک فرو تر صداقت سے بر تر صداقت کی طرف جادہ پیمائی نہ تھی؟

سائنس کی ابتداء خرافات ، افسانوں اور توہمات سے ہوئی ، اور یہی حال مذہب کا رہا ۔ انسانیت کا ارتقاء ان ہر دو صورتوں میں غیر صداقتوں یا صنمیاتی توجیہات کو ترک کرتا رہا ۔ یہ صحیح ہے کہ یہ ہر دو انسان کے ترقی کناں علم کے آگے یکساں پسپا ہو رہے ہیں ۔ سائنس کا ہر اگلا قدم اس کے سابقہ مفروضہ کو ایک مغالطہ قرار دیتا ہے ۔ یہ ایک افسانہ تھا ، جس نے کسی حیرت انگیز واقعہ کی ایک خاص حد اور زمانہ تک تشریح کی تھی ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سائنس اس وقت ہر طرح کی داستان اور چیستان سے ماوراء ہے ۔ انسان کے علم و تجربہ کی ان تمام کوتاہیوں کے ساتھ میکانی فطرت کا مفروضہ بتدریج اپنی جگہ خالی کر رہا ہے ۔ بڑے بڑے ماہرین علم الحیات یہ کہنے لگے ہیں کہ زندگی کو ۔ مقصد میکانیت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کی خود اپنی خاص علیت ہے ۔ ماہرین نفسیات ولیم جیمس کیطرح اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نفس محض ایک حیاتیاتی زندگی سے کہیں بڑھ کر ہے ۔ نفس و روح کی سببیت اور جسم کا روح کے ساتھ تعلق ، اس کی تشریح محض حیاتیاتی اصطلاحات میں نہیں ہو سکتی ۔ اس کو سائنس کی شکست کہئیے یا ترقی ، اس کا انحصار آپ کے انداز فکر پر ہے کہ آپ کس زاویہ سے اسے دیکھ رہے ہیں ۔

سائنس صد ہا سال تک توہمات ، طلسمات ، اور بے قید تصورات سے ہم آغوش رہی ۔ یہ مشاہدہ تجربہ اور عقل کے بجائے نوزائیدہ انسانیت کے متخیلہ کی پیداوار تھی ۔ اب یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ سائنس اپنے بنیادی مسلمات کو پا گئی ہے ، اور حکمیاتی نظریہ اور حکیماتی منہاج ہمیشہ کے لئے قائم ہو گیا ہے ۔ مگر منظم کائنات کا بنیادی نظریہ جو تعلیلی قبیل اور ریاضیاتی استدلال کا تابع ہے ، کبھی بدل نہیں سکتا ۔ ایک آئن اسٹائین (Einstein)

زمان و مکان کے تصور کو بدل سکتا ہے۔ نیوٹنی طبیعیات کی زیادہ تشفی بخش طریقہ پر تشریح کر سکتا اور مطلقیت کو اضافیت سے بدل سکتا ہے۔ مگر نظریہ اضافیت ایک ایسا قانون ہے جو سببیت اور ریاضیاتی استدلال کا تابع ہے اور اس لئے مطلق ہے۔ کیونکہ قانون کی ماہیت بذات خود مطلق ہے۔ سائنس بے حد و نہایت ترقی کرتی رہے گی، اور جیسے فطرت بے پایاں ہے، ایسے ہی اس کے اسرار کی پردہ کشائیاں ترقی کناں رہیں گی۔ علاوہ بریں سائنس کے بنیادی مسلمات ہمیشہ کے لئے ثابت ہو چکے ہیں۔ اور جب اس میں سائنس کی کوئی تحقیر نہیں سمجھی جاتی کہ اس کے ابتدائی نظریات کی جگہ ایسے نظریات نے لے لی ہے جن کی تشریح مشاہدہ اور اختیار کی روشنی میں مستقلاً ترقی کے سبب، زیادہ تشفی بخش طریقہ پر کی جاسکتی ہے۔ تو پھر مذہبی عروج و ارتقاء کی بھی اس نہج پر تفسیر کیوں نہ کی جائے۔

سائنس انسان کی بنیادی احتیاج کو ظاہر کرتی ہے، ایسے ہی مذہب بھی۔ سائنس مظاہر فطرت اور ان کے باہمی ارتباط کا مطالعہ کرتی ہے اور بحیثیت سائنس اپنے خود عائد کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔ مذہب کا ملحوظ قدر و قیمت کی تنقید ہے۔ سائنس ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ اشیاء کس نظام اور کس طرح وقوع پذیر ہوتی ہیں، اور مذہب ہمیں ان وقوعات کے کیوں، اور کہاں سے، ہونے کو بتلاتا ہے۔ سائنس کا ملحوظ صرف ایک قدر ہوتی ہے، یعنی ظہور و نمود کی صداقت اور نوامیس ویک رنگیوں کی پردہ کشائی۔ اس کو دیگر اقدار سے کوئی سروکار نہیں۔ حسن یا نیکی اور عشق یا مسرت سے نہ اسکو کوئی دلچسپی ہے اور نہ محض آغاز و انجام سے کوئی تعلق ہے۔ جب وہ مطلق آغاز و انجام پر غور کرنا شروع کرتی ہے تو وہ

مابعدالطبیعیات یا مذہب کے میدان میں قدم رکھتی ہے۔ جیسا کہ کانٹ اور اسپنسر نے شہادت دی ہے سائنس کے لئے مظہر کے پس پشت حقیقت اولیٰ ہمیشہ ناقابل ادراک رہے گی۔ خالص حکمیاتی نقطۂ نگاہ سے تصورات کی یہ در اندازی ناقابل تسلیم ہے۔ جیسا کہ ایک فارسی شاعر ابو طالب کلیم نے حسن تشبیہ سے اس کو ادا کیا ہے:

ما ز آغاز و ز انجام جہاں بے خبریم
اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتاد است

تم اس کے صرف درمیانی صفحات پڑھ سکتے ہو، اور صاحب تصنیف، اس کے مقصد اور خاتمۂ کتاب کی بابت صرف قیاس آرائیاں کر کر سکتے ہو۔ مگر یہ انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ کل حقیقت اور علم کو ایک سمجھے۔ بہر حال اپنی کوتاہیوں سے مجبور ہو کر ہم تقسیم عمل اور محدود حلقوں میں انقسام چاہتے ہیں۔ اکثر بڑے بڑے سائنس دان مسائل ہستی پر غور و فکر کی دلفریبی سے بچ نہ سکے۔

ہم نے کہا ہے کہ سائنس اپنے بنیادی مسلمات تک بار پا چکی ہے، مگر بار پانے کا یہ مطلب نہیں کہ اب تحقیق کا دروازہ بند ہو چکا، بلکہ دوسرے معنوں میں یہ ایک مستحکم بنیاد ہے جس پر آئندہ ترقی و اکتشاف کا سفر جاری رکھا جا سکتا ہے۔ کیا ہم ایسے ہی مذہب کی بابت حکم لگا نہیں سکتے کہ مذہب کی رسائی بھی اس کے بنیادی مسلمات تک ہو چکی ہے، بنی نوع انسان کے لئے روحانی ترقی کے دروازے ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں، لیکن اب ایمان کی حقیقی بنیاد بدل نہیں سکتی۔

یہ اسلام کا دعویٰ ہے۔ انسان نے مذہب کی بنیادی صداقت تک رسائی حاصل کر لی ہے اور وہ یہ کہ ایک خدا کی ہستی ہے

جو خالق، پرورش کنندہ، اور مہربان ہے۔ انسانی اخلاقیت اس بنیادی مفروضہ کا لازمی نتیجہ ہے جس کی تکمیل اعتقاد، علم، عمل اور حصول سے ہوتی ہے۔ حقیقت الحقائق ایک ہے، اور وہ اس نظام کے تحت کار فرما ہے، جو بیک وقت عقلی، اخلاقی اور تمام حقیقی اقدار کی مقوم ہے۔ قرآن اس چیز کو بطور بنیادی مسلمہ کے پیش کرتا ہے، جس کسی کے قلب و ذہن میں یہ اعتقاد جاگزیں ہو گیا، اور وہ محض اقرار باللسان نہ رہا، اس نے دنیا و آخرت میں صداقت اور فوز و فلاح پا لی۔ "جس نے اپنی ہستی کو کاملاً خدا کے حوالہ کر دیا اور انسان کے ساتھ بھلائی سے پیش آیا وہ نجات یافتہ ہوا، اس کے لئے کسی طرح کا خوف ہو گا نہ غمگینی"[1] آنحضرتؐ کے متعدد ارشادات ہیں جو اس حقیقت کی توثیق کرتے ہیں۔ کہ "جو کوئی بھی دل سے خدا کو مانتا ہے اس کی نجات قطعی ہے"۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسا آدمی مدت العمر معصوم رہے۔ ایک مشہور حدیث آنحضرتؐ کے ایک درویش صفت صحابی حضرت ابوذرؓ سے بیان کی گئی ہے کہ "اگر آدمی یہ اعتقاد رکھے کہ خدا ایک ہے اور وہی قابل پرستش ہے تو اس نے نجات پا لی اور وہ جنت میں داخل ہو گا"[2] حضرت ابوذرؓ نے استفسار کیا "خواہ اس سے گناہوں کا ارتکاب ہوا ہو"؟ اس کو تین مرتبہ دریافت کیا اور حضورؐ نے اس کا تین مرتبہ اثبات میں جواب عطا فرمایا۔ "اگرچہ کہ اس سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہوا ہو"۔ تمام امکانات پر غور کرنے کے بعد حضورؐ کا یہ منشاء معلوم ہوتا ہے کہ ایسا آدمی کبھی کبھی گناہ میں مبتلا ہو سکتا ہے، چونکہ قلب سلیم رکھتا ہے

---

۱ بلیٰ من اسلم وجہہٗ للہ و ہو محسن فلہ اجرہ عند ربہ ولا خوف علیھم ولاھم یحزنون۔ البقرہ—۱۱۲

۲ شیخین۔

اور زندگی کے متعلق اس کا تصور صحت پر مبنی ہوتا ہے ، اس لئے اس امر کا کم امکان ہے کہ وہ عادی اور پرانا پاپی بن سکے ۔ اسلام یہ بتلاتا ہے کہ مذہب اپنے بنیادی مسلمات پر اس وقت پہنچتا ہے جب وہ انسانیت کو ایک ہمہ خیر خدا کی پرستش کی تعلیم دے ، اور انسان کو اپنے حدود میں رہ کر صفات الٰہی کو اپنے میں سمو لینے کی تلقین کرے ۔ یہ عام طور پر معلوم ہے کہ مذہب اسلام کا خلاصہ لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ ہے ۔ ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ اصل ایمان ایک خدا پر ایمان ہے اور رسول اس کا شارح اور عامل ہے ۔ وہ بجائے خود مقصود نہیں ۔ وہ مثل دیگر انبیاء ، اہل ایمان اور نیک لوگوں کے خدا کا ایک بندہ ہے ، جو خدا پر ایمان لاتا اور تمام نیک اور بزرگ انسانوں کا احترام کرتا ہے جنہوں نے سچائی کا راستہ بتلایا ۔ کوئی مسلمان سچا مسلمان نہیں جو صرف ایک پیغمبر پر ایمان لائے اور دوسروں پر نہ لائے ۔ نبوت کی صداقت کا معیار جو اسلام نے بتلایا ہے وہ سراسر عقیدۂ وحدت کی تبلیغ ، اس پر ایمان اور عمل ہے ۔ سائنس نے بنیادی مسلمات تک حال ہی میں رسائی پائی ہے مگر از روئے اسلام ، مذہب اس پر بہت پہلے پہنچ چکا ہے ۔ سچے مذہب کی ابتداء خدا کی ہستی کے اقرار سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا بھی ذات الٰہی پر ۔ بہت عرصہ قبل ہر مہذب قوم کو خدا کی یگانگت کی بابت وحی کی جا چکی ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ "کوئی قوم ایسی نہیں جس میں ہم نے کوئی پیغمبر مبعوث نہ کیا ہو" ۔* یہ مذہب کی اساسی وحدت کی تعلیم ہے ۔ مختلف قوموں نے مختلف قوانین و رسوم کی پیروی کی اور عبادت کے مختلف طریقے مختلف زمانوں میں اختیار کئے ، لیکن ایک خدا

* و ان من امۃ الا خلا فیھا نذیر ۔ فاطر ۔۔۔ ۲۴

پر ایمان صداقت کا دائمی عنصر رہا - جب کبھی یہ حقیقت قوموں کے قلوب سے محو ہونا شروع ہوئی تو وہ جاہل و ظالم بن گئیں، اور اپنے ظلم و نا انصافی کے سبب، جو وہ کرتی تھیں، خدا کے غیظ و غضب کی سزا وار ٹھہریں - گناہ کی پاداش موت ہے اور جو قومیں صداقت کی بصیرت سے محروم ہوتی ہیں وہ تباہ ہو جاتی ہیں - بدی کا آغاز نیکی پر غلبہ سے ہوتا ہے اور بالآخر تباہی کی طرف لے جاتا ہے -

مذہب کا مقابلہ سائنس سے کرتے وقت بعض لوگ یہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ سائنس عالمگیر، ممکن الثبوت اور قابل مشاہدہ ہے اور اس کے نتائج کی صحت کے ساتھ پیش قیاسی کی جا سکتی ہے، اور مذہب کے متعلق دنیا متخالف جماعتوں میں بٹی ہوئی ہے - صداقت عالمگیر ہونی چاہیے، مگر مذاہب جن پر مختلف جماعتیں ایمان رکھتی اور عمل پیرا ہیں، ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں - قرآن نے اس مسئلہ پر بار بار بحث کی ہے اور اس کے واضح جوابات دئے ہیں - وہ کہتا ہے کہ مذہب کا ملحوظ بھی عالمگیر صداقت ہے - دین صرف ایک ہے اور تمام مذاہب اس کے فرقے اور ٹولیاں ہیں - ایک سچا مذہب اعتقاد ہے کل حقیقت کی وحدت اور نظام اخلاق پر، یا اصلی فرق ہے نیک و بد کا، جس کے نتائج دنیا اور آخرت میں ظاہر ہوتے ہیں - قطع نظر مذہب کے اسلام نے جن افراد میں بھی یہ اعتقاد پایا ان کی بے حد تعریف کی اور ان کے لئے اچھی زندگی بطور صلہ و انعام ملنے کا وعدہ کیا - تمام مذاہب کا یہ رجحان ہے کہ وہ فرسودہ اور جامد ہو کر تقلید پسندی میں متبدل ہو جائیں، صداقت و نجات کی اجارہ داری کا دعویٰ کریں، جنت کا دروازہ ان پر بند کریں جو بعض عقائد کو نہیں مانتے، یا خاص رسوم، عادات اور طریقوں

کی پیروی کرتے ھیں ۔ اسلام اس رجحان سے واقف تھا کہ جواذعانات زندہ قوموں کے لئے مردہ ھو جاتے ھیں وھی مردہ قوموں کے لئے زندہ صورت اختیار کر لیتے ھیں ۔ انسانیت کو اس میلان سے آگاہ کرنے کے لئے اسلام نے مذھب کے اساسات ھمیشہ کے لئے بیان کر دئے اور جہاں کہیں بھی وہ پائے جائیں وھاں صداقت و سچائی ھو گی ۔ جن ملتوں کا اسلام کو براہ راست سامنا کرنا پڑا ، یعنی یہودیت و نصرانیت ، وہ صداقت و نجات کی ٹھیکہ داری کی دعویدار تھیں اور جو ان کے معتقدات اصول یا طریق عبادت کو نہیں جانتے تھے ان کے نزدیک ایسوں کے لئے ھلاکت مقدر تھی ۔ اس موقع پر چند قرآنی نصوص کو پیش کیا جائیگا تاکہ یہ ثابت ھو جائے کہ قرآن کے نزدیک سچا اور عالمگیر مذھب کیا ھے اور وہ کس طرح تمام اجارہ داری کے دعووں کو ختم کرتا ھے : ”اور یہودی کہتے ھیں جنت میں کوئی انسان داخل نہیں ھو سکتا جب تک کہ وہ یہودی نہ ھو ، اسی طرح عیسائی کہتے ھیں کہ جنت میں کوئی داخل نہیں ھو سکتا جب تک کہ وہ عیسائی نہ ھو ، یہ ان لوگوں کی جاھلانہ امنگیں اور آرزوئیں ھیں نہ کہ حقیقت حال ۔ تم ان سے کہو اگر تم اپنے زعم میں سچے ھو تو ثابت کرو کہ تمہارے اس دعوے کی دلیل کیا ھے ۔ ھاں جس کسی نے بھی اللہ کے آگے اپنا سر نیاز جھکا دیا اور وہ نیکوکار بھی ھے تو وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر ضرور پائیگا نہ تو اس کے لئے کسی طرح کا کھٹکا ھوگا اور نہ کسی طرح کی غمگینی ۔ اور یہودی کہتے ھیں عیسائیوں کا دین کچھ نہیں اور عیسائی کہتے ھیں ۔ یہودیوں کے پاس کیا دھرا ھے ۔ حالانکہ اللہ کی کتاب دونوں پڑھتے ھیں ۔ ٹھیک ایسی ھی بات ان لوگوں نے کہی جو علم نہیں رکھتے ۔“ (بقرہ ۱۱۱ - ۱۱۲ - ۱۱۳) ۔ خدا

کسی خاص قوم یا مذہب کے لئے مخصوص نہیں ہے ، اس کے لئے تمام سمتیں ہیں ، رسمی طور پر ادھر یا آدھر رخ کر لینے کی کوئی اہمیت نہیں -

وللہ المشرق و المغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ ان اللہ واسع علیم -

اور دیکھو مشرق ہو یا مغرب ساری دنیا اللہ ہی کے لئے ہے - کہیں بھی تم اللہ کی طرف رخ کرلو اللہ تمہارے سامنے ہے - بلا شبہ اس کی قدرت کی سمائی بڑی ہی سمائی ہے ، اور وہ سب کچھ جاننے والا ہے - (بقرہ - ۱۱۵) -

قرآن کی رو سے پرہیزگار زندگی اور دوسروں کے ساتھ نیک عملی تمام مذہبی معتقدات اور اعمال کا مقصد وحید ہے - رسمی اختلاف کی بجز اس کے کوئی اہمیت نہیں کہ وہ اپنے رواج اور یک رنگیوں کے ذریعہ ایک جماعت کو معاشری حیثیت سے مربوط رکھتے ہیں -

ولکل وجهة هو موليها فاستبقوا الخيرات اين ما تكونوا يات بكم الله جميعا ط ان الله على كل شئ قدير ط -

” اور ہر گروہ کیلئے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رخ پھیر لیتا ہے - پس نیکیوں کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرو - تم جہاں کہیں بھی ہو خدا تم سب کو پالے گا - یقیناً اس کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں -“ (بقرہ - ۱۴۸) -

قرآن میں ایک اور آیت ہے جو نہ صرف عالمگیر مذہب کی اساس کو پیش کرتی ہے بلکہ دیگر مذاہب کے پیروؤں کو ، اگر وہ بنیادی چیزوں کو تسلیم کرلیں تو ، مسلمانوں کی طرح صاف طور پر صداقت کے علمبردار اور فوزو کامرانی کے پانے والے بتلاتی ہے -

” یہ تمام خدا پرستوں کو باہم متحد کرنے کے لئے ایک اساس ہے

جو نظام اخلاق کو تسلیم کرتے اور نتیجتاً جزا و بقا کو مانتے ہیں۔ اصلاً یہی خدا پرستی اور نیکی ہے۔ یقیناً وہ جو مومن ہیں (یعنی وہ جو اسلامی زندگی کے دائرہ میں داخل ہوتے ہیں) اور وہ جو یہودی، نصرانی یا صابی ہیں، جو کوئی بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتا اور نیک اعمال ہے۔ ان کو اپنے مالک کے پاس صلہ ملیگا۔ وہاں نہ انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے"۔ (بقرہ - ۶۲) اسلام دیگر انبیاء اور کتب آسانی کے لئے ازسرتاپا تعریف و توصیف ہے اور جہاں کہیں وہ مذہب کے اصلی عنصر کو پیش کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کو دوسرے صحف آسانی میں بھی پاؤگے۔ وہ دیگر کتب سماوی کو ھدایت اور نور سے تعبیر کرتا ہے جن میں دین کے اصلی اجزا دئےگئے۔ یہ جملہ مسلمانوں کو کل انبیاء کی تعظیم کا حکم دیتا ہے جنہوں نے کسی جگہ اور کسی زمانہ میں بھی خدا کی وحدانیت اور حق و انصاف کے اصول کی تبلیغ کی ہو۔

اسلام حقیقت کے تقاضہ کو تسلیم کرتا اور ان کا جواب دیتا ہے۔ اس کے نزدیک کل حقیقت ایک ہے، اس لئے تمام صداقت بھی ایک ہے۔ وہ انسانیت کو ایمان کے بنیادی اصول کی دعوت دیتا ہے جن میں کوئی فرقہ پرستی نہیں اور جو جملہ طریقہ ھائے عبادت کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے ایک معین صورت میں ایک معاشرہ کی تشکیل کی اور اپنے خاص رسوم بنائے لیکن وہ ساتھ ھی دوسروں کی زندگی کی بھی کامل قدر و منزلت کرتا ہے، جو کسی نوع سے اس کے نظام سے باھر مگر اصلی اجزا کے حامل ہیں۔

باب دوم

مذہبِ فطرت اور فوق الفطریت

ہم کو ان اسباب کا دقت نظر سے مطالعہ کرنا چاہئے جو مشرق اور مغرب میں مذہبی معتقدات کی کمزوری کا باعث ہوئے۔ مشرق تمام بڑے بڑے مذاہب کا گہوارہ رہا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ مشرقی اقوام اب تک مذہبی خیالات ہی سے رہنمائی پاتی رہی ہیں۔ مگر یہ باطل خیال ہے۔ ہم کو مذہب کے ساتھ مشیخت، تنگ نظرانہ دینداری، اور توہم پرستی کو خلط ملط نہ کرنا چاہئے۔ مذہبی زندگی اپنی تمام اصلیتوں کے ساتھ عنقا رہی ہے۔ انسان عادتاً محض حیاتیاتی حفظ ذات کے تقاضوں کے ذریعہ راہ یاب ہوتا ہے، اور افادی جذبہ کے تحت وہ ان رسوم اور ایجابی اخلاقیت کی پیروی کرتا ہے جو اسے بطور معاشری ورثہ کے پہنچتی ہیں۔ ایک عامی عادتی طریقوں، رسمیت اور مذہبی معمولات پر اعتقاد رکھتا ہے اور ان اعمال کی ظاہرداریاں اس کی روحانی زندگی کا آب و دانہ ہوتی ہیں۔ تمدن جدید کے اثرات نے عوام کے ان مذہبی معتقدات کو بھی کمزور کردیا ہے۔ یہ قدیم رواجی نظام پراگندہ ہوچکا ہے اور کوئی نیا نظام ہنوز اسکی جگہ نہیں لے سکا۔ موجودہ زندگی کی تلخیوں اور سخت کوشیوں نے صنعتی انقلاب کے بعد نشو و نما پایا ہے۔ ان کا میلان زندگی کے متعلق انسان کے قدیم تصورات کا استیصال ہے جس سے اس کے اقدار میں ایک عظیم قلب ماہیت واقع ہوئی۔ قدیم فرقہ داری بندھن یا تو ٹوٹ چکے ہیں یا ان پر بسرعت تمام

تحلیلی عمل جاری ہے۔ فرقہ واری تعلق کے ساتھ عائلی رشتے بھی ڈھیلے پڑ رہے ہیں اور وہ مذہبی تصورات جن سے ایک خاندان اور ملت باہم پیوستہ تھے رفتہ رفتہ زوال و انحطاط سے دوچار ہوچکے ہیں۔ موجودہ تمدن نے تنازع للبقاء کو سخت تر کر دیا ہے۔ اب یہ اصول زندگی کارفرما ہے کہ ہر ایک اپنی ذات کے لئے ہے اور جو پیچھے رہ جائے وہ جہنم میں جائے '۔ حیات انسانی کے یہ تغیرات اپنی تمام شکلوں میں جو ان تبدیلیوں سے وقوع پذیر ہوئے ہیں ایک وسیع اور مختلف النوع مسئلہ ہے جو ہماری اس کتاب کا موضوع نہیں، کیونکہ یہ ایسے عقلیت پسندوں کے لئے ہے جو مذہب کے اساسات کو ماننے میں، سائنس کی عہد آفریں ترقیات کے پیدا کردہ فطرت پسند نظریہ کی ترقی کے سبب، دشواری محسوس کرتے ہیں۔ مذہب فطرت پر دور جدید کے ارباب دانش کا ایمان راسخ اور بخوبی مضبوط ہوچکا ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مذہب فوق الفطرت امور سے بحث کرتا ہے تو ان پر اس کا فوری اثر انکار و بیزاری کی صورت میں ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر چیز فطرت ہے اور جو فوق الفطرت ہے وہ متخیلہ اور واہمہ کے دائرہ میں داخل ہے۔ جب وہ چاہتے ہیں کہ مذہب کو فطریت اور عقلیت کے حدود میں رہ کر سمجھیں تو زیادہ سے زیادہ جو سمجھتے اور غور کرسکتے ہیں وہ صرف اخلاقیت ہے، جس کی بڑے بڑے معلمین مذہب نے تعلیم دی ہے، اور یہ کہتے ہوئے گذر جاتے ہیں کہ ہمیں صرف اخلاقیت سے سروکار ہے۔ اگر مذہبی اعتقاد، اخلاقیت اور معاشری انصاف کے لئے سہارا ہے تو ہمارے لئے اس پر یقین کرنا کافی ہے اور اس کو ہم اپنی زندگی میں محسوس

صورت دینے کی کوشش کرینگے - لیکن هم فوق الفطرت سہاروں کی کوئی پرواہ نہ کرینگے جن کی نہ همیں کوئی ضرورت ھے اور جو نہ اپنا کوئی وجود رکھتے ھیں -

لیکن کیا یہ فطرت معقول اخلاقیت کے لئے بھی کوئی مستحکم اور یقینی سہارا بن سکتی ھے ؟ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں سائنس کی ترقی کے ساتھ رجائیت کی ایک لہر تمام مغرب میں دوڑ گئی - فطرت پر قابو اور علم نے انسان کو اس بات کا یقین دلایا کہ سائنس اور عقلیت کے ذریعہ زندگی کی بہت سی برائیوں پر غلبہ حاصل کیا جاسکتا ھے اور اس طرح کا حکمیاتی منظم وجود ایک درخشاں دور کا آغاز کریگا - یہ عہد زریں کسی دور گذشتہ میں رو پوش نہیں بلکہ یہ سائنس کے ذریعہ مستقبل میں حاصل کیا جا سکتا ھے - اخلاقیت کی ترقی کے فریب نے بھی ان رجائیوں کے قلوب پر قبضہ کر لیا تھا- مغربی یورپ نے بالخصوص ماضی کی درماندگیوں کو نظر حقارت سے دیکھنا شروع کیا تھا اور اپنے آپ کو اس خیال سے دھوکہ میں ڈالے ہوئے تھا کہ وہ اخلاقی لحاظ سے بھی بہت حساس اور لطیف ہو چکا ھے - مگر دو عظیم جنگوں نے ، جو معاشی سامراجیت اور مجنونانہ قومیت نے لڑیں ، صورت حال کو دوسری انتہائی جانب جنبش دے دی - کشمکش حیات کی بابت ڈاروینی تعلیمات نے خود کو حق بجانب جانکر نسلیت ، نازیت ، اور فاشیت کے نظرئے پیدا کئے - فطریت کے علم بردار نٹشے نے فوق البشر کی آمد کے خیال کو ھوا دی جو آکر سابقہ مسلمہ اخلاقی اقدار کو پامال ، اور محبت و معاشری عدل کا یک قلم صفایا کر دیگا- طاقت روح حیات ھے اور طاقت اپنے آپ کو حق بجانب قرار دیتی ھے-

عشق ، رحم ، انصاف ، اور عوام کے حقوق ، ان کی کوئی قدر نہیں ، اس لئے یہ ترک کرنے کے قابل هیں ، یہ سب محکومانہ اخلاق کے برگ و بار هیں ۔ حاکمانہ اخلاقیت ان اقدار کی قدر و قیمت دوبارہ فوق البشر کے مناسب حال مشخص کریگی جو بجائے خود ایک قانون کی حیثیت رکھیگا ۔ وہ خدا ، جس نے ان تمام حسن و شفقت کے اقدار کو محسوس صورت دی تھی ، فنا هوچکا تھا ۔ یہ فطرت تھی جو ارتقائی حیاتیت سے منطقی طور پر ظہور پذیر هوئی تھی ۔ دوسری طرف طبیعیات اور علم کیمیا تھے ۔ یہ ان هلاکت آفریں ایجادات میں منہمک تھے جن کے ذریعہ کل انسانیت کا قلیل عرصہ میں صفایا هو سکتا تھا ۔ تمام ماهرین علوم فطرت مختلف گوشوں میں اپنے دشمن کو جلد سے جلد تباہ کرنے میں سرگرم مسابقت تھے ۔ مذهب پر مجنونانہ بہیمیت کا الزام لگایا جاتا هے اور یہ دعویٰ کیا جاتا هے کہ اگر فطریت اس کی جگہ لے لے ، اور عقل کو خدا بنا کر براجمان هو جائے ، تو دنیا میں هر چیز بہتر هو جائے گی ۔ یہ تمام امید افزاء خواب جو ترقی کے لئے لابدی سمجھے جاتے تھے ان دو عالم آشوب عظیم جنگوں کے باعث پا در هوا ثابت هوئے ۔

مذهب پر فطریت نے حملہ کیا جو بالاخر مذهب کے حق میں نفع بخش ثابت هوا ۔ اصل مذهب وهمی نیم اعتقادیوں اور نقلی حکمیاتی معتقدات سے پاک کیا گیا جو اپنے طور پر مذهبی نظام میں داخل هوگئے تھے ۔ اس کے بعد مذهب کا اپنا علحدہ مقام رها اور وہ واقعات فطرت کے شرح و بیان سے رکا رها ۔ عقلیت جس کا نشو و ارتقا بحیثیت مجموعی سائنس کے ساتھ هوا ، اس نے بھی ثقافت کے مختلف دائروں میں بہت

اچھی خدمت انجام دی ۔ مادیت نے بھی قدیم لغویات کو دور کر کے نوع انسانی کو نفع پہنچایا ۔ انسانی ذہن آزاد ہو کر فطرت کے روبرو تنہا اپنی ذاتی حثیت سے آسکا ۔ سائنس اب دینیات کی پیش خدمت نہیں رہی۔ مذاہب جو محیرالعقول باتوں پر مبنی تھے ، اب معقولی دماغ کو لبھا نہ سکے ، اور نہ وہ معتقدات جن کی بناء اسرار و رموز تھے ، یا وہ تاریخی ڈرامے جو صدیوں قبل کھیلے گئے تھے اور جو کائنات کے دائمی اقدار کی اساس بنے ہوئے تھے ۔

مذہب فطرت اپنا کام ختم کر کے اندرونی طور پر انحطاط پذیر ہونا شروع ہوا ۔ فطرت اور عقل انسانی کے متعلق اس کا خیال نہایت تنگ اور متعصبانہ تھا اور اس کا یہی تصور سببیت کے متعلق تھا ۔ جس شے کو یہ قانون علیت کہتا تھا وہ فی الحقیقت بین المظہری نظم و ترتیب کی یک رنگیاں تھیں ، اور یہ باضابطگی ایک دائرہ وجود سے دوسرے دائرہ وجود میں مختلف ہوتی رہتی تھیں ۔ مادہ میں جو علیت کار فرما تھی ، اس کی قلب ماہیت ہو جاتی تھی ، جب مادہ زندگی سے آراستہ ہوتا یا زندگی مادہ کو اپنی شکل صورت دے کر اپنے تقاضوں کے مطابق اس کی کایا پلٹ دیتی ۔ مذہب فطرت کی غلطی علیت کے محدود اور ناقص تصور میں پوشیدہ ہے ۔ میکانی اصول پر اس کی ترکیب و افعال کے بیان میں دیوانہ وار کوششیں کی گئیں ۔ یہ کہا گیا کہ دنیائے سائنس ایک عملی ریاضیات کا دائرہ ہے ۔ اور تمام حیاتیاتی طریقے میکانی اور کیمیاوی نوعیت پر ڈھالے جانے چاہئیں ۔ مگر یہ مفروضہ اتنا بودا ، گنجلک اور تمام قوانین حیات کے مشاہدات کے خلاف تھا کہ خود مذہب فطرت کی چار دیواری میں اس کے

خلاف بغاوت رونما ہوئی اور یہ تسلیم کیا گیا کہ عضویاتی کی تشریح غیر عضویاتی سے نہیں کی جاسکتی، یہ دونوں مختلف مراتب وجود سے متعلق ہیں اور اپنے مخصوص ابواب علیت کے زیر اثر ہیں۔ اس طرح حیاتیات اور طبیعیات کے درمیان رخنہ پیدا ہوا اور دنیا کی حکمیاتی وحدت خیالی پارہ پارہ ہوگئی۔

نفس انسانی کے عمیق مطالعہ نے مزید اس امر کا انکشاف کیا کہ نفس انسانی محض حیاتیاتی آلۂ کار ہونے سے زیادہ کچھ اور ہے۔ میکانی طبیعیات نے نفس انسانی کو گھٹا کر ایک فوق المظہر شئے قرار دیا۔ اس کے نزدیک یہ خلیات دماغ کے افعال کی ایک غیر موثر ذیلی نمود تھی، جو طبعی قوانین کے عمل اور ردعمل کے تابع فرمان تھی اور ہیجان و تاثیر دونوں میکانی طریقہ پر متعین ہوتے تھے۔ حیاتیاتی طریقہ سے بھی شعوریت کو اس سے زیادہ اہمیت نہ تھی کہ وہ ایک ادارۂ زیست کی ممدو معاون تھی۔ آخر کار یہ بات تدریجاً تسلیم کی گئی کہ نامی کے لئے غیر نامی تعبیر بیان اختیار نہیں کیا جاسکتا اور اس طرح یہ حقیقت رفتہ رفتہ انسانی وقوف و آگہی پر ظاہر ہوئی کہ نفس انسانی نہ تو خاموش تماشائی ہے اور نہ یہ محض ذریعہ ہے جسمانی وجود کو قائم و بر قرار رکھنے کا۔

لیکن کیا یہ فطریت کی جانب تدریجی ترقی ہے؟ فطریت اور مافوقیت ہر دو مصطلحات غیر معین اور گمراہ کن ہیں۔ یہ چیز انتہائی اہمیت رکھتی ہے کہ ہم ان ہر دو کے باہمی ربط سے کسی مفید نتیجہ پر پہنچنے سے قبل ان کی واضح تعریف کر دیں۔ اگر فطرت سے مراد جملہ موجودات بشمول مادہ، حیات، نفس اور ماورائے نفس زندگی

کے منظم وجود سے ہے، اور اگر یہ کوئی حقیقت ہے، تو اس کے مفہوم میں جملہ حقیقی وجود معہ تمام مراتب کے بشمول حیات الوھی داخل ھونگے - اس وسیع اور جامع مفہوم کو تسلیم کرنے کے بعد کوئی چیز فطرت سے باھر نہیں ھو سکتی اور فوق الفطرت محض ایک سلبی تصور ھوگا، جس کی کوئی حقیقت اس کے بالمقابل نہوگی - مگر فطریت جس کی نشوونما گذشتہ صدی میں ھوئی بہت محدود وسعت رکھتی ھے - اس کا مفہوم صرف مادی یا میکانی فطریت سے تھا، جس کے لئے مادہ اور توانائی یا کوئی ایسی چیز جس میں مادہ اور توانائی دونوں شامل ھوں، ایک مجرد حقیقت تھا - اس کے نزدیک صرف قابل پیمائش اور قابل غور ھی حقیقت کا درجہ رکھتے تھے - یہ عام طور پر سائنس نہیں تھی بلکہ اس طرح کی فطریت تھی جو سائنس نہیں کہلائی جا سکتی - یہ ایک طبیعیات تھی جو مذھب سے بر سر پیکار رھی - مذھب کی بناء بالعموم غیبیات پر ھے، جیسا کہ قرآن کے ابتدائی سطور ھی سے اس کا ثبوت ملتا ھے - یہ غیب صرف ھمارے لئے ھے خدا کے لئے نہیں - کیونکہ خدا علیم و بصیر ھے - اس کے لئے ھر چیز جانی بوجھی ھوئی ھے - تنگ نظرانہ اور ٹھٹھری ھوئی فطریت وجود نفس پر بھی، جس کی یہ ذھنی آفریدہ تھی، ایمان نہ لا سکی - کیونکہ نفس ایک غیر مرئی چیز تھی - مذھب نے فطریت کے خلاف، جس کے نزدیک غیبیات ایک بے حقیقت چیز تھی، برگشتگی کا اظہار کیا، کیونکہ اس قسم کا یقین خودکشی کے مترادف تھا - فطرت کا تصور عقلی اور ممکن الثبوت ھونے کے تحت یہ تھا کہ وہ ان تمام مراتب وجود کو شامل کرلے جو مختلف ابواب سببیت کے تابع ھیں -

اگر ہم اصطلاح فوق الفطرت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی تعریف اس طرح کرنی چاہئے کہ فطریت درجاتی وجود کی حامل ہے جس کے چار درجات ہمارے مشاہدہ اور تجربہ میں آچکے ہیں یعنی مادہ ، حیات، نفس بہیمی ، اور نفس بشری - حیات مادہ کے لئے مافوق الفطرت چیز ہے ، نفس بہیمی حیات کے لئے فوق الفطرت ہے ، اور نفس بشری ان تمام مراتب کے لئے ماورائے فطرت ہے ، جو اس سے فروتر ہیں - ادنیٰ کے قوانین اعلیٰ پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے ، اگرچہ کہ اعلیٰ ادنیٰ کو اپنے اندر سمو لیتا ، گھل مل جاتا ، اور اپنے ابواب سببیت کے مطابق اسکو ڈھال لیتا ہے - یہ ہمارے عام تجربہ کی قلمرو ہے اور مذہب کے اس اعتقاد میں کوئی غیر معقولیت نہیں - یہ مراتب وجود کو مزید وسعت دیتا ہے اور ہم سے اس یقین کا مطالبہ کرتا ہے کہ فطرت تجربہ شدہ ترتیب پر ختم نہیں ہوجاتی ، یہ مادہ سے خدا کی طرف وسعت پزیر ہوتی ہے - اگر برتر فرو تر کو لے کر اس کی قلب ماہیت کرے اور ابھارے ، اور وہ برتر کے نمود وبروز سے فنا وتباہ نہو ، تو کل فطرت بہر نوع خدا کی ذات میں محو ہو جائیگی جو ہر چیز کا باطن ہے اور ساتھ ہی اس کا ظاہر بھی - نفس کے دائرہ میں زمان کو اہمیت حاصل ہے مگر مکان کوئی مفہوم نہیں رکھتا - اگرچہ مادہ کی قلمرو میں زمان و مکان ایک وجود کے لئے تار و پود کی حیثیت رکھتے ہیں - ہمیں اس عقیدہ سے کون سی چیز مانع ہے کہ وجود کے بھی درجات ہو سکتے ہیں جہاں ہمارا زمان بھی ترقی پاتا ہے - اپنے قلب و نفس کے حلقۂ اثر میں ہم ایسے حقائق سے واقف ہیں جو قید زمان سے آزاد ہیں ، جیسا کہ ایک ریاضی داں یقین رکھتا ہے کہ ریاضی کے بدیہیات بلا قید زمان حق ہیں -

یہی فوق الفطریت ہے جس پر ایمان کا تمام مذاہب حق ہم سے مطالبہ کرتے ہیں اور یہی غیبیات پر ایمان لانا ہے۔ وہ فوق الفطریت، جس سے مراد فطرت کے کاموں میں ایک خاص سطح پر مطلق العنانہ دخل اندازی سے ہے، اسلام اس کی تردید کرتا ہے۔ کوئی غیر معمولی واقعہ جو روحانی قوت کے ذریعہ کسی برگزیدہ پیغمبر یا ولی سے سرزد ہوتا ہے وہ کوئی فوق الفطرت چیز نہیں ہوتی، بجز اس کے کہ اعلیٰ سطح کی سببیت ادنیٰ سطح کے وجود میں تعلیلی نتائج کو بدل دیتی ہے۔

اسلام میں فطریت کا یہی وسیع مفہوم ہے۔ طبیعی فطرت ایک عظیم الوہی ظہور کی صورت میں پیش کی گئی ہے اور اسلام اس پر راسخ عقیدہ رکھتا ہے کہ طبیعی افعال فطرت بھی عقلیت، طریق کار، اور نیکی سے مطابقت کے کافی علامات ظاہر کرتے ہیں، تاکہ عرفان الٰہی ان کو عطا کریں جو بلا کسی تنگ نظری یا عسیر الفہم مفروضات کے عقل سلیم کے ساتھ تدبر و تفکر کرتے ہیں۔ پھر وہ ہم سے عضویاتی عالم میں توافق و تناسب کا تقاضہ کرتی ہے، صرف اونٹ کی ساخت اور بناوٹ کا مطالعہ ہمیں فطرت کی معقولیت تسلیم کرنے کے لئے کافی ہے۔ * قرآن کل فطرت کو فطرت اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔ جیسا کہ انسان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ فطرۃ الٰہی جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے † ۔ پھر وہ کہتا ہے کہ خود تمہارے نفوس کے اندر نشانیاں ہیں، تم کیوں غور نہیں کرتے''۔ ستارے جو خاص اندازے اور دقیقہ سنجی کے ساتھ اپنے مدار

* الی الابل کیف خلقت ۔ غاشیہ — ۱۷

† فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا — روم — ۳

پر گردش کر رہے ہیں وہ بھی قدرت کی نشانیوں سے تعبیر کئے گئے ہیں۔ قرآن اپنے آپ کو کتاب حکمت کہتا ہے۔ قرآن ہم سے بلا سبب وعلت بیان کئے کبھی ایمان کا مطالبہ نہیں کرتا۔ ہمیں کہا گیا ہے کہ ہم عالم شہادت کا بغور مطالعہ کریں، کیونکہ ہمارا یہ مطالعہ ہمیں عالم غیب کی طرف لے جائیگا۔ عالم غیب اور عالم شہود دونوں ایک ہی خط مستقیم پر واقع ہیں، اور قانون ترتیب بتدریج علل واسباب کے ساتھ عروج کرتے ہوئے مادہ سے خدا کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہ اسلامی فطریت ہے جس کو تم فوق الفطریت بھی اس مفہوم میں کہہ سکتے ہو جس کو ہم بیان کرچکے ہیں۔

باب سوم

علاقۂ علت و معلول کا قرآنی تصور

قرآن کہتا ہے کہ خدا کی ذات کل موجودات کی علت‌العلل ہے - یہ وہ ہستی ہے جو بنیاد ہے تمام ممکنات کی یہ ایک حقیقت ہے جو پیدا کرتی ، اور تمام تحولات میں اعانت کرتی ہے - وہی اول ہے اور وہی آخر ، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ، وہی شہود ہے اور وہی غیب ، وہی ہر چیز میں ساری ہے اور وہی ہر چیز پر محیط ، وہ اپنی قدرت ، علم اور تعقل سے عالم میں سرایت کئے ہوئے ہے ، مگر وہ کائنات کا اس طرح احاطہ کئے ہوئے ہے کہ کائنات کی ایک منزل کسی ایک وقت میں اور مجتمعاً کل شیون کل وقتوں میں اس کی تخلیقی مشیت کا صرف ایک محدود اور جزوی ظہور ہے - خالق اور کائنات کاملاً مماثل نہیں ہوسکتے ، جیسے کہ ایک مصور ہمیشہ اپنی تصویر سے مافوق ہوتا ہے ، اگرچہ کہ وہ اپنے فنی نمونہ میں سرایت کئے ہوئے ہو - تصویر اس کے الہامی نمونہ کی ایک محسوس صورت ہوتی ہے - خدا کی باطنیت اور ظاہریت کی کامل بصیرت حاصل نہیں کی جاسکتی ، غیر محدود اور لایزال ہستی کا زمانی و مکانی ابواب میں اظہار نہیں کیا جاسکتا - اس کے مثل کوئی چیز نہیں ، خواہ اشیاء میں ہو یا ہمارے نفسی اور مادی ابواب میں -

کائنات یا فطرت خدا کی مشیتی تخلیق ہے ، کیونکہ وہی ارادہ تخلیق ہے - دھر کی تخلیق کو کاملاً نہیں سمجھا جاسکتا ، کیونکہ زمانہ خود تخلیقی قبیل سے ہے - مگر صفت خالقیت کو

خدا کی خاص صفت ہونے کے سبب تخلیق کو اس کی ذات سے مثل ہم بود وہم وجود سمجھنا چاہئیے ۔ اس کے صفات کی بے پایانی سینکڑوں جہان اور کائنات پیدا کر سکتی ہے ۔ ہماری مادی دنیا اپنی تمام زمان و مکان کی پہنائیوں کے ساتھ اس کی خلقتوں میں سے صرف ایک ہو سکتی ہے ۔ کائنات ، جیسا کہ ہم اس کو جانتے ہیں ، ہو سکتا ہے کہ قدیم نہو ۔

اسلام کا خدا بوجہ اعتدال پسند ہونے کے کبھی بے نظم وترتیب ہیولے کا خالق نہیں ہو سکتا اور نہ وہ کسی ایسے غیر متشکل مادہ کی بد نظمی سے دو چار ہوا جس کا پہلے سے کوئی وجود ہو اور جس کو اس نے اپنی مشیت سے زندہ کیا ہو ۔ یہ چیز اس کے حکیم ہونے کی صفت سے تبعاً پیدا ہوتی ہے ، جو صاحب عقل و حکمت ذات ہے ۔ جو کچھ وہ پیدا کرتا ہے اس کا وجود و ظہور حکمت پر مبنی ہوتا ہے ۔ حکمت ، نظم ، مقصد ، اور صداقت کو ظاہر کرتی ہے ۔ اس لئے قرآن بار بار اس نظریہ کو دھراتا ہے کہ خدا نے سارے عالم کو حق اور کسی مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے اور یہ محض کھیل تماشہ نہیں ہے ۔ قرآن کی اصل حجت کا ثبوت وہ علت اولیٰ ہے جو فطرت میں نظم و ترتیب سے پیدا ہوتی ہے ۔ فطرت ایک قانون کی حکومت ہے ، وہ بے قید ارادوں کی پیداوار نہیں ۔ فطرت کی یہ عقلی وحدت اس کا ایک خالق ہونے کی دلیل ہے ۔

خدا اور فطرت کے قرآنی تصور اور ان کے باھمی تعلق کی رو سے کوئی ناگزیر بین مظہری علیت نہیں ہے ۔ کوئی حادثہ اپنے ذاتی اختیار سے کسی دوسرے حادثہ کی علت نہیں ہوسکتا ۔ حادثات جو بظاہر علت و معلول سے مربوط نظر آتے ہیں ،

اور ہم تجربتاً بلا کسی ثابت شدہ فرضیہ کے معلوم کر سکتے ہیں ، وہ ایک عادتی ترتیب ہوتے ہیں۔ اگر ہم لفظ علیت کو ضروری اور ناگزیر نتائج کے لئے بھی استعمال کریں تو ہم کو قرآن کے بموجب یہ ماننا پڑیگا کہ تمام علیت کی حقیقت خالق کی مشیئت ہے۔ ایک منظم کائنات کی تخلیق کر کے خدا اپنی مشیت سے دست بردار نہیں ہوگیا۔ مادی طبیعیات اس پر زور دیتی ہے کہ طبعی علیت اندھی اور میکانی ہے ، اور اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ حیات اور نفس کو بھی میکانی علیت کے طریقوں پر بیان کیا جائے۔ ان کوششوں کا ناکام ہونا قطعی ہے ، کیونکہ عضویت اور اس کے بالارادہ افعال کی تشفی بخش تشریح میکانی قوانین کے ذریعہ نہیں کی جاسکتی۔ عضویت کے فعل و اثر کی محض میکانی فعل و اثر سے اب قطعی طور پر تفریق کی جاچکی ہے۔ عضویاتی تخلیق و نمو مقصد تلاش اعمال ہیں، مگر تمام عضویاتی زندگی مادی عالم میں کار فرما رہتی ہے، اس لئے ہم کسی عضویت میں دو نوع کے فعل و اثر باہم پیوستہ اور پہلو بہ پہلو کار فرما دیکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ حیات میزان وجود میں مادہ سے زیادہ وزن رکھتی ہے اس لئے مادی فعل و اثر حیاتی فعل و اثر کے تابع ہوتا ہے۔ میکانیت غایتی اور مقصد تلاش حرکات کے تابع ہوتی ہے۔ اگر تسلسل وترتیب مادی حوادث میں مطلق اور واثق فعل و اثر کا نتیجہ ہے تو ان میں حیات کا وجود نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اعلٰی طبقۂ وجود کا فعل و اثر ادنٰی و طبقۂ وجود کے فعل و اثر میں تبدیلی اور تغیر پیدا کر سکتا ہے۔

ہمارا روزمرہ کا تجربہ صرف تین طبقات وجود، مادہ ، حیات، اور نفس کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ تینوں طبقات کی قسمیں اپنی

سببیت میں مختلف اور انوکھی ہیں - جیسا کہ مادی علیت کی جگہ حیاتی اعمال لیتے ہیں ایسے ہی حیاتی اعمال نفسی اعمال کی پیروی کرتے ہیں - جہاں کہیں نفس کسی درجہ میں ابھرتا ہے ، نفس انسانی ، جسم انسانی کے اعمال پر نا قابل شمار حد تک اثر انداز ہوتا ہے - نفس و جسم کے باھمی عمل کا کسی طریق بیان یا ابواب کے ذریعہ ادراک نہیں کیا جاسکتا جو مادہ یا عضویاتی حیات کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں - انسان میں ہم تین طرح کی علیت پہلو بہ پہلو کار فرما دیکھتے ہیں جو ایک دوسرے پر عمل کرتی رہتی ہے - سائنس ابتک ان پیچیدہ مسائل کے حل کرنے میں سرگرداں ہے جو ایک وجود میں تین قسم کی علیت کے باھمی عمل اور متوازیت سے رونما ہوتی ہے - اگر ہم اس خیال کو اختیار کریں کہ وجود کئی حالتوں کے ایک دوسرے پر قائم ہونے کے سبب درجاتی ہے ، جس میں برتر اپنے سے فروتر کے اعمال میں تبدیلی کرتے ہوئے ایک اعلیٰ مقصد پورا کرے ، تو یہ ہم کو ایک عالم گیر قانون ہستی پیش کرتا ہے - یہ کس طرح ایک دوسرے پر اثر کرتے ہیں اس کی منطقی اور نظری توجیہ نہیں کی جاسکتی ، مگر منطقی مشکلات حیات کے نمایاں حقائق کو باطل نہیں کرسکتے - زیادہ معقول طریقہ یہ ہے کہ حقائق کا اثبات کیا جائے ، اور حقیقت کو سمجھنے کے لئے ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیا جائے -

ایسی صورت میں نفس سے اوپر وجود کے دیگر مراتب ہو سکتے ہیں - ایک عام آدمی کو بشمول سائنس دان ، نفس کے مافوق کی بات کا تجربہ نہیں ، لیکن تمام بڑے مذاھب روح یا مافوق نفس حیات سے بحث کرتے ہیں - مختلف زمانوں اور قوموں کے متصوفانہ تجربات رکھنے والے اصحاب ، جنھوں نے متفاوت

مذھبی روایات میں نشو و نما پائی ہے اور جو مختلف روحانی نظامات کی پیروی کرتے ھیں، اپنے اس دعوے میں متفق ھیں کہ نفسیاتی عقول پر وجود کے درجات ھیں، نفس کے اوپر ھر اقلیم اپنی مخصوص علیت اور ابواب کی محکوم ہے۔ جیسے حیات مادی ابواب میں سمجھی نہیں جاسکتی اور نفس کا ادراک عضویاتی اعمال کے قوانین سے نہیں ھوسکتا، ایسے ھی عام ذی شعور نفس کے اوپر وجود کے درجات اور شعوریت ان قوانین کے زیر فرمان ھوتے ھیں جن کا شمار ھمارے شعوری اور منطقی نفس کے تعلیلی ابواب کے تحت نہیں کیا جاسکتا، جو اپنے معلومات زیادہ تر حواس سے حاصل کرتے ھیں۔ تمام انبیاء، اولیاء اور دیگر خاص صلاحیتوں کے حامل اشخاص کے متفقہ تجربات سے رو گردانی کرنا، اور ان سب کو یک ساتھ مثل التباس و اوھام کے سمجھنا محض ھٹ دھرمی سمجھی جائیگی۔ ان صوفیاء میں بعض مثل غزالی کے قوی ذھنی استعداد رکھتے تھے۔ یہ جذباتیت سے ایسے ھی نفور و گریزاں تھے جیسے کہ ایک سنجیدہ منطقی اور سائنسداں ھوتا ہے۔ بلند مرتبہ حقیقت کے فوق النفسی احساس کے متعلق غزالی کہتے ھیں کہ جو اس تجربہ سے دو چار ھوتا ہے، وھی جانتا ہے کہ یہ حواس کے تجربہ یا منطقی نتائج سے زیادہ ٹھوس حقیقت رکھتے ھیں۔ یہ محض احساس کی کیفیت نہیں ھوتی بلکہ ایک علم ھوتا ہے جو اس کیفیت کا موجب ھوتا ہے جو قابل حس یا منطقی ابواب میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ آنکھ سماعت سے محروم ہے، اور کان بصارت سے بیگانہ، ایسے ھی نفس ان کا ادراک نہیں کر سکتا جو فوق النفسی شعوری کیفیات ظاھر کرتے ھیں۔ ان کا بیان صرف تمثیلات میں ھوسکتا ہے جو نہایت آسانی سے گمراہ کن ھو سکتے ھیں۔

اب اگر مختلف درجات وجود اور شعوریت کے ساتھ ایک پر ایک دنیائیں آباد ہیں - ہر ایک اپنی مخصوص سببیت کے ساتھ وابستہ اور ہر ایک عالم اپنے ماتحت عوالم پر چھایا ہوا ہے، اور اعلیٰ مقصد کو پورا کرنے کے لئے فروتر عوالم کے کاموں میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے تو یہ صعود کرتے ہوئے عوالم بالآخر ذات الٰہی پر منتہی ہونگے - الوہیت کی سطح پر بھی ایک خاص قسم کی علیت ہونی چاہئے جو اپنے تمام ماتحت علاقوں پر اثر انداز ہوتی اور تبدیلی پیدا کرتی ہو، جہاں خدا علت العلل کی طرح کار فرما ہو - جب حیات مادہ کے اعمال بدل سکتی ہے، اور نفس حیات کے اعمال میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے، تو پھر کیوں مافوق اقالیم اپنے جملہ ماتحت اقالیم میں تبدیلی ایک برتر کلی مقصد کی تکمیل کے لئے نہیں کر سکتے - فطرت کو اس وقت تک اپنے تسلسل و ترتیب کی اجازت ہے جب تک کہ حیات منظر عام پر آ کر خود کو اپنے مقاصد کے مطابق ڈھال نہ لے، اور حیات اپنے امتیازی قوانین کے بموجب اس وقت تک ترقی کرتی ہے جب تک کہ نفس اپنے اغراض کے تحت اس کو مطیع کرنے کے قابل نہ سمجھ لے - اس طرح ہم درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے خدا تک رسائی حاصل کرتے ہیں - خدا میں یہ ارادہ اور قدرت ہونی لازمی ہے کہ جو کوئی اس کے ماتحت ہو اس کو اپنے مقاصد کے مطابق کر لے، جس کو مذہب کی رو سے معجزہ کہا جاتا ہے - اس سے مراد قوانین فطرت کی خلاف ورزی نہیں - اگر تمام مراتب وجود کی کلیت کو فطرت کا نام دیا جائے تو فوق الفطرت کی اصطلاح بے معنی ہو جاتی ہے - قوانین کو توڑا نہیں جا سکتا بلکہ ایک قانون دوسرے قانون کے کاموں میں دخل اندازی

کر سکتا ھے اور نتیجہ میں اس کے مطابق تبدیلی واقع ہوتی ھے۔

اسلام خوارق عادات کی اصطلاح کو عام مفہوم میں تسلیم نہیں کرتا کہ یہ عارضی طور پر قوانین فطرت کو معطل کر دیتے ھیں۔ یہ ان کو خدا کی ذات سے وابستہ کرتا ھے، جس کو کہ ہم اپنے تجرباتی مراتب وجود میں دیکھتے ھیں، یعنی علیت کا یہ حق جس کی رو سے جب ضرورت سمجھی جائے اپنی تمام ماتحت عملداریوں پر اثر انداز ھوسکے۔ اگر اسنے انسان کو ایک محدود اختیار عطا کیا ھے جس کے ذریعہ وہ اپنے مقاصد کے مطابق کام کر سکتا ھے، تو وہ جو غیر محدود اختیار رکھتا ھو مختلف اقسام کی علیتوں کے ذریعہ، جو کہ خود اس کی مشیت کی تخلیق ھیں، کسی طرح پابند نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی مخلوق اپنے خالق کو مطلقاً محدود نہیں کرسکتی۔ کب اور کس طرح فطرت کے کاموں میں تبدیلی ھوتی ھے، اس معاملہ کو سمجھنا تجربہ اور صحیح مشاھدہ سے ھو سکتا ھے۔ مگر کوئی چیز خدا کے لئے اصلاً ناممکن نہیں جو تمام مخلوقات کی زندگی میں علی التواتر جس طرح اور جس وقت چاھے اپنی مشیت کے مطابق عمل کرتا ھے۔

قرآن کی رو سے کل کائنات ایک عقل و نظم کی عملداری ھے۔ لیکن عقل و نظم علٰحدہ علٰحدہ مختلف سطحات وجود پر کار فرما ھیں۔ خدا کے پاس ھر چیز کے غیر محدود خزانے ھیں لیکن وہ ھر چیز کو ایک اندازے سے ظاھر کرتا ھے۔ ھیولے اور بخت و اتفاق کو اس کی خلقت میں کوئی مقام نہیں۔ اگر انسان کو حقیقی بصیرت عطا کی گئی ھے، تو وہ کائنات میں کوئی خامی نہ پائیگا۔ اگر وہ کہیں افراتفری مشاھدہ

کرتا ہے، تو اس کو جاننا چاہئے کہ وہ درست طریقہ پر دیکھ نہیں رہا ہے۔ تخلیق ہر قدم پر ایک منظم حکومت ہے۔ سببیت کے طریقے اقلیم بہ اقلیم بدلتے رہتے ہیں، لیکن قانون کی حکومت ہر کہیں ہے، خواہ کتنے ہی مختلف قوانین مختلف سطحات پر کار فرما رہیں۔ خدا علت العلل ہے، سببیت محسوسات میں خدا کا قائم کردہ سلسلہ ہے، جس میں صرف برتر قوانین کے ذریعہ تغیر ہو سکتا ہے۔

عادت اور خرق عادت

نظریۂ علیت کی اس توضیح سے ہم اسلام کی اس انقلابی کارروائی کا اندازہ کر سکتے ہیں جو اس نے مذہبی اعتقاد کی اساس کے تعین کی بابت کی ہے۔ تمام مذاہب میں ایک عامیانہ دماغ کا میلان خاطر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے معتقدات کی بناء زیادہ تر فوق الفطرت امور پر رکھتا ہے۔ وہ خدا کو فطرت کے عادی اور طبعی امور میں نہ پا سکا۔ ایک پیغمبر یا ولی کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس نے اپنی صداقت و حقانیت فطری ترتیب کے نظام کو توڑ کر اور عارضی طور پر قانون علیت کو منسوخ کر کے ثابت کی ہے۔ ایک جاہل آدمی کے لئے یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ وہی خدا رسیدہ انسان ہے جو خدا کو کامیاب طریقہ پر ساحرانہ اعمال کی ترغیب دے سکے۔ اور یہ فرض کر لیا گیا کہ جو مامور من اللہ ہوتا ہے وہ نہ معمولی طور پر پیدا ہوتا ہے، نہ معمولی طور پر زندگی گذارتا ہے، اور نہ معمولی طور پر مرتا ہے۔ فلاسفہ نے کائنات کے عقلی نظام کے تصور کو ترقی دی تھی، لیکن مذہبی ذہنیت مخالف

راستہ پر گامزن ہوئی - یہ خدا کی مطلق العنانی اور دخل اندازی کا ایک خام تصور تھا، جس نے عام ذہن کو خدا کی ہستی اور انبیاء کی صداقت کے لئے ایک ثبوت کے طور لبھا لیا - تمام دنیا میں عامیانہ تصور یہی ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی اساس معجزات کو قرار دیتے ہیں - قرآن بارہا اس کا اعادہ کرتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس کا لوگ پیغمبروں سے مطالبہ کیا کرتے تھے - وہ کہتے تھے کہ ہم اس نازل شدہ کتاب کی صداقت پر اس وقت تک ایمان نہ لائینگے جب تک کہ ہم فرشتوں کو کتاب لے کر آسمان سے اترتا نہ دیکھ لیں - وہ ایسی نشانیاں چاہتے تھے جو ان کو حیران اور عاجز کردیں - جب کبھی انہوں نے فوق الفطرت نشانیاں چاہیں تو قرآن نے ان کی توجہ مظاہر فطرت کی طرف منعطف کرائی - قرآن کہتا ہے کہ تم غیر معمولی نشانیوں کے طالب ہو - اگر تم کو ایسی نشانیاں دکھلائی بھی جائیں تو وہ تم میں اس قسم کا ایمان پیدا نہ کرسکیں گی جن سے حقیقتاً تم ہدایت یاب ہو سکو - جو فطرت کی معمولی کارگذاریوں میں خدا کو نہ دیکھ سکے تو وہ کبھی خلاف معمول افعال میں اس کو نہیں دیکھ سکتا - اس طرح اسلام یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جو اس دنیا میں روحانی طور پر اندھے ہوتے ہیں وہ آخرت میں بھی اندھے رہینگے* - کسی بڑے مذہب کی آسمانی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں مشاہدات فطرت اور اس کے اعتدال پسندانہ کاموں کو اس شدت اور کثرت کے ساتھ خدا کی ہستی کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہو - تمام کائنات ایک عظیم معجزہ کی صورت میں پیش کی گئی ہے - ''خدا کی نشانیاں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور خود

* فمن کان فی ہذہ اعمی فھو فی الاخرۃ اعمی - اسرائیل - ۷۲

تمہارے نفوس میں بھی ''۔ جن کو حشر کے متعلق شک وشبہ ہے انکو قرآن زمین کے مردہ ہونے کے بعد جی اٹھنے کے کرشمہ پر متوجہ کرتا ہے ۔'' وھوالذی بشرا بین یدی رحمته حتیٰ اذا اقلت سحاباً ثقالاً سقنه لبلد میت فانزلنابه الماء فاخرجنابه من کل الثمرات ؕ کذالك نخرج الموتی لعلکم تذکرون'' (سورہ اعراف۔۷ ۵) (اور یہ اس کی کار فرمائی ہے کہ باران رحمت سے پہلے ہوائیں بھیجتا ہے کہ مینہ برسنے کی خوشخبری پہنچا دیں ۔ پھر جب وہ بوجھل بادل لے اڑتی ہیں تو انہیں کسی مردہ زمین کی بستی کی طرف کھینچ لے جاتا ہے ۔ پھر ان سے پانی برساتا ہے اور زمین میں ہر طرح کے پھل پیدا کر دیتا ہے ۔ اسی طرح ہم مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں تا کہ تم قدرت الٰہی کی کرشمہ سنجیوں پر غورو فکر کرو)۔ وجود موت وحیات کا ایک خوشگوار تناسب اور دو حالتوں کا تبادل ہے جو بالقوہ ایک دوسرے میں سمائے ہوئے ہیں ۔ اسلام انسان کے دل سے موت کا خوف دور کرنا چاہتا ہے اور مظاہر فطرت کو پیش کر کے یہ بتلاتا ہے کہ موت فنا کی آخری صورت نہیں ۔'' فالق الحب والنویٰ یخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی ؕ ذالکم اللہ فانیٰ تؤفکون''۔(انعام ۔ ۹۵) ۔ (دیکھو یہ اللہ ھی کی کار فرمائی ہے کہ وہ بیج کے دانہ اور گٹھلی کو شق کر دیتا ہے ۔ وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا اور وھی مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے ۔ وھی پروردگار حکیم خدا ہے ، پھر تم کدھر کو بھکے چلے جا رہے ہو!)

قرآن فطرت کا حکمیاتی اور فلسفیانہ تصور ایک منظم معتدل کل کی صورت میں پیش کرتا ہے اور اس کو وجود ، ماھیت وجود اور کائنات میں انسان کے مقام کے لئے ایک محوری نقطہ بحث بنانا چاھتا ہے ۔ یہ انسانیت کو مافوقیت سے جدا کرکے فطریت کی طرف لانا چاھتا ہے تا کہ

حیات اور خدا شناسی کی راہ پر لے آئے۔ جب وہ مادی کائنات کی طرف اشارہ کرتا ہے تو وہ اکثر عالم فلکی کے نظم و ضبط کی طرف رجوع کرتا ہے۔ نباتات کے نمو کی عجوبہ زائیوں کا بارہا حوالہ دیتا ہے، حیات کی ماہیت اور اس کی ایک حالت سے گذر کر دوسری حالت میں محفوظ رہنے کو کھلی نشانی کے طور پر پیش کرتا ہے۔ دنیائے نباتات اپنی خاص بقا سے شاد کام ہے۔ حیوانات کی بقا بھی اسی کے مشابہہ ہوسکتی ہے۔ فطرت جو عضویاتی زندگی کی حفاظت و احیاء کرتی ہے، وہ انسان کو محض فنا ہونے کے لئے نہیں چھوڑ دیگی۔ حیات نفس کے مقام پر پہنچ کر، جہاں انا اور خودی جنم لیتی ہے، یہ اعتبار کیا جاسکتا ہے کہ یہ ان ذوات کی بحیثیت انفرادی خودی کے حفاظت کریگی۔ نگہداشت کے قوانین مختلف مراتب وجود میں مختلف ہوسکتے ہیں۔ عالم نباتات یا حیوانات میں صرف اجتماعی بقا یا بقائے انواع ہوسکتی ہے، کیونکہ شخصیت کا ظہور ابھی پردۂ خفا میں تھا۔ فرد کی خودی یا انا کے ظہور کے ساتھ خدا بحیثیت قوت حیات شخصیتوں کو بنا سکتا ہے، جیسے کہ شخصیتیں اجسام کے فنا کے بعد جن سے وہ وابستہ ہوتی ہیں، باقی رہتی ہیں۔ قوت تخلیق، تحفظ و بقا کا سر و سامان کرتی ہے، مگر اس نگہداشت کا ڈھنگ مختلف مراتب وجود میں مختلف رہتا ہے، کیونکہ قانون علیت مختلف مراتب وجود میں مختلف ہوتا ہے۔ قرآن کا سادہ اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ خالق جس نے تمہیں ایک مرتبہ عدم سے وجود بخشا اس پر قادر ہے کہ وہ دوسری صورت میں تمہاری ہستی کو جاری رکھے۔ کیونکہ تمہاری پہلی تخلیق نے اس کو تھکا نہیں ڈالا۔

فوق‌الفطرت کی تعلیم بطور اساس ایمان ہم قرآن میں

کہیں نہیں پاتے۔ انسان معجزات کے مطالبہ کو ترک کر دے
اور فطرت و عقل کے ذریعہ خدا کی طرف بڑھے۔ حشرات سے
لے کر ستاروں تک اس کو فکر و نظر کی دعوت دی گئی
ھے تاکہ وہ فطرت کے طریق عمل کو دیکھے اور ان میں معقولیت
اور افادیت پر غور کرے۔ اس کو چاھئے کہ حیات کی
عجوبہ زا مطابقت پذیری اور ھر جگہ فطرت کی کار فرمائیوں
کے سبب عقلی کا مطالعہ کرے۔ قرآن کہتا ھے کہ صرف
اونٹ کی ترکیب اور اس کی اپنے ماحول کے ساتھ حیرت
انگیز مطابقت پذیری کا مطالعہ خدا کے ھمہ خیر اور اعتدال
پسند ھونے کے عقیدہ کی طرف رھنمائی کریگا۔ یہ مذھبی اعتقاد
کے نشو و ارتقاء میں یقیناً ایک زبردست قدم تھا۔ یہاں
آ کر انسانیت اپنی طفولیت سے نکل کر شباب پر پہنچتی ھے۔
ٹالسٹائے اپنی مذھبی بیداری کے بعد لکھتا ھے کہ "عام عیسائی
اعتقاد اپنے مذھبی یقینات کی بنیاد حضرت عیسیٰؑ کی
معصوم ولادت پر رکھتا ھے۔ لیکن میرے لئے ھر بچہ جو
معمولاً اپنے والدین کی وساطت سے پیدا ھوتا ھے خدا پر ایمان
لانے کا کافی اور وافی معجزہ ھے۔" یہ بعینہ اسلامی انداز فکر ھے۔

فطرت، جیسا کہ ھم مشاھدہ کرتے ھیں، صرف ایک جزو
ھے وجود کی مجموعیت کا۔ لیکن اسلام غیبیات کی طرف اشارہ
کرتے ھوئے یہ عقیدہ رکھتا ھے کہ ھم جائز طور پر اس سے
درست نتائج اخذ کر سکتے ھیں۔ استقرائی استدلال جزئیات سے
عموم کی طرف بڑھتا ھے اور استخراجی استدلال اپنے نتائج
بدیہی مقدمات سے نکالتا ھے۔ قرآن استقرائی اور استخراجی ھر دو
استدلال استعمال کرتا ھے۔ ان کے لئے، جو خدا کو بدیہی الثبوت
مانتے ھیں، یہ فطرت و انسان اور دنیا و آخرت کی بابت

نتائج استخراج کرتا ہے ۔ ان کے لئے جن کا یہ ایمان نہیں ہوتا ، مظاہر فطرت کے تفصیلی مطالعہ کے لئے استقرائی طریقہ استعمال کرتا ہے ، اور ان سے عام نتائج خالق کی کنہہ و حقیقت اور ہستی کی بابت اخذ کرتا ہے ۔ کوئی خدا سے کائنات کی طرف یا کائنات سے خدا کی طرف قدم بڑھا سکتا ہے ۔ ہم چڑھیں یا اتریں، یہ بہرصورت ایک ہی راہ ہے ۔ یہ قرآنی الفاظ کی تشریح ہے : خدا ہی اول اور خدا ہی آخر ہے ، وہی ظاہر بھی ہے اور وہی باطن بھی ۔ ہم خدا سے بحیثیت خالق اور مبداء فیاض کے آغاز کر سکتے اور اس کی مخلوقات میں بھی معقولیت اور خیر کی دریافت کے لئے بڑھ سکتے ہیں ۔ خدا ہی بحیثیت علت اولیٰ کے ہر چیز کا آخری جواب ہوگا ۔ ” تیرے آقا کی طرف ہر چیز رجوع کریگی ، وہی سب کا مرجع ہے “ ۔ چنانچہ اگر بطریق دیگر ہم مخلوقات سے مطالعہ کا آغاز کریں تو خدا کی قدرت اور ہمہ خیریت کو ان میں بھی جاری و ساری پائیں گے ۔

اسلام پہلا مذہب ہے جو کائنات پر اس قدر زور دیتا ہے تاکہ معقول پسند انسانیت پہلے یہاں اس کی تلاش شروع کرے ۔ خارجی عالم طبعی کے علاوہ یہ انسان کی توجہ خود اس کی فطرت کی طرف مبذول کرتا ہے : ” و فی انفسکم افلا تبصرون ۔ “ (اور خود تمہارے نفوس کے اندر بھی ، کیا تم نہیں دیکھتے؟) فطرت داخلی اور فطرت خارجی ہر دو کے مطالعہ کی سخت تاکید کر کے وہ اپنی تعلیمات کا خلاصہ ایک جگہ اس وثوق کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ اسلام فطرت کے مماثل ہے ۔ ” فاقم وجهك للدين حنيفا ؕ فطرت الله التی فطر الناس عليها ؕ لا تبديل لخلق الله ؕ ذالک الدين القيم ۙ ولكن اكثر الناس لا يعلمون ۔ “

(دین کی راہ میں ہر طرف سے منہ پھیر کر صرف ایک خدا ہی کی طرف رخ کر لو، یہی فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ فطرت الٰہی کے لئے کبھی تبدیلی نہیں، یہی دین کا سیدھا راستہ ہے۔ لیکن اکثر انسان ایسے ہیں جو نہیں جانتے)۔ سننِ الٰہی کو سمجھنے کے لئے نہ صرف مطالعہ فطرت کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ فطرت حق ہے اور سچا مذہب بھی اس کے مطابق ہوگا۔ بعض لوگ سائنس اور مذہب کی باھمی آویزش کا ذکر کرتے ہیں۔ سائنس دراصل مطالعہ فطرت کو پیش کرتا ہے اور مذہب فوق الفطرت حقائق سے بحث کرتا ہے۔ اسلام اس پیکار کا تصفیہ خود کو فطرت کے مماثل بتلا کر کر دیتا ہے۔ وہ مذہب جو فطرت کے قریبی مطالعہ کا حکم دیتا ہو، تاکہ اس کی علت غائی دریافت کی جائے، کیونکر سائنس سے دست وگریبان ہو سکتا ہے؟ یہاں عقل، فطرت اور مشیت الٰہی میں کامل توافق ہے اور سچے مذہب کی یہی تعریف ہے کہ وہ اس کو اتحاد و توافق پر ایمان لانے کی تلقین کرے۔ اگر مذہب مائل بہ گمراہی ہو اور سائنس تعصب و تنگ نظری کو اپنا پیشہ قرار دے تو ایسی صورت میں وہ قدرتاً بر سر پیکار رہینگے۔ لیکن جب سائنس کے معنی کائنات کے اتحاد و یک رنگی کی دریافت کے ہیں اور مذہب کے معنی بھی کثرت میں وحدت کو پانے کے ہیں، تو یہ دونوں ایک دوسرے کے تکملہ اور معاون کی حیثیت سے ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔

اسلام کا یہی نظریہ تھا جس نے ان مسلمانوں کو، جو زندگی کے معنوں کی تحقیق و دریافت میں سرگرم تھے، عالم طبعی کا زبردست محقق اور تمام فلسفوں کا قدر شناس بنا دیا تھا۔

باب چہارم

اسلامی خدا پرستی

عالم غیب

ایمان بالغیب اسلام کی مسلمه اساس هے - اس لئے قرآن کی پہلی هی سطر اس کو شرط اولین قرار دیتی اور هدایت ربانی کے لئے ناگزیر بتلاتی هے - قرآن اس کی توثیق کرتا هے که کوئی راه حق و صداقت پر جاده پیما نہیں هو سکتا جب تک که وه اس شرط کو تسلیم نه کر لے - یه سوال فوراً قلب و دماغ میں ایک خلش پیدا کرتا هے که کسی ایسے اصول موضوعه کو تسلیم کرنے کے لئے کیوں کہا جاتا هے جس کا کوئی ثبوت نه هو - جس کسی نے منطق یا کسی علم کا مطالعه کیا هے، اسکو مذهب سے ایسی توقع نہیں رکھنی چاهئے جو وه جائز طور پر سائنس اور ریاضیات سے بالعموم نہیں رکھتا - هر علم کے مطالعه کی بنیاد چند عقیدوں پر هوتی هے جن کی بناء غیر مرئیات هوتی هیں - قانون کی سببیت اور فطرت کی یک رنگی کل سائنس کا بنیادی اصول هے - ایک سائنسداں اس عقیده سے آغاز کرتا هے که ایک کائنات هے جو اپنے هر پہلو اور جزئیات میں قانون کی تابع هے - لیکن جو کائنات مشاهده اور تجربه میں هے وه موجودات کی مجموعیت کا ایک نہایت حقیر جزو هے - کس طرح ایک سائنسدان لا محدود کل کا دعویٰ کر سکتا هے جبکه وه ایک نہایت محدود حصه کا علم و تجربه رکھتا هے - هر سائنسداں یه اقرار کریگا که محسوسات سے زیاده غیر محسوسات کا عالم بے پایاں و عظیم هے -

سائنس کے لئے غیر مرئی کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) غیر تجربہ شدہ عالم مدرکات کی وسعت۔ (۲) عالمیت کی یک رنگی اور عالم گیریت کا مفروضہ، جو بحیثیت اصول موضوعہ یقین و ایمان کا معاملہ ہے۔ افلاطون اس نظریہ کا زبردست حامی تھا۔ دنیائے مدرکات غیر محسوسات پر مبنی ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ طبعی وجود کا انحصار اعداد پر ہے، لیکن اعداد اور ہندسی نسبتاً غیر محسوسات پر مبنی ہیں۔ کسی نے بھی مثالی و معیاری نقطہ اور مثالی و معیاری دائرہ نہیں دیکھا۔ لیکن تمام واقعی نقاط، دوائر و خطوط، جو عالم موجودات میں کھینچے جاتے ہیں' وہ ایک ناقص نقل اپنے مثالی نمونوں کی ہوتے ہیں۔ وہ اپنا یہی نظریہ ان تمام عمومی اور مجرد تصورات کی بابت رکھتا ہے جو عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن تمام قابل ادراک حقیقتیں اس میں شامل ہیں۔ کسی نے بھی کبھی حسن مطلق، حق مطلق، اور عدل مطلق کو نہیں دیکھا، مگر وہ ان سب کے غیر مرئی اساسات قائم کرتا ہے۔ یہاں ہم تصوریت اور عقلیت کے زبردست رہنما سے دو چار ہوتے ہیں جو ایمان بالغیب کو تمام عقلی ادراک اور احساس شعور کی اساس کے طور پر پیش کرتا ہے۔

یہ ایک عام دستور ہو گیا ہے کہ مذہب کا موازنہ ایک طرف فلسفہ سے کیا جاتا ہے اور دوسری طرف سائنس سے اور نہایت سطحی طور پر یہ ادعا کیا جاتا ہے کہ مذہب ہمیں ایمان بالغیب پر مجبور کرتا ہے۔ حالانکہ سائنس صرف قابل ادراک اور قابل اثبات حقائق سے بحث کرتی ہے اور فلسفہ صرف منطقی مشاہدہ پذیر استدلال یا نظری افکار سے بحث کرتا ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح ان تینوں کی تعمیر ایمان بالغیب کی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ عقل خود وجود کی اعتدال پسندی پر

استوار ہے ، جو ایک طرح کا ایمان بالغیب ہے ، کیونکہ وجود کی مجموعی معقولیت ایک ایسی صورت حال ہے جو کبھی قابل فہم یا مشاہدہ پذیر نہیں ہو سکتی ۔

تمام فلسفہ کا آغاز و انجام حیرت پر ہوتا ہے ، یہی حالت سائنس کی ہے اور یہی حال مذہب کا بھی ہے ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب کے سلسلۂ نسب میں بجائے حیرت کے خوف کا عنصر پایا جاتا ہے ۔ ہم امید کو ایسے ہی مذہب کا تیسرا مورث قرار دے سکتے ہیں ۔ ارتقائے انسانی کے ابتدائی درجوں میں خوف و رجاء اور حیرت یا پر اسراریت کا شعور اور غیب کی بابت تصورات مبہم اور توہم پرستانہ تھے ۔ علم اور مذہب کی ترقی کے ساتھ ان میں زیادہ سے زیادہ بلندی اور زیادہ سے زیادہ گہرائی آتی گئی اور رفتہ رفتہ ان کی تطہیر ہوئی ۔ فلسفہ ہائے توالد و تناسل کا یہ باطل تصور ہے کہ کسی مظہر کے اصلی اجزاء کا سراغ اس کے اولین مصدر سے لگایا جائے ۔ ریاضیات اور سائنس کی ابتداء بھی بے ڈھنگی تھی ۔ آزمائش اور فروگذاشت کے طریقوں سے گذر کر انہوں نے بتدریج ترقی کی ، یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچے کہ وہ فوق الذات اور واقعیت پسند ہونے کا دعویٰ کر سکیں ۔ سائنس کے توہم پرستانہ اور بے ڈھنگے آغاز کے سبب اس کی معروضیت کے متعلق کوئی شک نہیں کرتا ۔ علم ہیئت کی نشو و نماء علم نجوم سے ہوئی ، اور علم کیمیا ، الکیمیا سے صورت پذیر ہؤا ۔ اگر کوئی یہ اصرار کرے کہ اصل مذہب بھی ، جس کے متعلق بیکن کا یہ خیال ہے کہ ایک مضبوط چٹان پر اسکی تعمیر ہو نہ کہ زمانہ کی موجوں پر اسکو اچھالا جائے ، چونکہ عجائب پرستی اور قبائلی خداؤں کی رضا جوئی سے نمودار ہؤا ہے اسلئے اسکی صداقت اور مقصد پسندی

کو بھی کیوں نہ کم تر تصور کیا جائے ؟ مذہب کے غیبیات بھی مبہم تصورات اور جذباتی روایتوں سے ہمیشہ اسی طرح آلودہ رہے جیسے کہ علوم و فنون کے غیر مرئیات رد کردہ نظریات سے پراگندہ ہوتے رہے - سائنس غیر مرئی کو معقولی یا مرئی شکل میں لانے کی سعی میں ایک غلطی سے دوسری غلطی کی طرف گامزن رہی ہے ، مگر بایں ہمہ اپنی واقعیت پسندی کے عقیدہ میں متزلزل نہیں ہوئی - مذہب بھی رفتہ رفتہ اپنے غیبیات کو پاکیزہ ، استدلالی اور برتر و اعلیٰ بناتا گیا - خیال یا قیاس کی خطا کاریوں نے غیبیات کی معروضیت کے عقیدہ کو متزلزل ہونے نہ دیا - اگر سائنس غیر مرئی پر ایمان لانا ترک کر دے تو از پا افتادہ ہو جائے - اسی طرح بلا اس کے کسی مذہب کا وجود ممکن نہیں - سائنس اور مذہب میں غیر مرئی پر اعتقاد کے طریقہ ہائے عمل ہمیشہ موافق نہیں ہوتے - مذہب بطور اسوۂ حیات اس کی جانب ایک شخصی طرز کا متقاضی ہے اور سائنس اس سے مدرک بالحواس وجود کو سمجھنے کے لئے ایک کار آمد مفروضہ چاہتا ہے -

یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ سائنس نے ایک ایسے مقام کا انکشاف کیا ہے کہ جس میں اس کا انداز غیر مرئیات کی طرف اب توہمات سے بالکل آزاد ہے - ایسا ہی دعویٰ مذہب کی طرف سے قرآن پاک نے پیش کیا ہے - یہ خدا پرستی سے قبل ان کے تمام تصورات کی تردید کرتا ہے جو بے ہودہ خواہشات ، باطل خیالات اور غیر یقینی قیاسات پر مبنی تھے - عالم روحانی کے تصور کی لطافت کسی برتر ہستی کے خیال کی رفعت کے عین مماثل ہے جو سر چشمہ ہے تمام قوت ، محبت اور علم کا -

تحقیق حق میں سائنس اور مذہب کے بہت سے اساسی

تصورات مماثل ہوسکتے ہیں - یہ کہا جاتا ہے کہ سائنس کے حقائق کا اندازہ عملی طور پر کیا جائے ، اور اس کے فوائد کا تخمینہ انسانی فلاح و بہبود کے الفاظ میں ہونا چاہیئے - اسلام کی پیش کردہ خدا پرستی کو عملاً جانچا جا چکا ہے ، اور یہ پایا گیا کہ یہ حیات و علم کی ممد و معاون ہے - سائنس کا ترقی یافتہ غیب وحدت وجود پر مبنی ہے ، جس کی رو سے جملہ وجود کا سر چشمہ ایک اساس وحدت ہے - یہ کہا جاتا ہے کہ سائنس نے نوع انسانی کو خیالی خداؤں اور ارواح خبیثہ کے متوہمانہ خوف سے آزادی بخشی - اسی طرح ایک طاقتور ، عقلی اور مہربان خدا کے عقیدہ نے تمام بے اصل تخویفات سے مخلصی عطا کی - اپیقورس خداؤں پر اعتقاد کو کالعدم کر کے انسان کو خوف سے آزادی دلانا چاہتا تھا لیکن اس مقصد میں لذتیت اور مادیت سے کہیں زیادہ خدا پرستی نے کامرانی حاصل کی -

روح کی ترقی مرئی سے غیر مرئی کی طرف ، خارجیت سے داخلیت کی طرف اور ظاہر سے حقیقت کی طرف ہوتی ہے - انسان کا فہم و ادراک اس کے جسم اور عالم طبعی کی خارجی شناخت سے شروع ہوتا ہے - ہزاروں سال تک یہ فطرت کی قوتوں کو الوہیت کا درجہ دیتا رہا ، یا یہ کہنا ایک ہی بات ہوگی کہ وہ ان کو پیرایۂ بشریت سے آراستہ کرتا رہا - مذہب تشبیہ و تجسیم اس کا ناگزیر لزوم تھا - عالم آفاق میں اس نے خود اپنے جذبات اور امنگ کے نمونے پائے - اگرچہ کہ فطرت کی طاقتیں اس کو خود سے زیادہ طاقتور معلوم ہوئیں - جب اس نے فطرت کی بسیط قوتوں کو سمجھنے کی کوشش کی تو اس نے خود اپنے حیاتی وجود کو ان میں منعکس دیکھا - ان سے قیام ربط کا واحد طریقہ ان کو خوش کرنا تھا - ایک عرصہ تک اس کے خدا خود اس کی خواہشات کے تمثال و پیکر تھے -

پھر ایک ایسا مقام آیا کہ فطرت کی طاقتوں کو الوھیت کا درجہ دینے کے علاوہ اس نے اپنے مشاہیر کو، یعنی ایسے انسانوں کو جنہیں غیر معمولی قوتوں سے سرفراز کیا گیا تھا، درجہ الوھیت دینا شروع کیا - یہ یقین کیا جاتا تھا کہ ایسے انسان زبردست طبعی اور روحانی قوتوں کے حامل ہوتے ھیں - زبردست حکمران اور عظیم فاتحین معبود بنائے گئے - جب مقتدر اعلیٰ اور خالق کائنات کے تصور نے جنم لیا تو چند قوموں نے اپنے عظیم روحانی مشاہیر کو اس کے مماثل قرار دیا - یہ تجسیم کی منزل تھی - یہ یقین کیا جاتا تھا کہ سر چشمۂ موجودات کی ھستیٔ عظیم کاملاً ایسے اشخاص میں حلول کر جاتی ھے اوران کی تعظیم و پرستش مثل ظاھری خدا کے کی جاتی تھی - انسان اس وقت تک اَن دیکھے خدا کے تصور کی اھلیت نہ رکھتا تھا اس لئے ایک خدا کے تصور پر پہنچنے کے بعد بھی انسان کی اس سے تشفی نہ ہو سکتی تھی تاوقتیکہ وہ اس کو محسوس شکل میں نہ دیکھ لے - بدھا، کرشنا، راما، اور حضرت عیسیٰ[4] بھی قادر مطلق تصور کئے گئے اور یہ سمجھا گیا کہ خدا نے خود مائل بہ کرم ہو کر انسانیت کے فائدہ کی خاطر یہ روپ دھارن کیا ھے - ان کی ھم آھنگی، حقیقت الحقائق کے ساتھ ایسی مکمل سمجھی گئی اور یہ یقین کیا گیا کہ یہ کامل مماثلت ھے - لہذا یہ تمام خدائی صفات کے حامل سمجھے گئے - بجائے اسکے کہ ان کو انسانیت کا نمونۂ کمال اور اخلاقی و روحانی مثال یا صداقت کا معلم تصور کیا جاتا، یہ سمجھایا گیا کہ یہ غیر محدود ذات مطلق تھے جنہوں نے عارضی طور پر محدودیت کا لبادہ زیب تن کر لیا ھے - بھگوت گیتا میں کرشنا سے یہ بیان منسوب کیا گیا ھے کہ

جب کبھی مذہب بگڑ جاتا ہے تو میں انسان کی صورت میں
جلوہ گر ہوتا ہوں اور دنیا میں نزول کرکے دیرینہ لطافت
و صداقت کو پھر واپس لے آتا ہوں۔

جب افق تاریخ پر اسلام جلوہ فرما ہؤا تو دنیا کی بیشتر
مہذب قومیں کثرت پرستی اور اوتار پرستی کی گرفت میں پائی
گئیں۔ اسلام نے انسانیت کی جو زبردست خدمت انجام دی ہے
وہ خدا کے تصور کی رفعت و لطافت ہے۔ اسلام نے اس
امر کی جہد و سعی کی کہ انسانیت کو ایک طرف باطل
خداؤں کی کثرت سے نجات دلائے اور دوسری طرف اوتار پرستی
سے آزاد کرے تاکہ انسان اَن دیکھے خدا کی طرف رجوع
کرے۔ "لا تدرکہ الابصار وھویدرک الابصار ۱ "۔ (وہ تمہیں
دیکھتا ہے لیکن آنکھیں اس کی دید سے قاصر ہیں)۔ وہ خالق
ہے، وہ اپنی مخلوقات پر محیط ہے۔ لیکن ساتھ ہی اپنی مخلوقات
سے منزہ اور وراء الوریٰ بھی ہے۔ اپنے خالق کے ساتھ تمام
مخلوقات کا اساسی تعلق اختیاری اور غیر اختیاری اطاعت ہے۔
نوع انسانی کی برتر اور برگزیدہ ہستیاں بھی اس کی آفریدہ ہیں۔
مخلوقات کی یگانگت اپنے خالق کے ساتھ کاملاً خود سپردگی سے
حاصل کی جاسکتی ہے اور یہی اسلام کے لغوی معنی ہیں۔ یہ خود
سپردگی تمام کائنات میں پائی جاتی ہے۔ قرآن کی رو سے آسمان و
زمین اور جو کچھ ان میں ہے، وہ سب مسلّم ہیں۔ زمین کی پہنائی،
درختوں کی بالیدگی، دریاؤں کی روانی، پرندوں کی نغمہ سنجی
اور حقیر حشرات کی حرکت، سب خالق کائنات کی تسبیح و
تقدیس میں مصروف ہیں۔ یہ تسبیح و تقدیس ایسی زبان میں
ہے جس کو انسان سمجھ نہیں سکتا۔ اپنی فطرت کے مطابق

۱۔ انعام۔ ۱۰۳۔

زندگی گذارنا ، جس سے کہ وہ سرفراز کئے گئے ہیں ، یہی گویا ان کی پرستارانہ تفویض اور خاموش عبادت گذاری ہے - تمام خلقت میں خدا کا ظہور ہے لیکن خدا جسم سے منزہ ہے - ''لیس کمثلہ شیء'' (اس کے مثل کوئی چیز نہیں)- تمام تشبیہات جن کا اس پر اطلاق کیا جاتا ہے ، ناقص ہیں - کوئی اس کی کنہ و حقیقت کا بالکلیہ ادراک نہیں کر سکتا - وہ رگ جان سے قریب تر اور ساتھ ہی وراء الوریٰ بھی ہے - کون و مکان بلا سلب قوت کے اس کی مشیت کو اپنے اندر سمولے سکتے ہیں - '' اللہ نورالسموات و الارض ''- (اللہ آسمان و زمین کا نور ہے)- لیکن تمام نور جو ناقص آلۂ بصارت پر ظاہر کیا گیا ہے وہ اس کے نور کے مقابلہ میں محض ظل کی حیثیت رکھتا ہے - اس کا نور خود فروزاں اور لا مکانی ہے- وہی مشرق ہے اور وہی مغرب - لیکن اس کا نور نہ شرقی ہے اور نہ غربی - ہر چیز خدائے برتر سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کی طرف رجوع ہوتی ہے - وہ قدرت ، علم اور عشق کا سرچشمہ ہے - وہ اپنی قدرت سے تمام کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے ، اس کی رحمت کل اشیاء کو آغوش میں لئے ہوئے ہے اور اس کی جنت زمین و آسمان کی پہنائیوں کے برابر ہے* - وہ اپنی ذات کا اظہار فطری اور اخلاقی نظام، حسن ، ضمیر و ایمان اور عشق سے کرتا ہے - اسلام کسی قسم کے بھی مادی ذرائع سے اس کی تمثال تراشیوں کی ممانعت کرتا ہے - اگرچہ انسان مرموز پیکروں کی تراش پر مجبور ہے اور اس کے تمام ذہنی تمثالات کو علامتی سمجھنا چاہیے - وہ سمیع و بصیر ہے ، لیکن اس سمع و بصر کی کنہ و حقیقت ناقابل ادراک ہے - وہ ہمہ داں ، ہمہ تواں ، ہمہ خیر ہونے کا نمونۂ کمال ہے ، لیکن عین و معیار کبھی کاملاً صورت

---

* وسعت رحمتی کل شئی ...... جنة عرضها السموات و الارض

پذیر نہیں ہو سکتا ۔ اس کی اسی مثالی مفہوم میں ایک عظیم غیب کی حیثیت سے پرستش ہونی چاہیے ۔ اگرچہ وہ سر چشمہ تمام عالم شہود کا ہے، وہ تمام محسوسات سے منزہ ہے، وہ زبردست ریاضی داں ہے ۔ ہر چیز جو اس سے ظہور پذیر ہوتی ہے، انداز کے مطابق اور معدود ہے، لیکن اس کو اعداد کے مماثل نہ ٹھرانا چاہیے جیسا کہ فیثا غورس نے ٹھرایا تھا ۔ اسلام کی رو سے اس کا برتر ظہور اس کے مخلص اور برگزیدہ بندوں کی روحوں میں ہے جو پر شوق اور والہانہ انداز میں اپنی عبادت کا نذرانہ اس کے حضور پیش کرتی ہیں اور وہ اس کے انبیاء ہیں، جن کو اس نے ہر قوم میں مبعوث کیا ہے ۔ وہ تمام کے تمام اور ان میں سے برترین اشخاص بھی ماباقی دنیائے انسانیت سے مقابلہ کرتے وقت صرف اضافی طور پر کامل ہیں ۔ لیکن خدا کے مقابلہ میں ان کی کاملیت ناقص اور ان کی خوبی ظل کی حیثیت رکھتی ہے، جیسا کہ ہم انجیل میں پاتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ کو کسی نے لفظ شفیق سے مخاطب کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نہیں، میرا باپ جو آسمان میں ہے وہ شفیق و مہربان ہے ۔ یہی چیز ہے جس کا اسلام تمام پیغمبروں کی بابت دعویٰ کرتا ہے ۔ ان میں سے کوئی بھی بطور اپنے حق کے الوہیت کا دعویدار نہیں ہؤا ۔ تمام تجربہ شدہ خوبی ناقص ہے اور اس سبب سے کاملاً خدا کی ہم شبیہ نہیں ۔

ایسے اَن دیکھے خدا پر ایمان اسلام کی بنیادی شرط ہے ۔ اسلام انسان کو واقعی سے مثالی کی طرف لا کر بلند کرنا چاہتا ہے ۔ جو چیز مثالی ہوگی وہ از روئے فطرت ہمیشہ غیر مرئی رہیگی، جو کامل طور پر سمجھ میں آجائے وہ خدا نہیں ہو سکتا اور جس نصب العین کو کاملاً عملی جامہ پہنایا جائے وہ

نصب العین نہیں ہوسکتا - یہی مفہوم افلاطون کے عالم مثال
کا ہے جو کسی طرح موضوع ادراک نہیں ہو سکتا ، ہاں عقل
کامل کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے اور عقل کامل ہی ہے
جو اپنا پورا پورا ادارک کر سکتی ہے - اسلام کے خدا
کی دریافت منطقی استدلال سے نہیں ہو سکتی - از روئے اسلام
خدا عقلی ہے ، اور ہماری عقل جب بے لوث ہوتی ہے تو اس کی
عقل میں مدغم ہو جاتی ہے - لیکن اس کی عقل ہمارے منطقی
استدلال میں پوری طرح سمائی ہوئی نہیں ہے ، جو مقدمہ سے
نتیجہ کی طرف حرکت کرتی اور جزئیات سے کلیات کی درجہ وار
ترتیب کی طرف صعود کرتی ہے - اس کی عقل کامل طور سے
ہماری عقل کے لئے قابل فہم نہیں ، اور ایسے ہی مافوق ہے جیسے
کہ اس کا سننا اور دیکھنا ہماری سماعت و بصارت سے فائق ہے -
ہمارے تمام معیار و اقدار پر وہ محیط ہے ، لیکن انسانیت اس کی
تنہا ترجمان نہیں ، اور نہ کوئی ایک انسان اس کا واحد تعبیر
کنندہ ہو سکتا ہے - وہ قانون کا سرچشمہ ہے جس کے بموجب
موجودات کا ظہور ہوتا ہے ، لیکن اس کی مشیت خود بالذات
ایک قانون ہے - وہ جو چاہتا ہے ' پیدا کرتا ہے اور اپنی مخلوق
کو جس طرح چاہتا ہے ، ہدایت فرماتا ہے - اس کی مشیت اسلام
کی رو سے مطلق العنان نہیں اور نہ قوانین سے تہی دامن ہی
ہے ، جن کے بموجب وہ اپنی خلقت کو پیدا کرتا اور ہدایت
دیتا ہے -

ایک اَن دیکھے خدا کی ہستی ، جس کو اسلام پیش کرتا
ہے ، اس سے مقصد نوع انسانی کو طبعی پابندیوں اور حیاتیاتی
کائنات سے آزادی بخشتا ہے - خدا کو تمام غیر معیاروں کا
غیر مرئی ماخذ قرار دینا حیات انسانی کو ارتقائی اور متحرک
بناتا ہے - انسان موجودات کا معیار کمال ، اشرف المخلوقات اور

زمین پر خدا کا نائب نہیں ہو سکتا جبتک کہ وہ موجودات کی حلقہ بگوشی سے چھٹکارا نہ پالے ، اور اَن دیکھے نصب العین کی بلندیوں کی طرف عروج نہ کرے ۔ جب تک وہ فطرت کی اصلی یا فرضی طاقتوں سے خوفزدہ اور محکوم رھیگا وہ حیوانات سے بھی نیچے گر جائیگا*۔ شر ک اسلام کے نزدیک بدترین اور ناقابل عفو گناہ ھے ۔ یہ نہ صرف خدا کی توھین ھے بلکہ انسان کو بھی یہ سافل ترین گہرائیوں میں گراتا اور نہایت بری طرح ذلیل و خوار کرتا ھے ۔ قرآن کی رو سے انسان کی خلقت روحانی اور جسمانی اعتبار سے احسن تقویم پر ہوئی ھے† ، لیکن وہ خیالی خداؤں کی پرستش اور خوف سے اسفل السافلین میں گر جاتا ھے ۔ اسلام نہ صرف خدا کے شرف و عظمت کا حامی ھے بلکہ وہ انسانی وقار کو بھی برقرار رکھنا چاھتا ھے ۔ وہ اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ بننے کے لئے مامور ھؤا ھے اور ایسی صلاحیتوں سے سرفراز کیا گیا ھے کہ تمام کائنات اس کی تابع فرمان ھوجائے ۔ مگر اس بالقوہ فرمانروا نے ان ھی طاقتوں کے آگے جھکنا شروع کیا جو اس کی خدمت اور چاکری کے لئے تھیں ۔ اسلام کے عقیدۂ توحید کے دو پہلو ھیں ۔ ایک غیر محدود نصب العین ، ایک قادر مطلق کے تصور کی تنزیہہ ، اور انسان کے شرف و وقار کی بحالی ۔ بعض نا واقف مادہ پرستوں نے یہ دعویٰ کیا ھے کہ مذھب انسان میں غلامانہ ذھنیت پیدا کرتا ھے ۔ اس میں شک نہیں کہ تمام مسخ شدہ مذاھب کسی نہ کسی طرح انسانوں کو غلام بناتے ھیں ، لیکن تمام سچے مذاھب انسان کو آزادی بخشنے کے لئے ھیں ۔ یہ اس کو خارجاً و داخلاً ھر دو طرح پر آزاد کرتے ھیں ۔

* اولٰئک کالانعام بل ھم اضل
† لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم — التین ۔ ۴

یہ اس کو پراگندہ خواھشات اور بے قید شہوات سے رھائی دلاتے، عالم انفس پر حکمران کرتے اور خیالی خداؤں کے حوصلہ شکن خوف سے مخلصی عطا کرتے ھیں۔

جب اسلام کہتا ھے کہ "تو بجز خدا کے کسی دوسرے کی پرستش نہ کر" * تو یہ امتناع انسان کی پرستش انسان تک وسعت پذیر ھوتا ھے۔ کوئی فرد بشر حقیقتاً دوسرے کا حاکم و آقا نہیں ھو سکتا، چہ جائیکہ وہ مثل خدا کے پوجا جائے۔ اس لئے اسلام اپنا زور و قوت جس طرح اصنام پرستی کے خلاف پھیرتا ھے ویسے ھی اوتار پرستی کے خلاف بھی۔ ایک خدا پر ایمان کچھ سود مند نہیں جبکہ وہ ایک خدا کسی انوکھی منطق یا طبعیات سے تین خداؤں میں منقسم ھو جائے یا وہ ایک خدا ایسا عجیب فرزند رکھتا ھو جس کی ھستی و قدامت اس کے مماثل ھو، جو جملہ صفات میں کاملاً اس کا شریک ھو، جو انسانی روپ اختیار کر سکتا ھو اور جو توھین و اذیت اس لئے سہے کہ انسانیت کے جملہ گناہ اپنے دوش پر لے جائے، حالانکہ ھر نفس کے لئے وھی مقدر ھے جو اس نے کمایا۔ کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔† وہ مالک یوم الدین کوئی معاوضہ اور بدلہ قبول نہیں کرتا اور اخلاقی مکافات میں کسی دوسرے کے لئے مصیبت جھیلنے کی قائم مقامی نہ ھوگی۔

تنزل شدہ انسان نے ان ھادیان روحانی کی پرستش شروع کر دی جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کے ادنیٰ بندوں کی حیثیت سے پیش کیا تھا اور اس کا خاتمہ اس عظیم نادیدہ نصب العین کی توھین پر ھؤا۔ غیر محسوس کی پرستش پر محسوس کو ترجیح

*لا تعبدوا الا ایاہ۔ † لھا ما کسبت لا تزر وازرۃ وزر اخری۔

دینے کی پست جبلت نے انسان کو بارہا گمراہ کیا ہے۔
اسلام نے ہمیشہ کے لئے یہ واضح اور غیر مبہم اعلان کیا کہ انسان اپنی روحانی ترقی اور آزادی کی خاطر ، اور اس غرض سے کہ جو حکمرانی اللہ کی طرف سے اسے جملہ کائینات پر حاصل تھی اسے دوبارہ اپنے حق میں بحال کرے ، کسی انسانی ہستی کی پرستش نہ کرے۔ خواہ وہ کسی حیثیت سے کتنا ہی بڑا ہو۔ وہ اپنی عبادت کو صرف غیر مرئی ذات کے لئے مختص کر لے ، اپنے آپ کو اَن دیکھے خدا کے تفویض کر کے کامل امن حاصل کرے۔ اسلام کے معنی کامل امن اور خود سپردگی دونوں کے ہیں۔ اس طرح انسان تمام ڈر اور تمام دکھ سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ اپنے ارادہ کو خدا کی مشیت کے تفویض کر کے وہ تمام خوفوں سے مخلصی پا سکتا ہے ، کیونکہ وہ تمام جو حقیقتاً قابل قدر ہے ، ایک محافظ اعلیٰ ہستی میں محفوظ ہے ، پھر اسکو غم و رنج کیسے پہنچ سکتا ہے؟

اس معیار کی طرف بڑھنا خود اصلاحی میں ابدی ترقی کا ضامن ہے ، کیونکہ ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم صفات خداوندی کو اپنے میں سمولینے کی جد و جہد کریں ، جو غیر محدود ذات ہے اور جس کے ذریعہ انسان تا ابد ترقی جاری رکھ سکتا ہے۔ ایک غیر مرئی ذات جو غیر محدود علم ، قدرت اور محبت کی حامل ہو ۔ وہ روح میں ایک امنگ اور ولولہ بن کر ہمیشہ کارفرما رهیگی ۔ روحانی ترقی ایک قوی محرک کی صورت اختیار کرلیگی لیکن کبھی پوری طرح تکمیل پذیر نہوگی، کیونکہ صرف خدا ہی کی ذات ابداً کامل ہے۔

باب پنجم

صفاتِ الٰہی

اسلام نے خدا کی وحدانیت پر بے انتہا زور دیا ہے۔ خدا صرف ایک ہے۔ دنیا میں بے انتہا اختلاف، تنوع، اور کثرت کا ظہور ہے۔ مخلوقات چند در چند ہیں، مگر سب کا خالق ایک ہے۔ مذہبی اعتقاد سے قطع نظر، از روئے منطق یا بطریق تجربۂ انفس و آفاق کوئی شخص روح کائنات کی وحدت پر پہنچ سکتا ہے۔ یہ سائنس کا دعویٰ ہے کہ ہم موجودات کی وحدت میں رہتے ہیں، کثرت میں نہیں۔ آسمان پر ایک بعید ترین ستارہ کا ہمارے زیر قدم تودہ خاک سے علت و معلول کا ربط ہے۔ کارلائل کی تعبیر کے مطابق کل کائنات ایک برگ کاہ کی پرداخت میں باہم دگر سرگرم تعاون ہے۔ دیوار کے شگاف میں ایک پھول، کائنات، خدا اور انسان سے کچھ اس طرح مربوط ہے کہ شاعر یہ یقین رکھتا ہے کہ اگر وہ اس کو پوری طرح جان سکے تو یہ پتہ چلا سکیگا کہ خدا اور انسان کیا ہے۔ موجودات کی وحدت کا تصور سائنس اور تمام سچے مذاہب کا بنیادی مسلمہ ہے۔ قرآن اس کے متعلق ایک سادہ دلیل رکھتا ہے کہ اگر ایک سے زائد خدا ہوتے تو تم تمام کائنات میں ایک بدنظمی اور انتشار سے رو در رو ہوتے یا کسی وجود کو استحکام نصیب نہوتا، اور نہ کوئی قانون عمل پیرا ہوتا۔ سائنس کے نزدیک بھی کائنات یگانہ و یک رنگ ہے، اور اس کی

بے پایاں رنگا رنگی قوانین کی وحدتوں میں پروئی ہوئی ہے، اور یہ تمام وحدتیں بالآخر ایک محیط کل وحدت پر منتہی ہوتی ہیں۔ سائنس میں تمام ثابت شدہ تجربات اس فرضیہ کی توثیق کرتے ہیں، لیکن سائنس کو صرف دنیائے مدرکات ہی سے سروکار ہے۔ جہاں سائنس ختم ہوتی ہے وہاں سے مذہب کا آغاز ہوتا ہے۔ مذہب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ عالم حقیقی بھی ایک وحدت ہے، اگرچہ وہ ہمارے سامنے ایک محسوس واقعہ کی صورت میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ افلاطون نے منطقی استدلال کے طریق پر تصورات کا ایک اہرام تعمیر کیا ہے۔ عالم اجسام کی بوقلمونی اس مخروط نما عمارت کا زیریں حصہ ہے اور جیسے جیسے ہم اس کی بلندیوں پر چڑھتے جاتے ہیں، تصورات کا تنوع کم ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ہم اس کی چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں، جہاں صرف ایک ہی تصور رہتا ہے، یعنی عین‌الاعیان، جسے وہ خیر کا خطاب دیتا ہے، اور جس سے تمام تصورات نکلتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ عالم محسوسات بھی ان حاصل شدہ تصورات میں شریک ہو کر اپنا وجود برقرار رکھتا ہے۔ فلسفہ وحدت عقل کے لازمی مسلمہ تک بار پاتا ہے۔ ایک طبیعی موجودات کی کلیت کو عالم مدرکات کے مماثل قرار دیتا ہے، اور اس کے آگے قدم بڑھانے کو حق بجانب نہیں سمجھتا۔ فلسفۂ افلاطون کے پیرو حقیقت و عقل کو ایک سمجھتے ہیں، اور عقل کے آگے قدم بڑھانا ناممکن تصور کرتے ہیں، کیونکہ یہاں عقل اپنے منتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ عقل کو اس منزل پر سستانا چاہئے، وہ خود اپنے ہی کندھوں کے اوپر چھلانگ نہیں لگا سکتی۔ لیکن مذہب کے لئے کائنات اور عقل کی وحدت دونوں اپنے

سے پرے حقیقت اولیا کی نشان دھی کرتے ھیں ، جہاں سے نفس و مادہ کی ثنوی وحدت نمودار ھوتی ھے ۔ انسان کا ذھن بھی نفسیاتی طریق پر ایک وحدت ھے ۔ نفس و روح کی جیسی بھی نوعیت ھو ایک چیز غیر متنازع فیہ ھے کہ تجربہ اور ادراک ذھن کی یہ ایک لازمی وحدت ھے ۔ اسلام کی رو سے تمام عوالم ایک قانون یا ایک تخلیقی مشیت سے بندھے ھوئے ھیں ، کیونکہ ان سب کا خالق ایک ھے ۔ پروفیسر ھافڈنگ ، جو تاریخ فلسفہ کا عالم ھے ، کہتا ھے کہ مغرب میں عقیدۂ توحید کو سائنس سے بڑی مدد ملی جو مبنی ھے وحدت وجود پر ، جس کی وہ ھر قدم پر تصدیق کرتا ھے ۔ سائنس کا وحدت وجود اور مذھب کی وحدانیت دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے ھیں ۔ انسان نے خداؤں کی کثرت سے آغاز کیا ، جو ایک دوسرے سے لاپروا یا مخالف تھے ، اور بالآخر ایک خدا کے تصور تک رسائی حاصل کی ۔ قدرتی مظاھر کی تشریح بھی بےجوڑ تنوع سے شروع ھوئی ، یہاں تک کہ اس نے ایک کائنات کے تصور تک رسائی حاصل کی ، جس میں بعید ترین مظاھر بھی بالاخر ایک ھی قانون کے پابند اور باھم سببیت سے مربوط تھے ۔

عقل اور عالم کے علاوہ خدا اپنا ظہور انسان کی اخلاقی شعوریت پر بھی کرتا ھے ۔ کانٹ کہتا ھے کہ اس کو دو چیزوں نے پر خوف کردیا ، اوپر تاروں بھرے آسمان نے اور باطن میں اخلاقی قانون نے ۔ ان دونوں گوشوں میں اس نے قانون کی وحدت و یک رنگی کو دریافت اور ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ اس نے یہ دشواری محسوس کی کہ ان دو وحدتوں کو ایک بنیادی وحدت میں کیسے جوڑا جائے ، جس سے یہ دونوں

نمودار ہوئی ہیں۔ اس نے اس کو عقیدہ کے حوالے کر دیا جو علم سے پرے تھا، اور قابل فہم علم کی حقیقی کوتاہیوں کا قائل ہوگیا۔ وہ اپنے اس نظریہ پر مضبوطی سے جا رہا کہ جہاں فلسفہ منتہی ہوتا ہے وہاں سے مذہب کا آغاز ہوتا ہے۔ اسلام کی رو سے تمام سچے مذاہب توحیدی ہیں اور تمام اولوالعزم پیغمبر موحد تھے۔ اسرائیلی مذہبی عروج و ارتقاء کے سلسلہ میں قرآن حضرت ابراہیمؑ کا خاص حوالہ دیتا ہے، جنہوں نے وحدانیت کو صاف اور پرزور طریقہ پر پیش کیا، اور آنحضرتؐ نے بارہا یہ ارشاد فرمایا کہ آپ صداقت کے اس راستے پر گامزن ہیں جس پر حضرت ابراہیمؑ چلے تھے، جنہوں نے بت پرستی اور مظاہر پرستی سے یک لخت کنارہ کشی اختیار کی تھی۔ ہندو مت میں بھی ہم ایک طویل مگر درجہ بدرجہ ترقی، اصنام پرستی اور مظاہر پرستی کی وحدانیت یا روحانی وحدت وجود کی طرف دیکھتے ہیں۔ اگرچہ کہ اہل ہنود کی ایک بڑی جماعت اوتار پرستی سے آگے قدم نہ بڑھا سکی۔ یہی صورت حال عیسائیت کی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ ایک بلند مرتبہ موحد تھے اور بہت سے راسخ العقیدہ عیسائی ہمیشہ منکر تثلیث رہے۔ لیکن عقیدۂ تثلیث نے عیسائیوں کی توحید کو فاسد اور اس میں اوتار پرستی کو داخل کردیا اور یہ دعویٰ کیا کہ تین ابدی ہستیاں ایک تن واحد اور ساتھ ہی بآن واحد تین بھی ہیں۔ یہ دعویٰ ناقابل فہم ہونے کے سبب ایک سر عظیم سے موسوم کیا گیا۔ اسلام اس عقیدہ کی نہ ضرورت تسلیم کرتا ہے اور نہ صداقت اور قرآن بارہا اس کی تردید کرتا ہے۔ زرتشت بھی اصلاً توحید پرست تھا تاہم اسکی وحدانیت کی لطافت

یک گونہ فاسد ہو کر رہ گئی ۔ کیونکہ روشنی و تاریکی کے نسبتاً آزاد اور مخالف اصول یزداں و اہرمن کی صورت میں ایک دوسرے کے مقابل صف آراء ہوگئے ۔

بدھ مت کا معاملہ قدرے مختلف ہے ۔ بدھ مت بالعموم لاالٰہی مذہب یقین کیا جاتا ہے ۔ گوتم بدھ نوع انسانی کی روحانی اصلاح و ہدایت کی بابت کہتا ہے کہ یہ اخلاقی قانون کی تفہیم و پیروی سے حاصل ہو سکتی ہے ، جو اس کے نزدیک قانون رحم و شفقت اور جملہ خود غرضانہ جسمانی خواہشات کی نفی ہے ۔ اس نے ہندو دیواستھان (Pantheon) کی تردید کی ، لیکن خدا کی موافقت و مخالفت میں کسی طرح کی تبلیغ نہ کی ۔ مگر اس کا نروان ، جس کی اگرچہ سلبی تشریح کی جاتی ہے ، ایک ایسی کیفیت ہے جس میں زندگی کی تمام اذیتیں اور پابندیاں ، تمام خوف اور غمگینیاں برطرف ہوجاتی ہیں ۔ یہ ایک الوہیت کی مطلقاً مثبت کیفیت ہے ، جو ہر زمانہ اور مذہب کے صوفیائے کرام کے تجربات کا عطیہ ہے ۔ روح انسانی یہ وحدت اس الوہیت کے ذریعہ ہی سے حاصل کرسکتی ہے ، اگرچہ یہ وحدت کسی انسانی ابواب میں بیان نہیں کیجا سکتی ، کیونکہ وحدت و کثرت کے اصطلاحات عالم زمان و مکان سے مستعار لئے گئے ہیں ۔ ہم گوتم بدھ کو صوفیاء کے مفہوم میں موحد کہہ سکتے ہیں ، اگرچہ کہ بدھ متی فلسفہ کا حیات کے متعلق منفیانہ انداز غیر اسلامی مزاج رکھتا ہے ۔

ہم کہہ نہیں سکتے کہ حالیہ دور میں بدھ متی تعلیمات کیا تنقیہ و تصفیہ کیا گیا ہے ۔ مگر جہاں تک ہندو مت کا تعلق ہے ہندو اصلاحی تحریکات کے مطالعہ سے اس امر

کا بلاخوف اظہار کیا جا سکتا ہے کہ رام موہن رائے سے لیکر گاندھی جی تک اصلاح شدہ ہندو مت زیادہ سے زیادہ وحدانیت کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ سوامی راما نند تیرتھ، سوامی دیویکا نند، سوامی دیا نند، رام کرشنا پرمانیس اور متعدد اخلاقی و مذہبی مصلحین کسی نہ کسی رنگ میں توحید پرست تھے۔ ان میں سے بعض کا رجحان زیادہ تر خدا کے تجسم کی طرف تھا، اور بعض زیادہ تر تنزیہہ کی طرف مائل تھے۔ ان کی یہ دریافت فلسفہ یا تصوف کے ذریعہ ہوئی تھی۔

اسلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ وحدانیت کا معلم اول ہے۔ اس کا قول ہے کہ یہ عقیدہ ایسا ہی قدیم ہے جیسے کہ انسانیت اور مذہبی صداقت۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ تمام اولوالعزم پیغمبروں نے اس کی تبلیغ کی اور تمام آسمانی کتابوں میں ابتداً یہ عقیدہ اپنی خالص شکل میں موجود تھا۔ مگر یہ عقیدہ بار بار فاسد ہوتا گیا، جس کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے ہر قوم میں پیغمبر مبعوث ہوتے رہے۔ تمام مذاہب کی بنیادی وحدت اسلام کے ضروری عقائد میں سے ایک ہے۔ عظیم اور سچے مذاہب اپنے شعائر و رسوم، قوانین و رواج میں مختلف ہوسکتے ہیں، جو حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، لیکن خدا کی وحدت کا اعتقاد سب میں مشترک ہے۔ اور قرآن کی رو سے یہ اعتقاد ایک صالح زندگی کے ساتھ تمام سچے مذاہب کے جوہر اصلی کی تشکیل کرتا ہے۔

اسلام کی صداقت و کامیابی کا یہ زبردست ثبوت ہے کہ تمام مذاہب کے مصلحین و مفکرین اس زبردست عقیدہ کے خلاف جو چیز بھی پائی جاتی ہو اس کی تردید یا توضیح میں سرگرم ہیں۔ اور وحدانیت کے ثبوت اپنی آسمانی

کتابوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہے ہیں اور یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ابتدا میں یہی ان کا صحیح مذہب تھا اور بقیہ تمام باتیں سن گھڑت ہیں جو بعد کو دین میں داخل ہوگئیں۔

خدا کی یگانگت جس کو اسلام بحیثیت تمام سچے مذاہب کی اساس کے سمجھتا ہے، حقیقت کی بابت محض الٰہیاتی عقیدہ کے طور پر قائم نہیں رہ سکتی۔ حیات کی بابت اس کی معنویت عمیق اور وسیع ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے قبل ظاہر کیا کہ یہ وہ اعتقاد ہے جہاں مذہب اور سائنس ہم آغوش ہوتے ہیں۔ اگرچہ سائنس لازماً ایک خدا کی جانب آگے کو حرکت نہیں کر سکتی، بلکہ وہ مشہود اور مدرک بالحواس موجودات تک پہنچ کر رک جاتی ہے۔ حکمیاتی وحدت وجود میں ضروری نہیں کہ وحدانیت ہو، بلکہ یہ اس جانب ایک زبردست قدم ہے۔ اس عقیدہ کی تردید سے کہ خود مختار خدا بکثرت ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے خودسرانہ ارادوں سے ہر قدم پر مظاہر فطرت میں دخل اندازی کرتا ہے، وحدانیت حکمیاتی طریق تعبیر کی زبردست موید ہو جاتی ہے۔ خدا کی وحدت سے جو چیز بطور نتیجہ تبعاً پیدا ہوتی ہے، وہ نہ صرف وحدت کائنات ہے بلکہ وحدت انسانیت بھی ہے۔ ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ تمام مذاہب کی حقیقی وحدت اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ یہ بھی خدا کی وحدت کا منطقی نتیجہ ہے۔ اسلام خدا کی وحدت سے ایک اور نتیجہ وحدت انسانیت اخذ کرتا ہے۔ قرآن نے بار بار اس کا اظہار کیا ہے کہ تمام انسانیت ایک ہے اور تمام نوع انسانی ایک وجود سے ظہور پذیر ہوئی ہے، اور یہ کہ خدا نے اپنی روح آدم میں پھونکی۔ مختلف مقامات پر قرآن میں آدم سے مراد انسانیت

یا نوع انسانی ہے۔ اسلام انسانیت کو ہر حیثیت سے یک رنگ بنانے کا تصور نہیں کرتا، لیکن دوسری طرف وہ تاکیداً کہتا ہے کہ لسانی یا مختلف قوموں کے طریقہ ہائے زندگی کے اختلافات خدا کی معنی خیز نشانیاں ہیں، اور اس دعوے پر اسے اصرار ہے کہ بنیادی طور پر تمام انسانیت ایک ہے، اور تمام قوموں کو اس اصول پر متحد ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ان میں سب سے اہم اور ضروری یہ ہے کہ خدا ایک ہے اور تمام انسان اور مخلوقات عیال اللہ ہیں۔ انسانی اخوت راست نتیجہ ہے خدا کی وحدت کا۔ قانون اخلاق کی وحدت بھی خدا کی یگانگت سے ماخوذ نتیجہ ہے۔ قومیں اپنے رسوم و طریق زندگی میں کتنی ہی مختلف ہوں، سب کے لئے ایک ہی خارجی اخلاقیت کا ہونا ضروری ہے۔ اخلاقیت کے دو معیار، ایک اپنی قوم کے لئے دوسرا غیروں کے لئے، کبھی روا نہیں رکھا جا سکتا۔ اگرچہ نیتشے نے حاکم اخلاقیت اور محکوم اخلاقیت کی بابت بحث کی ہے جیسے کہ بعض اناث و ذکور کے اخلاق ضوابط میں تفریق و امتیاز کرتے ہیں۔ اسلام پرزور طریقہ پر یہ تصور پیش کرتا ہے کہ جیسے تمام انسانیت ایک ہے، ایسے ہی اس کا اخلاقی ضابطہ بھی ایک ہونا چاہئے۔ اخلاقی وحدت انسانی وحدت سے بالاتباع صورت پذیر ہوتی ہے اور انسانی وحدت خدا کی وحدت سے تبعاً رونما ہوتی ہے۔

صفات خداوندی کے بیان میں صفت وحدت پر قرآن میں بہت زور دیا گیا ہے۔ یہ وہ صفت ہے جو مقابلتاً سمجھنے میں بہت آسان ہے، اور دیگر صفات کے فہم و ادراک میں حقیقی دشواری لاحق ہوتی ہے۔ ایک محدود ذہن غیر محدود کا علم کیسے حاصل کرسکتا ہے، ایک مطلق ذات، اضافی کے ذہن

میں کیسے سما سکتی ہے۔ دنیا کو صفت و مقدر کے پیمانوں سے جاننے کے لئے انسان کو ایسا مخصوص جسم متعین حواس کے ساتھ عطا ہؤا ہے جو اس سلسلہ میں ممد ہوسکے۔ چنانچہ وہ خاص کر اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کے حیاتی مقاصد کی تکمیل میں اسکا معین ہو۔ یہاں تک کہ اس کا جوہر عقل بھی اسکے حواس اور جسم کے تقاضوں میں متمکن ہے اور اس کے حواس میں اضافہ اور توسیع کی خدمت انجام دیتا ہے۔ اس کی عقل بھی تنازع للبقا میں، اور اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں ایک آلۂ کار ہے۔ اسکے حواس اور اسکی عقل محدود اور اضافی ہیں، جن کا معاملہ بھی محدود اور اضافی ہی سے رہتا ہے۔ انسان جو اپنی زبردست حکمیاتی ترقی اور منطقی استدلال سے جوہر کی ماهیت اور برگ کاہ کی بالیدگی کو پوری طرح نہ سمجھ سکا، کیا اس صورت میں اسکی یہ جسارت بے جا نہوگی کہ وہ تمام حیات اور موجودات کے آخری سرچشمہ کی صفات کو جاننے کا دعوٰی کرے۔ پھر ایک دوسری دشواری یہ درپیش ہے کہ انسان کی زبان اسکے حواس کا پیرایۂ ادا ہے، کیونکہ یہ تمام الفاظ بالاخر حواس ہی سے مشورہ طلبی کرتے ہیں اور انہی سے جواب حاصل کرتے ہیں۔ اسلئے کس طرح اس خدا کے صفات انسانی بول چال میں بیان کئے جاسکتے ہیں، جو مکان میں ہے نہ زمان میں، اور نہ جو ہمارے حواس کا موضوع مشاہدہ ہی ہو سکتا ہے۔ ہمارے اعلٰی اقدار اور اونچے تصورات جو نفوس و اجسام کی فطرت سے محدود ہیں، صرف ہمارے لئے نہیں ہیں اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم اپنی شخصی خصوصیات سے تجاوز کریں اور حیات و کائنات سے انکا جو رشتہ ہے وہ معلوم کر سکیں؟ تو کیا ہم خدا کے

عرفان سے مایوس ہوجائیں یایہ جانے بغیر کہ وہ کیسا ہے اسکو
جاننے کا دعویٰ کریں - لیکن یہ دونوں صورتیں تمام سچے مذاہب
کا خاتمہ کردینگی اور ہمیں یا تو مطلقاً اخلاقی یا ذہنی تشکیک
پر پہنچا دینگی یا خدا کے تصور کو پست تر درجہ پر لا کر
ایک معلوم و مشہود شئی بنا دیں گی - ایسی شئی جو
جاننے والے سے کم تر ہے، کیونکہ ایک معلوم کا جاننے
والا احاطہ کر لیتا ہے - لہذا مذہب کی بناء نہ بالکلیہ
خدا سے لاعلمی پر ہے اور نہ اس کے کامل عرفان پر -
تمام اساسی صداقتوں کی طرح خدا کا عرفان بھی انسان
کی عقل کے لئے محال مجسم ہے - یہ منطقی طور پر ترتیب
نہیں پا سکتا اور نہ نفسیاتی طریقہ پر سمجھا جا سکتا ہے -
تمام سچے مذاہب میں لاادریت کا عنصر ہے، اور یہ چیز
عمیق مذہبی تجربات میں بھی پائی جاتی ہے - عقل کے
ذریعہ خدا کو سمجھنے کی کوشش ہمیشہ رد و انکار پر
منتہی ہوتی ہے - جیسا کہ اسپنوزا نے کہا ہے کہ ہر تعریف
ایک قسم کی تحدید ہوتی ہے - تمام بڑے انبیاء اور اولیاء ذات
مطلق کا ناقابل فہم اور ناقابل بیان ہونا تسلیم کرتے ہیں -
علم جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایک داخلی خارجی نسبت ہے -
ہم کس طرح اس کا عرفان حاصل کر سکتے ہیں جو نہ داخل
ہے اور نہ خارج اور نہ ان کی باہمی نسبت؟

اس لحاظ سے ہم اسلام کی حیثیت کو واضح کرنے کی
کوشش کرینگے - اپنی ذات سے خدا مکیناً جانا نہیں جاسکتا
مگر اس کی کنہہ و حقیقت اساسی اقدار میں پنہاں ہے - جیسا کہ
قرآن کہتا ہے - اس کے لئے اعلیٰ ترین صفات کے نام ہیں* - خدا

* و للہ اسماء الحسنیٰ

کی صفات کے مقابلہ میں ہمارے اقدار محدود مماثلتیں اور اشارات
ہیں۔ صحیح کنایہ وہ ہے جو حقیقت کی نشان دھی میں ممد
ہو۔ انسان رمز و کنایہ میں گفتگو کرنے پر مجبور ہے۔
ہم کو چاھئے کہ پہلے خدا کی جملہ نقائص سے پاکی بیان
کریں۔ مذھبی زبان میں تسبیح و تقدیس سے یہی مراد ہے۔
خدا کو ایسے صفات سے متصف کرنے سے احتراز کرنا چاھئے،
جن کے اتصاف میں ہم کسی انسانی ھستی یا کامل ھستی
کی بابت پس و پیش کرتے ہیں۔ ہمارے لئے کمال ایک ناقابل
رسائی مطمح نظر ہے، لیکن یہ خدا کی صفت لازمی ہے۔
ہم خدا پر یہ ایمان رکھتے ہیں کہ وہ تمام اقدار کا خالق
اور قائم رکھنے والا ہے، اگرچہ ہماری قدریں ایک انسان
ھی کی قدریں ہونگی۔ افلاطون ہمیں تین قدریں، صداقت،
حسن، اور نیکی بتلاتا ہے۔ اپنے مناظرہ منطقی میں اس نے
یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسانی حیات اور وجود
میں جو چیزیں قابل قدر ہیں وہ ان میں سے ایک یا ایک
سے زیادہ اقدار پر مشتمل ہو سکتی ہیں اس کی ترتیب
و اصطفاف میں نیکی ان سہ گانہ اقدار میں سے ایک ہے۔ وہ کہتا
ہے کہ اعلیٰ تصور اور تمام دیگر اقدار کی بنیاد ایک ہمہ خیر
ذات ہے۔ اس لحاظ سے افلاطون کی منطقی بحث کی توثیق عمیق
مذھبی شعوریت سے ہوتی ہے۔ یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ
محبت اور مسرت حتیٰ کہ طاقت کو بھی نوع انسانی مثل ذاتی
اساسی اقدار کے محسوس کرتی ہے، حالانکہ ان کا وجود افلاطون
کی سہ گانہ تقسیم میں نہیں۔ لیکن ذرا سا غور اس کو واضح
کردے گا کہ محبت بذات خود قائم نہیں رہ سکتی اور تصوراً
ان تین قدروں میں سے ایک یا زائد اقدار پرمبنی ہوگی، اور

مسرت ان اقدار کے حصول کی ایک شرط ہے، جو اس حصول کی ضمنی پیداوار ہے - محبت کو نیکی کے مفہوم میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے - طاقت اپنی حیثیت سے تنہا قائم نہیں رہ سکتی - یہ صرف اس وقت قابل غور ہوتی ہے جبکہ اسکا استعمال صداقت، نیکی اور حسن کے تحت کیا جائے -

اسلام کا یہ موقف ہے کہ خدا کی ذات حق ہے - وہ صداقت کی تخلیق کرتا ہے اور اپنی مخلوق سے سچائی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا مطالبہ کرتا ہے - تب کہیں کہا جاتا ہے، اللہ جمیل ویحب الجمال -* وہ کسی چیز کو پیدا کرتا ہے، پھر اسکو حسن و خوبی بخشتا ہے -† ہمہ خیریت کے متعلق قرآن اسکے صفات خوبی سے معمور ہے، جن کے لئے مختلف پیرایۂ بیان مثل رب، رحیم، غفار، کریم، اختیار کئے گئے ہیں - قرآن کی رو سے خدا کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلاطونیت کیطرح اسلام کے نزدیک بھی اعلیٰ قدر ہمہ خیر ذات سے متصف کیجا سکتی ہے - لاادریت سے مذہب کا کامل تحفظ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہماری انتہائی کوششیں ان اقدار کے حصول میں حقیقت کے ساتھ موافقت کریں - خدا ہمارے اعلیٰ اقدار کی حقیقت اور واقعیت کا ضامن ہے - ھافڈنگ کی فلسفۂ مذہب پر زبردست تصنیف مذہبی اعتقاد کی روح کو مثل تحفظ اقدار کے بتلاتی ہے - میں یہ سمجھتا ہوں کہ مذہبی اعتقاد کی اس سے بہتر الفاظ میں توصیف نہیں کیجاسکتی - یہ بالکل ممکن ہے کہ افلاطون کے ان تین اساسی اقدار پر یقین کیا جائے، مگر ان کو بلا کسی مطلق اور کائناتی وجود کے صرف مصنوعی اور

* مسلم - † الذی احسن کل شئی خلقہ — السجدہ — ۷

انسانی تسلیم کیا جائے گا۔ کوئی اس مقام پر پہنچ کر کہہ سکتا ہے کہ یہ انسانیت کے لئے حقیقی اقدار ہیں، مگر اس کا کوئی ثبوت یا ضمانت نہیں کہ یہ حقیقت اولیٰ میں پیوست وجا گزیں ہیں۔ یہ سقراط و افلاطون کے زمانہ میں سوفسطائیوں کا مسلک رہا ہے۔ مذہبی عقیدہ میں یہ اقدار اپنے درجۂ کمال پر خدا کے لازمی صفات ہیں، اور جب آدمی اپنی زندگی کو ان کے مطابق ڈھال لیتا ہے تو یہ محدود صورت میں خدا کی صفات میں شریک ہوجاتا ہے۔ مذہبی عقیدہ اس یقین پر مشتمل ہے کہ یہ اقدار منزہ عن الذات اور خارجاً حقیقی ہونے کے وجود اور خدا کی ہستی میں محفوظ ہیں۔

تمام مذاہب تجسمی اور تشبیہی بن جاتے ہیں، یعنی خدا کو انسانی شکل کے مشابہ سمجھنا اور ان احساسات کو انسانی احساسات کے مثل سمجھنا، جب تک کہ ہم اسلام کے اس نظریہ کو اختیار نہ کریں جس کو قرآن میں مختلف مقامات پر پیش کیا گیا ہے کہ بنیادی روحانی حقائق کی بابت انسانی اصطلاحات کو ہمیشہ رمز و کنایہ تصور کیا جائے۔ مثال کے طور پر خدا کے ممکن اور موجود ہونے کی صفت کو لیا جائے جو بنیادی صفت ہے اور جس سے دیگر صفات رونماء ہوتی ہیں۔ ہمارے لئے ہر موجود یا تو زمان میں ہے یا مکان میں یا ان ہر دو میں، لیکن خدا نہ زمانی ہے اور نہ مکانی۔ وہ زمان و مکان کا خالق ہے، اس لئے وہ ان سے گھرا ہؤا نہیں ہو سکتا۔ وہ تمام مسائل جو خدا کی لامتناہیت سے اُبھرتے ہیں اگر وہ زمانی و مکانی ابواب پر قائم کئے جائیں تو وہ انسانی عقل کو بے قیدیوں میں اُلجھا دیں گے اور اگر کسی نوعیت سے انہیں اختیار کیا جائے تو یہ ہمیں خرافات میں مبتلا

کردینگے - تاہم مذہباً ہمیں یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ خدا موجود ہے اور وہ لاحد و نہایت ہے - لیکن اس کا وجود اور لامتناہیت ہم سے مختلف ہے - ایسے ہی خدا کی یکتائی ایسی نوعیت کی ہونی چاہئے جو ہمارے ریاضیاتی اور مکانی اکائیوں سے مختلف ہو - کس طرح تخلیق کا ظہور اسکی مشیت سے ہوتا ہے، یہ بھی ہمارے لئے ایک معمہ ہے، کیونکہ کوئی مخلوق خالق مطلق نہ ہونے کے باعث اس خدائی عمل تخلیق کو نہیں سمجھ سکتی - مدت تخلیق کو بطور رمز و کنایہ سمجھنا چاہئے، جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے، زمانہ خدا کے نزدیک ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے تصور سے بالکل جداگانہ ہے - جیسا کہ رومی نے کہا ہے کہ صفات کمال کی حقیقی ماہیت کبھی سمجھی نہیں جا سکتی، بجز تمثیلی قیاسات کے ذریعہ اور ان صفات کے اثرات سے جو ہستی میں ظہور کرتے ہیں - ہم خدا کی محبت اور خوبی کے اثرات کو دیکھتے ہیں اور ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ شفیق و مہربان ہے - لیکن خدا کی ذات میں محبت کی حقیقی ماہیت ہمارے فہم و ادراک میں نہیں آسکتی بجز اس کے کہ جہاں تمثیلی قیاسات ہماری مدد کرسکتے ہیں - لیکن حقائق کے لئے اشارات اختیار کرنے میں ہمیں باخبر رہنا چاہئے کیونکہ یہ چیز تجسم اور بت پرستی کی طرف لیجاتی ہے -

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن تمثیلات و اشارات بکثرت استعمال کرتا ہے اور ساتھ ہی اس سے خبردار کرتا ہے کہ ان بیانات کو کنایات پر محمول کیا جائے - نہ صرف صفات الٰہی بلکہ یوم الفصل اور جزا و سزا کا نقشہ شگفتہ تشبیہات و استعاروں میں کھینچا گیا ہے - انسان سادی پیرایۂ بیان پر

مجبور ہے۔ ماورائے مادہ و نفس حقائق، جو وجود کے مختلف جہات سے بحث کرتے ہیں، ہمارے ابواب میں سما نہیں سکتے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے خاص اسلوب تجربہ اور رابطہ کے رکھتے ہوں جو ہماری موجودہ سطح وجود پر آشکارا نہیں۔ اس کو غالب نے نہایت خوبی سے پیش کیا ہے :-

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
بنتا نہیں ہے دشنۂ و خنجر کہے بغیر

جب رمزیت نہایت شگفتہ اور لطیف ہوتی ہے تو یہ میلان رکھتی ہے کہ اس کو حقیقت کا قائم مقام سمجھا جائے۔ اس لئے قرآن ہم کو اس رجحان سے کھلے الفاظ میں آگاہ کرتا ہے کہ یہ محض تمثیلات ہیں۔ جنت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی مثال ایک باغ کی سی ہے جس میں نہریں رواں ہیں۔ اس اندیشہ سے کہ جنت کو کہیں مقامی تصور نہ کر لیا جائے، یہ کہا گیا ہے کہ یہ کل آسمان و زمین کے ساتھ برابر برابر پھیلی ہوئی ہے۔* اسی طرح خدا کو ناظر، سامع، متکلم، قابض، مختار اور خوش و ناخوش ہونے والا بتلا کر قرآن خدا کی بابت ”لا تدرکہ الا بصار و ھو یدرک الا بصار“۔ ”لیس کمثلہ شئی“۔ کہتا ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں صرف ایک فرقہ اپنے محدود پیروؤں اور مخصوص زمانہ میں ایسا رہا ہے جو ظاہری طور پر خدا کی جسمانیت کا قائل تھا۔ یہ کرامیہ کہلاتا تھا (جو اپنے بانی محمد کرام کے نام سے منسوب ہے) یا مجسمیہ، منسوب بہ جسم۔

* سابقوا الی مغفوۃ من ربکم وجنۃ عرضھا تعرض اسماء والارض الحدید ۲۱

لیکن علماء و صوفیاء کی ایک بڑی جماعت اس پر جمی رہی کہ خدا کے صفات کی ماہیت ، جیسے کہ وہ اس کی ذات میں ہیں ، معلوم نہیں کی جا سکتی ۔ ہم صرف ان علتوں کی دلالت معلول سے کرتے ہیں جو ہمارے فہم و ادراک سے بالا تر ہیں ۔ امام علم الکلام ابو الحسن اشعری رح ، سرخیل اہل تصوف جلال الدین رومی رح اور فلسفی و عالم اور پختہ کار صوفی شاہ ولی اللہ کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا ۔ باطنی مشاہدات میں بعض اوقات خدا کے صفات مثل مادی صفات کے محسوس ہوتے ہیں ۔ جیسے کہ آنحضرت صہ نے باطنی رویت میں ربانی ہاتھوں کا لمس اپنے شانوں کے درمیان محسوس فرمایا تھا ۔ لیکن بالعموم یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ مشاہدات تمثیلی ہوتے ہیں جن میں غیر محسوس حقائق کو محسوسات کا رنگ دیا جاتا ہے ۔

صفات الٰہی کی نوعیت کے متعلق اسلام کا یہ نقطہ نظر معلوم ہو جانے کے بعد کہ وہ اساسی اور اعلیٰ ترین اقدار کے لامحدود کمالات ہیں ، نیز یہ کہ ذات الٰہی کے تعلق سے انکی اصل ماہیت کا ادراک ممکن نہیں اور ہم عام موجودات اور خود اپنی زندگی پر ان کے اثرات سے ان کا محض جزوی علم حاصل کرتے ہیں ، اب ہم ان صفات الٰہی کا تذکرہ کرینگے جن کو قرآن نے بنیادی صفات کہا ہے اور جن سے خدا کے دیگر اوصاف کے متعلق استنباط کیا جاسکتا ہے ۔

باب ششم

صفاتِ ذاتی

قرآن کی رو سے خدا کی پہلی اور اولین صفت ربوبیت ہے۔ 'رب' کے معنی بہم رساں، پرورش کرنے والا، اور پشت پناہ کے ہیں۔ اس کے لئے انگریزی میں کوئی مترادف لفظ نہیں۔ بعض انگریزی ترجموں میں اس کے معنی آقا کے لکھے گئے ہیں۔ جو نہایت ناقص اور غیر تشفی بخش ہے۔ شاید لفظ پروردگار اس کے قریب المعنی ہوسکے۔ مشہور ماہر لغات القرآن، امام راغب اصفہانی نے اس لفظ کی اس طرح تشریح کی ہے هو انشا الشئی حالاً فحالاً الٰی حد التام، یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے، اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق، اس طرح نشو و نماء دیتے رہنا کہ وہ اپنی حد کمال کو پہنچ جائے۔ یہ محض تخلیق کے معنی کو وسعت دینا اور پھیلانا ہے۔ محض تخلیق بذاتہ کسی مقصد کی تشریح نہیں کرتی۔ شوپنہار نے استمراری فعل تخلیق کو ایک بے بصر کائناتی ارادہ سمجھا، جو نیک و بد سے ماوراء اور بے مقصد تھا۔ پھر ایک تخلیق محض کھیل تماشہ ہو سکتی ہے، جیسا کہ بعض ہندو مذاہب فلسفۂ تخلیق کو خدا کی رنگ رلیوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن اس تصور کی قرآن میں قطعی الفاظ سے تردید کی گئی ہے۔ "ہم نے زمین و آسمان کو کھیل تماشہ کے طور پر نہیں پیدا کیا"۔* "ہم نے ان کو بیکار پیدا نہیں کیا" †۔ لفظ رب' جو

* خلقنا السموت والارض وما بینھما لعبین —دخان—۳۸

† وماخلقنھما الا بالحق—دخان—۳۹

مفہوم کے اعتبار سے پالنے والے ، قائم رکھنے والے ، اور محبت کے ساتھ پرورش کرنے والے اوصاف کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے ، ہمیں پیدا کرنے میں مشیت الٰہی کے مقصد و ہدایت کا پتہ دیتا ہے ۔ خدا اشیاء کی تخلیق کر کے چھوڑ نہیں دیتا کہ وہ بطور خود منقلب و متغیر ہوتے رہیں ، یا بخت و اتفاق کے ہاتھوں کھلونا بن جائیں ۔ قوت حیات تخلیقی ارتقاء کی قوت بن جاتی ہے جس کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مقصد کے تحت تخلیق کرتی اور ہر نوبت پر نشوونماء کے ذرائع مہیا کرتی ہے ۔ 'رب' ہونے کی صفت خدا کو ایک جامد و ساکن مطلق نہیں بلکہ ایک متحرک معبود بناتی ہے ۔ اس سے خدا تمام کائنات پر مثل تخلیقی و ارتقائی مقصود کے محیط ہو جاتا ہے ۔ مقصد کے حصول کی طرف ترقی کرنا ہر زندگی کا ذاتی وصف ہوتا ہے اور ہر زندگی مقصد تلاش ہوتی ہے ۔ لہذا ایک حی و قیوم خدا کے لئے یہ ضروری ہے کہ سہارنے اور ترقی دینے والی ذات کے طور پر خود کو ظاہر کرے ۔ ڈاروینی مفروضۂ حیات اسکو بخت و اتفاق کا نتیجہ قرار دیتا ۔ اور ایک بے بصر و بے رحم کشمکش حیات میں ، جہاں فطرت خوں ریز و خوں خوار دکھائی گئی ہے ، ماحول سے مطابقت تصور کرتا ہے ۔ زندگی کے حسین اور مطابق عقل تصرفات جو عروجی مدارج میں ایک خلولی جرثومہ (Amoeba) سے لے کر انسان تک مختلف شکلیں اختیار کرتے ہیں اندھی قوتوں کے کرشموں کے طور پر پیش کئے گئے ہیں ۔ اسلام کی رو سے ہر زندگی غایتی اور ہر غائیت کے پیچھے خدا کی ذات کار فرما ہے ۔ جس کی حکمت آسمانوں میں ثوابت و سیاروں کے نظام سے ہویدا ہے جن کی حسابی نوعیت کی جچی تلی حرکتیں قرآن میں خدا کی زبردست نشانیوں سے تعبیر کی

گئی ھیں ۔ وہ خدا جس کی قوتیں لامحدود ھیں ، لیکن جو ھر چیز کو ایک مقررہ مقدار سے ظاھر کرتا ھے تاکہ وہ برقرار رھے اور اپنی فطرت کے مقررہ حدود میں رہ کر منزل مقصود کی طرف ترقی کرے ۔ ایک بے جان مادہ سے حیات کی روئیدگی کو قرآن میں متعدد مقامات پر ایک زبردست اعجاز ، خدا کی ھستی کی دلیل ، اور بقا و حیات جاوداں کے ثبوت میں پیش کیا گیا ھے ۔ وہ خدا جو اصلاً خالق و نگہبان ھے اپنی مخلوق کو تباہ ھوتے دیکھ نہیں سکتا ۔ ایک حی و قیوم ذات ، ایک فرد کے جسم و کالبد کو ایک مرتبہ پیدا کر کے ختم نہیں ھو جاتی ۔ خدا جو 'رب' ھونے سے متصف ھے ، کسی تشبیہی یا رمزی پیرایہ میں بیان نہیں ھوسکتا ۔ وہ کسی شئے کے کاریگر سے زیادہ ، اور ایک ایسے آقا سے بڑھ کر ھے جو اپنے آرام کی خاطر خادم سے خدمت واطاعت کا طالب ھو اور جو اپنے خدمت گزار کا اگر زیادہ نہیں تو اتنا ھی دست نگر ھو جتنا کہ خادم اپنے آقا کا ھے ۔ نہ اس کے لئے ایک باپ کی تشبیہ موزوں ھو سکتی ھے ، کیونکہ ایک باپ اور بیٹے کا رشتہ بھی زیادہ تر خارجی نوعیت کا ھوتا ھے ۔ بعض دور جدید کے ماھرین نفسیات نے اس امر کے انکشاف کا دعویٰ کیا ھے کہ اس تعلق میں ایک قسم کی درپردہ اور تحت الشعور رقابت ھوتی ھے ۔ شاید ایک ماں اور بیٹے کا تعلق زیادہ تشفی بخش مثال ثابت ھو ۔ ایک بچہ رحم مادر میں نشوونما پاتا ھے ، وہ سچ مچ اس کا گوشت پوست ھوتا ھے اور ایک کافی مدت تک رھنے کے سبب اس کے جسم کا ایک جز و ھو جاتا ھے ۔ پیدائش کے بعد بھی ایام رضاعت تک وہ اپنی غذا بالکلیہ ماں سے حاصل کرتا ھے ۔ اس لئے ماں ، باپ سے زیادہ نگرانی کرنے والی اور پالنے پوسنے والی ھوتی

ہے۔ بعض مذاہب میں خدا کی ابوت کی تمثیل اختیار کی گئی ہے، کیونکہ سرقبیلی دور میں تمام اختیارات باپ کو حاصل تھے جو تنہا تمام ذرائع معاش کا کفیل و مالک ہوتا تھا۔ وہ اپنے افراد خاندان پر موت و زیست کا اختیار رکھتا تھا، جیسا کہ اس کو اپنے غلاموں پر حاصل تھا۔ حقیقت میں باپ اور بیٹے کی تمثیل آقا اور غلام کے بالکل ہم معنی ہے۔ خدا اور اس کی مخلوق کے تعلق کی تمثیل میں دونوں تشبیہیں نا کافی ہیں، اگرچہ یہ دونوں کسی بہتر مثال کے نہونے سے استعمال کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے خدا کی اُمومت کی تمثیل زیادہ تشفی بخش ہوسکتی تھی، مگر ایک سرقبیلی تمدن میں اس کو استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آنحضرت صلعم کی ایک حدیث ہے کہ جب آپ اپنے اصحاب کے ساتھ جلوہ فرماء تھے، آپ نے دریافت فرمایا ”کیا کبھی اس کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ ایک ماں اپنے بچہ کو دھکتی ہوئی آگ میں جھونک دیگی؟“ صحابہ نے عرض کیا 'یہ ناممکن ہے'، تب حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ”خدا کی محبت اپنی مخلوقات کے ساتھ ماں کی محبت سے بےانتہا زیادہ ہے“۔ ہم نے جو امومت کی تمثیل کی فوقیت کی بابت کہا ہے، اس کی توضیح حضور صلعم کی حدیث سے ہوتی ہے۔ اگر تمام صفات جو الفاظ میں ادا کئے گئے ہیں، تمثیلی ہیں اور کوئی کسی نہ کسی طرح کی تمثیل کے استعمال پر مجبور ہے تو 'رب'، 'اب' سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔ پیدا کرنے والے کا اختیار، مطلق نگہداشت کی قابلیت، کمال تک پہنچانے والی ہدایت، اور ماں اور باپ کی محبت، دستگیری و خبرداری، یہ تمام ایک 'رب' کے تصور میں مجتمع ہیں۔ اب اور آقا کی تعریفوں اور خود امومت پر بھی 'رب' کی صفت بدرجہا

فوقیت رکھتی ہے۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا خدا پر بحیثیت 'رب' کے اعتقاد ہماری زندگی کے تجربہ سے حق بجانب قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ واقعہ کہ وجود ایک نظم ہے، بد نظمی نہیں، یہ ثابت کرتا ہے کہ وجود ایک منظم اور عقلی کل ہے اور جیسا کہ ہم نے اس سے قبل کہا ہے، یہ نہ صرف مذہب کا نظریہ ہے بلکہ سائنس کا بھی ہے۔ ہمارا تجربی علم ہمارے سامنے تعمیر کے ساتھ تخریب کا بھی منظر پیش کرتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ دونوں دست بدست چلتے ہیں، اور تقریباً ہر موقعہ پر ان میں سے کوئی ایک دوسرے میں پایا جاتا ہے۔ مگر ہمارے ارتقائی فلاسفہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وجود بحیثیت کل کے ایک ارتقائی میلان رکھتا ہے۔ اہلیت بقا چاہتی ہے، اور نا اہلیت بتدریج فنا ہو جاتی ہے۔ کائنات ناقابل شکست قوانین پر استوار ہے، جو عقل سے جانے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ عقل کی تجلیات نہوتے، تو کبھی عقل سے پہچانے نہ جاتے۔ قانون حفظ نفس عالم مادہ میں بھی کار فرما ہے اور دنیائے حیات و نفس میں بھی اس کی کار فرمائی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مادہ تمام تبدیلیوں میں اپنا تحفظ کرتا ہے، کوئی چیز کلیتاً فنا نہیں ہوتی، اور تمام ظاہری تخریب صرف شکل و صورت کی تبدیلی ہوتی ہے۔ مجموعی قوت کا نظام عالم میں ہمیشہ یکساں رہنا ایک عالم گیر قانون ہے، اس لئے 'رب' کی صفت بحیثیت حفاظت کرنے والے کے ہر ذرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ نیبولا یا دخان سے سورج، چاند، تاروں اور سیاروں کا بتدریج نشو ونماء پانا اور اپنے مدارات پر منظم اور قابل شمار طریقہ پر ان کا گردش کرنا، یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ہر جگہ قانون کی حکومت اور وزن و مقدار کی

فرماں روائی ھے - بعض اوقات بطئ‌الفہم مادہ پرست یہ خیال ظاھر کرتے ھیں کہ یہ قانون اندھا اور میکانی ھے، اور اس بنا پر ایک مہربان اور اعتدال پسند خدا کی طرف رجوع ہونے کے بجائے یہ قطعیت کے ساتھ اس قسم کے تصور سے انکار کرتے ھیں۔ لیکن بعض بڑے سائنسدان مثل ایڈنگٹن (Eddington) جینس (Geans) اور ھالڈین (Haldane) کے، جنہوں نے موجودہ سائنسی تحقیقات کی بنیاد پر فلسفوں کی تعمیر کی کوشش کی ھے، اس نتیجہ پر پہنچے ھیں کہ کائینات کی تخلیق و قیام ایک زبردست ریاضیاتی دماغ سے ھوئی ھے۔ مشہور ماھر حیاتیات ھالڈین نے اس پر یہ اضافہ کیا ھے کہ دنیائے واقعات دنیائے اقدار پر مبنی ھے، اور کم از کم ایک زبردست قدرِ صداقت تمام حکمیاتی علم کی بناء ھے۔ لیکن حسن و خوبی بھی فوق الذات اور معروضی اقدار ھیں۔ اور وجود صرف ذات مطلق کے محاورے و اصطلاح میں قابل فہم ھے - ھر چیز جو موجود ھے، اس لئے زندہ ھے کہ وہ سنبھالی جا رھی ھے - وہ نہ صرف اپنی فطرت اور حفظ نفس کے جذبہ سے زندہ ھے، بلکہ دیگر تمام چیزیں بھی کچھ اس طرح سے منظم ھیں کہ عالمی نظام خود اس کو زندہ رھنے میں مدد دیتا ھے۔ جیسا کہ ایمرسن نے کہا ھے،کل کائینات ایک قطرۂ شبنم میں ڈھلی ھوئی ھے، یا جیسا کہ کارلائل نے کہا ھے، ایک برگ کاہ کی بالیدگی میں بھی جملہ موجودات باھم دگر سر گرم تعاون ھیں ۔ ان تمام احوال پر غور کرو، جو زندگی کو ممکن بناتے ھیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک کیفیت غیر موجود ھو تو زندگی مفقود ھو جائے گی۔ اگر متعدد شرائط معینہ طور پر پورے نہ کئے جائیں تو کوئی

چیز زندہ و کار گذار نہیں رہ سکتی - کیا یہ بے حد و نہایت مطابقت اندھی میکانیت کا ثمرہ ہے؟ یہ خود ایک اندھا پن ہوگا کہ ان قوانین سے چشم پوشی کر لی جائے جو ان تصرفات کا سبب ہیں۔ نٹشے، جو فطرت سے آگے علیم و رحیم اور خالق کائینات خدا کی طرف قدم نہ بڑھا سکا، کہتا ہے کہ تمام حکمت کے خزانے دنیا کے کل کتب خانوں سے زیادہ انسان کے جسم کی ساخت اور عمل واثر میں پوشیدہ ہیں - قرآن میں خدا کی ہستی کے متعلق جتنے دلائل ہیں، ان میں سے غائتیت کی دلیل، یعنی فطرت میں مقاصد کی تکمیل و مطابقت، زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے - قرآن ہم کو ہمارے نفوس کے مشاہدہ کا بھی حکم دیتا ہے - ''ما فی انفسکم افلا تبصرون'' - (اور خود تمہارے وجود میں بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟) - وان من شییء الا عندنا خزآئنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم (اور کوئی شئے نہیں جس کے ہمارے پاس ذخیرے نہ ہوں لیکن ہمارا طریق کار یہ ہے کہ جو کچھ نازل کرتے ہیں، ایک مقررہ مقدار کے ساتھ نازل کرتے ہیں) - انا کل شیء خلقنہ بقدر (اور ہم نے جتنی چیزیں بھی پیدا کی ہیں ایک اندازہ کے ساتھ پیدا کی ہیں) - قرآن بارہا اس کا اظہار کرتا ہے کہ تمام کائینات مطیع و منقاد ہے اور وہ حیات انسانی کی تابع فرمان بنائی جا سکتی ہے - یہ نہیں ہے کہ ہر چیز انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے، بلکہ انسان اور کائینات کچھ اس طرح ترکیب پائے ہیں کہ ہر چیز جو موجود ہے، وہ انسانی حیات کے مفید مطلب بنائی جا سکتی ہے، بشرطیکہ انسان اپنے علم کو درست طریقہ پر استعمال کرے - کائینات کو پہچاننا گویا اس کو مسخر کرنا ہے - مادہ اور حیات باہم ایک دوسرے

کے پابند ہیں ۔ عالم محسوسات میں زندگی مادہ سے ظہور کرتی ہے ، اگرچہ مادہ زندگی کو پیدا نہیں کرتا ۔ حیات اور مادہ دونوں مشیت الٰہی کی تخلیق ہیں ۔ اور چونکہ مصدر ایک ہے اس لئے باہم متوافق اور متنابع ہیں ۔ جس طرح ایک حیات عضوی میں بے انتہا دانائی ہے، اسی طرح ماحول کے ساتھ اس کی مطابقت میں بے پایاں حکمت ہے ۔ اگر گرد و پیش کی ترکیب پہلے سے اس طرح واقع نہوتی کہ وہ زندگی کے تمام مقاصد کو پورا کر سکے تو حیات کا کہیں وجود نہوتا ۔ پھر کیا یہ حزم واحتیاط حکیمانہ نہیں کہ حیات سے قبل مادہ کی اس طرح تنظیم کی گئی کہ وہ زندگی کا مددگار ثابت ہو ۔ پیروان ڈارون شاداں و فرحاں ہیں کہ انہوں نے دنیائے حیاتیات سے خالق کائینات کو خارج کر دیا اور یہ اپنے ادعاء کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ تمام مقصدیت اور حسن و زیبائی ایک بے بصر تنازع للبقاء کا نتیجہ ہے ۔ یہ نمود وارتقاء کی تاویل اتفاقی تحولات کے مفروضہ سے کرتے ہیں، لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ بخت و اتفاق کی سببیت میں دراندازی سائنس کی تمام بنیادیں ڈھا دیگی ۔ یہ اس حقیقت سے بھی تجاھل برتتے ہیں کہ قانون بقائے اصلح بے بصر میکانیت سے زیادہ عقل کی طرف نشان دھی کرتا ہے ۔ قانون عقل سے ہم رشتہ ہے ، اور یہ اس کا مرادف سمجھا جاسکتا ہے ۔ لیکن طبعیات جسے اندھی میکانیت کہتی ہے ، یہ اسی کے ذریعہ قانون بقائے اصلح کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں ۔ قانون بقائے اصلح کی مذھبی طریقہ پر بھی تعبیر و تفسیر کی جاسکتی ہے ۔ حیات کیوں اصلح کی مدد کرتی اور غیر صالح کو چھانٹ دیتی ہے ؟ اگر حیات اہلیت کی طرف بڑھنے میں معین ہے تو اس میلان کا اندھی میکانیت سے کس طرح استخراج کیا جا سکتا

ہے؟ اندھی میکانیت یہ معنی رکھتی ہے کہ وہ تمام اقدار سے بیگانہ ہے - لیکن ڈارونیت کی رو سے حیات ان تمام اقدار سے بے خبر نہیں، کیونکہ یہ خود اپنا اندازہ، اور اس میں جو قابلیت ہے، اس کا تخمینہ کرتی ہے، اور اس کو بقا کی قدر عطا کر دیتی ہے۔ ڈارون بذات خود منکر خدا نہ تھا - خدا کی ہستی کے متعلق اس کا انداز لاادری تھا - ایک سوانح نگار نے اس کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ جب کبھی وہ طاؤس کے بال و پر کی خوشنمائی کو دیکھتا تھا تو ایک پھریری سی اس کے تمام جسم میں دوڑ جاتی تھی اور وہ یہ سوچنے لگتا کہ کیا یہ حسن و زیبائی فی الحقیقت محض بخت و اتفاق کے تغیرات اور جنسی انتخاب کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ اسلام تنازع للبقاء کے نظریہ کو تسلیم کرتا ہے، لیکن یہ اس کے بے بصر ہونے سے انکار کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک تمام رکاوٹیں صلاحیت بقا کی آزمائش ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تخریب تعمیر کی طرف ایک ضروری قدم ہو، لیکن تخریب محض ایک ذریعہ ہے، اور تعمیر مقصد و مراد۔ کل انفرادی زندگی پیدا ہوتی، نشوونماء پاتی، اور فنا ہو جاتی ہے۔ زوال و انحطاط طبعی وجود کا ایسا ہی قانون ہے جیسا کہ پھلنا پھولنا۔ قرآن بارہا اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "دیکھو! ہم کس طرح مردہ زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتے ہیں"*۔ "وہ زندہ کو مردہ چیز سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ اشیاء سے نکالنے والا ہے†۔" یہ تمام موت و حیات کا سلسلہ اپنی کلیت میں بطور نشانی ایک 'رب' کیطرف رہنمائی کرتا ہے،

---

* فیحی بہ الارض بعد موتہا—روم—۲۴

† یخرج الحی من المیت الآیۃ—انعام—۹۶

جو حافظ و حفیظ اور مربی و قیوم ہے - یہی وجہ ہے کہ اس تمام فنا و تخریب کے ہنگامہ میں اصل اقدار محفوظ رہتے ہیں اور صرف وہی چیز جو نکمی ثابت ہوتی ہے ، چھانٹ دی جاتی ہے - بقائے اصلح کا عقیدہ مذہب کے مخالف نہیں ، بلکہ یہ اس کی تعلیمات کا جزو لاینفک ہے - ''گناہ کا بدلہ موت'' ہے- مذہب کی رو سے غیر اصلحیت زندگی کے اصلی اور دائمی اقدار میں شرکت کی عدم صلاحیت کا نام ہے - جنت گویا صالح اور اہل کا باقی رہنا ہے ، اور دوزخ گویا غیر صالح اور نااہل کا تباہ ہوجانا ہے - ڈارونی تصور اصلحیت کا موازنہ جب مذہب کے تنازع للبقاء اور بقائے اصلح کے تصور سے کیا جاتا ہے تو یہ حکمیاتی طریق پر بھی تنگ نظر اور کمزور قرار پاتا ہے -

یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ وہ مفکرین جو ڈارونی نظریہ سے متاثر ہیں ، فطرت میں تنظیم ، تعاون عمل ، اور حالات سے حیرت انگیز مطابقت سے ، جو زندگی کی ترقی و پرداخت کرتی ہیں ، چشم پوشی کرکے زیادہ زور کائنات میں تزاحم اور کشمکش پر دیتے ہیں - اعلیٰ اور ترقی یافتہ انواع کے ارتقائی نمود و بروز کو چھوڑ کر خالق کی پروردگاری اور قدرت کی نشانی کے طور پر جامد اور غیر متبدل انواع کی تخلیق کو ہی کیوں چنا جائے؟ اگر حالات کے تغیر سے ایسی نئی قسمیں ، جن میں صلاحیت بقا زیادہ ہو ، وجود میں آتی ہیں ، اور قانون حیات توریث کے ذریعہ موزوں و مناسب خصوصیات کا تحفظ کرتا ہے ، تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا محض ایک خالق ہی نہیں بلکہ ایک تخلیقی ارتقاء بخش ذات بھی ہے اور اس طرح تخلیق و ارتقاء پھر باہم ایک ہوجاتے ہیں -

اس نقطۂ نگاہ سے خدا نہ صرف خالق اور اقدار کا محافظ ہوتا ھے بلکہ اقدار کا ترقی دینے والا بھی قرار پاتا ھے۔ اس لئے قرآن میں کہا گیا ھے کہ خدا اضافہ کرنے والا، جاننے والا یعنی با خبر و آگاہ، ترقی عطا کرنے والا ھے۔ یہ چیز بطور رب ہونے کے اس سے ظہور پذیر ہوتی ھے۔

اس وقت تک ہم نے اپنی توجہ اور بحث و نظر حیاتیاتی زندگی کی طبعی مطابقتوں اور تصرفات پر مرکوز رکھی تھی اور یہ بتلانے کی کوشش کی گئی تھی کہ زندگی کے احوال اور ہر قدم پر اس کی سربراہیاں کسی طرح بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں، اور اس طرح ہم نے ایک دانا اور مہربان پروردگار کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اب ہم اس پروردگار کے دوسرے پہلو کی طرف متوجہ ہوتے ھیں جس کو قرآن ہدایت اور رہنمائی سے تعبیر کرتا ھے۔ اس کا یہ مطلب ھے کہ اشیاء اور مخلوقات بطور خود تبدیلی کے لیئے نہیں چھوڑی گئی ھیں کہ وہ اندھوں کی طرح راستہ ٹٹولیں اورمحض اتفاق سے کسی موزوں طریق زندگی کو پالیں، بلکہ قانون ہدایت بھی ایک عالمگیر قانون ھے اور مادہ سے لیکر نفس تک تمام گوشوں میں کارفرما ھے۔ ہم نے ابھی اس طرف اشارہ کیا ھے کہ مادہ کی میکانیت کو بے بصر کہنا بھی حق بجانب نہیں ھے۔ ہر مادہ مقررہ قوانین کی پیروی کرتا ھے یا ان قوانین کی اطاعت کرتا ھے جو اس کی فطرت میں اصلاً موجود ھیں۔ مادہ کی اقلیم بھی کوئی بخت و اتفاق کی قلمرو نہیں۔ وہ اپنی فطری تقدیر کی کاملاً پیروی کرتا ھے۔ قرآن کی رو سے ہر وجود ایک طریق زندگی کا حامل ھے، اور مادہ بھی اپنا ایک خاص طرز زندگی رکھتا ھے۔ آسمان و زمین میں ہر چیز خدائے برتر کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے مصروف حمد و تسبیح ھےجسکی زبان کو ھم

سمجھ نہیں سکتے ۔ مادہ کو بھی ہدایت کی جاتی ہے ۔ ایک ذرہ سے لیکر ستارہ تک ایسے نظامات ہیں جو پہلے سے مقرر کردہ ہیں ۔ کروڑہا ذرات کو کس نے مجبور کیا ہے کہ وہ بلوریں شکل اختیار کر کے خوشنما صورتوں میں اپنے آپ کو منظم کر لیں؟ ان بظاہر بے شعور ذرات میں کوئی ایسا نہیں جو ان حدود سے متجاوز ہوسکے جو اس کے لیئے مقرر کئے جا چکے ہیں ۔ اگر یہ ذرات شعوری طور پر باہم منظم نہ ہوں تو ان کی کسی نہ کسی طرح ہدایت کی جاتی ہے ۔ قرآن بار بار ہماری توجہ اجرام سماوی کی سیر و گردش کی راہوں کی طرف پھیرتا ہے ۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ مدارات پر صحت و درستی کے ساتھ ان کی سیر و گردش پر غور کریں ۔ اسلام کہتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہدایت اور مخلوق کی طرف اطاعت پذیری کا نتیجہ ہے ، مشیت الٰہی کے آگے کل عالم فطرت سر نیاز خم کئے ہوئے ، اور مسلسل وقف عبادت گذاری ہے ۔ ہر ذرہ اور ستارہ مسلم ہے ، یعنی سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے ۔ لٰہذا اسلام انسانیت کے کسی خاص گروہ کا مذہب نہیں ہے ، بلکہ وہ کل موجودات کا مذہب ہے ۔ خواہ وہ چلتی ہوئی ہوائیں ہوں یا بہتے ہوئے دریا ۔ ہدایت و اطاعت کی نوعیت مخلوق بہ مخلوق مختلف ، اور اقلیم بہ اقلیم جداگانہ ہے ۔ مادہ کی ہدایت ایک طریقہ پر ہوتی ہے ، شجر و حیوان کی دوسری طرح پر اور نفس اور روح کی ہدایت کا ایک علیحدہ طریقہ ہے ۔ مادہ کی رہنمائی جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں ، ریاضیاتی اور میکانی قوانین سے ہوتی ہے ۔ نباتات کی زندگی کی رہنمائی نمو و بالیدگی کے قوانین سے ہوتی ہے ، اور حیات حیوانی کی ہدایت جبلت سے ہوتی ہے ۔ جب اس منظر میں انسان نمودار ہوتا ہے اور نفس کی جلوہ فرمائی ہوتی ہے تو ہم جبلت سے عقل کی طرف تبدل و تغیر دیکھتے

ھیں۔ عقل کے ساتھ ھی انسان کے اس نہایت پر اسرار استحقاق و آزمائش کی نمود ھوتی ھے جسے اختیار و ارادہ کہا جاتا ھے۔ عقل و اختیار کے جلو میں غیر یقینیت بھی آتی ھے۔ یہ نئی ودیعت ایک عطیہ بھی ھے اور ایک خطرہ بھی۔ انسان کے لئے ھمیشہ دو راھیں کھلی ھوئی ھیں اور ان دو متبادل صورتوں میں سے عمل پیرا ھونے کے لئے وہ کسی ایک کا انتخاب کر سکتا ھے۔ مگر عقل عطا ھونے کا یہ مطلب نہیں کہ ھدایت ربانی اس سے کنارہ کش ھو گئی۔ اگر عقل کا صحیح استعمال ھو تو یہ بطور خود بہترین ھادی ھے۔ بے راہ رو عقل سطح جبلت سے بھی نیچے گر جاتی ھے، لیکن درست طریقہ پر ھدایت یافتہ عقل اس کو ملائکہ سے بھی اوپر پہنچا دیتی ھے۔ گمراہ شدہ عقل کے متعلق قرآن میں کہا گیا ھے کہ یہ صرف حیوانیت کی سطح پر ھی نہیں اتر آتی بلکہ اس سے بھی نیچے گر جاتی ھے۔ کیونکہ حیوانات خدا کی عطا کردہ جبلت کی پیروی کرتے ھیں جو بے راہ رو نہیں ھے۔ اسلام ماورائے عقل مذھب ھونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اس کی بنیادی شرائط میں سے ایک یہ ھے کہ عقل کا صحیح استعمال خدا کے عرفان تک پہنچاتا ھے۔ مگر انسان محض عقل ھی نہیں ھے، وہ ایک ارادہ اور اختیار بھی ھے، جو ایک دو دھاری تلوار ھے۔ جو قوانین فطرت اور حیات کو درست طریقہ پر سمجھنے اور عمل میں ان کی پیروی کرنے کے لئے بھی استعمال کی جا سکتی ھے، اور قوانین صداقت کی خلاف ورزی کے لئے بھی، جس سے انسان ھلاکت و تباھی کی طرف پہنچ جاتا ھے۔ قرآن کہتا ھے کہ انسان کو اس کے مشاھدہ، تجربہ اور عقل اور بالآخر وحی کے ذریعہ راہ حق و باطل اور خطا و صواب بتلادی

گئی ہے - قرآن کے بموجب وحی کی ہدایت ایک برتر ذریعہ ہے جو فطری ، جبلی اور فوق العقلی ہو سکتا ہے - حیوانی جبلت کو بھی قرآن میں ہدایت بذریعہ وحی کہا گیا ہے - جیسا کہ نص قرآنی ہے ''اپنا چھتا تیار کرنے کیلئے ہم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی''* - وحی جس سے انبیاء کو سرفراز کیا گیا ، ایک خاص عطیہ ہے جو انسان کے لئے خدا کے مقرر کردہ طریقوں کی تصدیق اور وضاحت کرتی ہے - یہ محض ادراک عقلی سے کہیں زیادہ ہے - محض عقلی ہدایت انسان کے لئے کافی نہ تھی ، اس لئے ربانی حقائق کا فہم و ادراک مخصوص منعم علیہ افراد کے لئے ممکن بنایا گیا تا کہ وہ اپنے یقین کو بلا واسطہ ادراک سے محکم کریں اور اپنی صداقت شعار و پرہیزگار زندگی اور راست تجربات سے پیدا شدہ قوت کے ذریعہ دوسروں میں بھی نیکو کاری پیدا کرسکیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح وجود میں مراتب اور مخلوقات میں درجہ وار ترتیب ہے ، اسی طرح ہدایت کے بھی مراتب ہیں اور تمام اشیاء و مخلوق اپنی ضرورت کے مطابق ہدایت پاتی ہیں - ہر مخلوق کا مذہب اس کی فطرت ہوتی ہے ، جو اس کو ودیعت کی گئی ہے اور جب تک وہ اس فطرت کی پیروی کرتا ہے ، راہ راست پر رہتا ہے - قرآن میں اسلام کو اس فطرت سے تعبیر کیا گیا ہے جو انسان کوعطا ہوئی ہے - اس کی بنا معجزات یا ناقابل فہم اسرار پر نہیں ہے - اگر اسکو درست طریقہ پر سمجھا جائے ، اور بہ رضا و رغبت اسکی اتباع کی جائے تو اسلام انسان کی فطرت ہے - اسلام کسی مخصوص مذہب کا نام نہیں - جس طرح مذہب کا خدا ایک ہے ، اسی طرح کل مذہب بھی

---

* و اوحی ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا — الخ — ۶۸

ایک ہے اور وہ ایک مذہب دین فطرت ہے جس سے انسان سرفراز کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت نے ارشاد فرمایا ہے ''ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے، وہ اپنے ساتھ صرف انسانی فطرت لے کر آتا ہے اور یہ اس کے والدین ہیں جو اسے یہودی، عیسائی اور زرتشتی بناتے ہیں''۔ یہ عیسائیوں کے عقیدہ گناہ آدم کی براہ راست اور پر زور تردید ہے۔ خدا کی پیدا کردہ فطرت معصیت آلود نہیں۔ عیسائی دینیات اس کی دعویدار ہے کہ آدم سے گناہ سرزد ہوا اور آدم کی یہ معصیت فطرت انسانی کے لئے جز و لاینفک اور موروثی خصوصیت بن گئی۔ ہر بچہ پیدائشی گناہگار ہے۔ نیک اعمال اور پاکیزہ زندگیاں بھی اس موروثی داغ کو نہیں دھو سکتیں۔ اور حضرت عیسیٰ کی حلولیت، غم و محن، اور موت بطور کفارہ عظیم پر ایمان لائے بغیر کوئی چیز سود مند نہیں ہو سکتی۔ بلا اس کو مانے ہوئے تمام روحیں اس طرح راندگی کے سبب ہلاک ہو جائینگی جس طرح کہ وہ رانده اور مردود پیدا ہوئی ہیں۔ یہ چیز فہم و ادراک سے بالاتر ہے کہ یہ ناخوشگوار عقیدہ خدا کی مہربانی و پروردگاری کے عقیدہ سے کس طرح میل کھا سکتا ہے۔ یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ خدا نے پہلے تو تمام انسانیت کو تا قیام قیامت مردود ٹھہرایا اور ایسے لا تعداد بچوں کو نا قابل استیصال گناہ کا حکم دیا جو ابھی کتم عدم میں تھے، اور پھر ان کی نجات کا یہ ہی ذریعہ سوچا کہ اس کا ''اکلوتا بیٹا'' ان گناہوں کی پاداش میں قربان کیا جائے، جن کا ارتکاب نہ تو اس بیٹے نے کیا تھا اور نہ دوسروں نے۔ عیسائی مذہب یہ شیخی بگھارتا ہے کہ اس نے خدا کو عشق و محبت کے روپ میں پیش کیا جبکہ دیگر مذاہب نے اس کو ایک سخت گیر اور بے رحم آقا کی حیثیت

دی تھی ۔ لیکن اس خدا کی محبت عجیب و غریب ہے اور یہ مذھب بھی نرالا ھے جس کے نزدیک خدا پہلے تو اپنے بندوں کو ناکردہ جرموں کی پاداش میں مردود ٹھہراتا ھے اور پھر اپنا ظہور اس طرح کرتا ھے کہ انسانوں میں سے ایک برگزیدہ ترین ھستی کو، جو خود اس کے مماثل سمجھی جاتی تھی، ان سب کے کفارہ میں بھینٹ چڑھا دیتا ھے۔ ایسا عقیدہ سچے مذھب کی بنیاد ڈھا دیتا اور زندگی کو ایک اندوھگین معاملہ قرار دیتا ھے ۔ اسلام اِس مہمل اعتقاد کی پیہم تردید کرتا ھے جس سے انسان اور خدا کی توھین ھوتی ھے اور قانون و اخلاق کی ساری بنیادیں مسمار ھو جاتی ھیں ۔ قانون اخلاق کی رو سے جیسا کہ اسلام نے پیش کیا ھے ، نہ جزا میں عوض معاوضہ ھے اور نہ سزا میں کسی کی نیابت اور قائم مقامی ۔ ایک کا اخلاق بوجھ کسی دوسرے سے نہیں اٹھوایا جائیگا ۔ عالم روحانی میں کوئی تاوان و کفارہ نہیں اور ھر نفس اپنے اعمال کا ذمہ‌دار ھے ۔

جب کہ ھر ذرہ ، درخت، اور حیوان، جو عالم وجود میں قدم رکھتا ھے، اپنی فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتا ھے ، تو پھر انسان ، جو خلاصۂ کائنات اور زبدۂ موجودات ھے، کیوں ایک برگشتہ فطرت کے ساتھ جنم لے؟ اسلام کی رو سے خدا کی الوھیت، رحمت اور شفقت بہترین طریقہ پر برگزیدہ انسانوں میں ظہور کیا کرتی ھیں، جو کاملاً خدا کی ھدایت کی فرماں برداری کرتے ھیں ۔ اس میں شک نہیں کہ عقل و اختیار مائل بہ ضلالت ھو سکتے ھیں اور بہت سی صورتوں میں یہ گمراہ بھی ھوتے ھیں ۔ مگر یہ گمراھی ان کی ذات میں نہیں ھوتی کہ ان کا مداوا صرف نامعقول عقیدوں سے ھو سکے ۔ انسان گناہ اور غلطیوں کا ارتکاب کرتا ھے، لیکن ان میں بدترین شخص بھی

نیک اعمال کرتا ھے - وہ بخشندۂ بے نیاز ھماری ھر خطا پر فوراً گرفت نہیں کرتا - قرآن کہتا ھے کہ اگر خدائے تعالٰی فوری سزا دینے والا ھوتا تو صفحہ ھستی پر کوئی مخلوق زندہ نہ رھتی۔ انسانی عقل اور وحی وہ ھدائتیں ھیں جو نوع انسانی کو بارگاہ ایزدی سے عطا ھوئی ھیں، اور نیکی و راست بازی کی راھیں ھمہ وقت اس کے آگے کھلی ھیں - ھدایت ھروقت موجود ھے - اگر وہ درست طریقہ پر غور کرے اور اپنی صحیح حقیقت اور فطرت پہچانے تو نہ اس کی حقیقت ذات اور نہ اس کی صحیح فطرت کبھی گم کردہ راہ ھو سکتی ھے - ھدایت ایک عالمگیر ربانی قانون ھے جس میں فطرت الٰہی بطور 'رب' کے ظہور فرما ھوتی ھے -

اگر ھم خدا کے نام مثل رب، قیوم، رزاق اور مقیت کی تمام تعبیریں بیان کریں تو اس کے بہت سے دیگر صفات جن کا اظہار قرآن میں کیا گیا ھے، بطور ضمنی نتائج کے پیدا ھونگے۔ لیکن اھم صفات جو اس کے مفہوم میں داخل ھیں، قرآن میں ان کے علیحدہ نام تاکید اور توضیح کی غرض سے دئے گئے ھیں - اس قسم کے دو اھم صفات ھیں جو اکثر پہلو بہ پہلو آتے ھیں، کیونکہ یہ دونوں ایک ھی صفت کے دو پہلوؤں کو ظاھر کرتے ھیں - الرحمٰن والرحیم' یہ دونوں رحمت سے مشتق ھیں - ان کا ترجمہ مثل 'رب' کے ایک لفظ میں کرنا دشوار ھے - امام راغب اس کی تعریف یوں کرتے ھیں کہ یہ شفقت ھے جو لطف و احسان کا عمل چاھتی ھے اور اس طرح پر یہ رحم و محبت کے تصور پر مشتمل ھے - یہ دونوں مقداری و درجاتی ھیں جو ایک صفت کی شدت کو ظاھر کرتے ھیں - رحمٰن کے معنی ھیں وہ وجود جس میں شفقت و رحم اور لطف اس کی ذات

کے اصل جزو کی صورت پذیری کرتے ہوں اور رحیم اس صفت کے مستقل اور عملی ظہور پر دلالت کرتا ہے۔ یہ دونوں الفاظ اس طرح سمجھے جا سکتے ہیں کہ یہ ایک ہی صفت کے سکونی اورحرکی پہلو کو بیان کرتے ہیں، اگرچہ دوسرے نقطۂ نگاہ سے تمام صفات فعل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک خالق کی تمام صفات تخلیقی ہونی چاہئیں، ان میں سے کوئی بذات خود بیکار نہیں رہ سکتی۔ خالق بحیثیت الرحمن کے از روئے محبت تخلیق کرتا ہے۔ تمام حقیقی محبت فعلی اورتخلیقی ہے۔ اور بحیثیت الرحیم وہ اس محبت کو عفو پروری اور رحم کی شکل میں استعمال کرتا ہے۔ جبکہ اس کی مخلوق خطاوار ہو کر اس کی طرف بخشش کے لئے رجوع ہوتی ہے، یا وہ خود ان کو اپنے بے پایاں لطف و کرم سے نجات عطا فرماتا ہے۔

الرحمن کی صفت بحیثیت سرمدی تخلیق محبت کے اور بعض اوقات اسم معرفہ کے طور پر صرف خدا کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ مگر صفت الرحیم میں، جس کے معنی مہربان اور بخشنے والے کے ہیں، دیگر افراد نسل انسانی شریک ہو سکتے ہیں۔ قرآن یہ دوہری صفت ایک ساتھ استعمال کرتا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ جب کوئی چیز شروع کریں تو اس کو دھرا لیا کریں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام خدا کا تصور خاصتاً اور اصلاً بحیثیت ایک مہربان اور شفقت کرنے والے کے کرتا ہے۔ جیسا کہ ابھی بتلایا گیا ہے کہ یہ دونوں الفاظ رحمت سے مشتق ہیں، جن کا مفہوم انگریزی میں کسی ایک لفظ سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے مفہوم میں شفقت، احسان، رحم اور لطف و کرم شامل ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک لفظ اس کے پورے تضمنات کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ خدا کیوں پیدا کرتا ہے، اور پیدا کرنے کے بعد کس لئے یہ اپنی مخلوق کو دائماً پالتا اور پرورش کرتا ہے، تو اس کا جواب اس کی صفت رحمت میں پایا جاتا ہے۔ نو فلاطونیوں نے کہا ہے خدا نور ہے، اور کائنات اس لا محدود سرچشمہ کا فیضان اور ایک لازوال آفتاب کی تابانی ہے۔ قرآن نے بھی اس تمثیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اور رحمت بار بار بیان کی جانے والی صفت ہے۔ نو فلاطونیوں کے لئے یہ درخشانی غیر ارادی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک سر چشمۂ وجود ارادہ سے خالی ہے۔ اور یہ ان کے نزدیک مخلوق کی ایک صفت سمجھی جاتی ہے۔ اسلام کا خدا ایک صاحب علم و ارادہ ذات ہے۔ اس کی یہ مشیت تخلیقی ہے اور اس مشیت کو حرکت دینے والی قوت رحمت ہے۔ خدا فلاسفہ کے نزدیک یا تو لا شخصی عقل سمجھا جاتا تھا یا ایسی ذات مطلق جو نا قابل بیان اور تمام صفات سے عاری تھی۔ قدیم فلاسفہ میں صرف افلاطون ایسا ہے جس نے خدا کی شناخت مثل جوہر عقل کے کی ہے اور اس کو عین الاعیان سے موسوم کیا ہے۔ اس کے نزدیک اعیان اصلاً حقیقی ہیں۔ وہ اس کو خیر سے بھی تعبیر کرتا ہے، اس خیر کو کل موجودات کی حقیقت قرار دیتا ہے اور تمام حقیقی وجود کو عقل کل اور ہمہ خیریت کے مماثل ٹھہراتا ہے۔ اگرافلاطون کے نظریہ کو تصوری طبعیات کا نمونۂ کمال سمجھا جائے تو ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ حقیقت اولیٰ کا اعلیٰ عقلی ادراک خدا کو ہمہ خیر قرار دیتا ہے۔ اسی طرح جب ہم اسرائیلیوں کے روحانی ارتقاء سے حضرت عیسیٰ تک پہونچتے ہیں تو ایک سخت گیرالہ مہربان

وشفیق خدا بن جاتا ہے ۔ جب کسی نے حضرت عیسیٰ کو ہمہ خوبی کہا تو انہوں نے جواب دیا کہ ''میں نہیں ، میرا باپ جو آسمان میں ہے وہ ہمہ خوبی ہے'' ۔ حضرت عیسیٰ کی پوری تعلیمات کا میلان محبت و رحمت کی طرف ہے ۔ قرآن جب سچے عیسائیوں کی تعریف کرتا ہے تو شفقت و رحمت کو ان کی امتیازی خصوصیت بتلاتا ہے ۔ لیکن عیسائی دینیات نے اس تصور کو مسخ اور توڑ مروڑ کر کے فطری معصیت ، نیابتی غم و محن اور کفارہ کا عقیدہ پیدا کیا ۔ راسخ العقیدہ عیسائی جو زیادہ روحانیت اور کمتر دینیات کے حامل ہیں ، اپنی زندگیوں سے رحمت و شفقت کے وصف امتیازی کا اظہار کرتے ہیں ۔

اسلام نے عبرانیوں اور یونانیوں دونوں کے اعلیٰ کارناموں کو اپنے میں سمو لیا ۔ اسلام کا خدا عقلی ہے ۔ وہ عقل و صداقت کے ساتھ تخلیق کرتا ہے ۔ عمل تخلیق تعقلی ہے اس لئے عقل کے لئے قابل فہم ہے ۔ عقل صحیح استدلال اور گہرے مشاہدہ سے آسانی کے ساتھ فطرت سے خدا کی طرف قدم بڑھا سکتی ہے ۔ سائنس کائینات میں صرف نظریاتی اور ریاضیاتی عقل کو تلاش کرتی ہے ۔ لیکن مذہب اس سے آگے ان اقدار حیات کی طرف قدم بڑھاتا ہے جو فطرت کے اعتدال پسند کاموں کے ساتھ پہلو بہ پہلو چلتے ہیں ۔ قرآن بالکلیہ حقیقت کو عقل، اور عقل کو خیر کے مماثل قرار دیتا ہے ، جو تمام دیگر اقدار کے لئے بطور خیر اعلیٰ کے ہے ۔ خیر ایک جنس ہے اور تمام دیگر اقدار اس کی انواع ہیں ۔ قرآن کے متعدد اقتباسات اس کی تصدیق کرینگے ۔ قل لمن ما فی السموات و الارض ؕ قل اللہ ؕ کتب علیٰ نفسہ الرحمۃ ؕ ۔

(اے پیغمبر ! تم ان لوگوں سے پوچھو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ کس کے لئے ہے؟ کہو، اللہ کے لئے۔ اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ رحمت فرمائے) - ورحمتی وسعت کل شئی - (میری رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے) - وان تعدو انعمت اللہ لا تحصوھا ط ان الانسان لظلوم کفار ط- (اگر تم اللہ کی نعمتیں گننی چاہو، تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی ان کا احاطہ نہ کر سکو - حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور بڑا ہی نا شکر ہے) - کہا جاتا ہے کہ جنت آسمان و زمین کے برابر پھیلی ہوئی ہے اور آسمان و زمین تمام موجودات کو گھیرے ہوئے ہیں - اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی رحمت کا ہر چیز میں ظہور ہے - کیونکہ ہر چیز جو وجود میں آتی ہے وہ اس کی تخلیقی محبت کا کرشمہ ہے - مختلف مقامات پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کا فضل و احسان صرف نیکیوں کے صلہ وانعام تک محدود نہیں بلکہ وہ گناہ گاروں تک بھی وسیع ہیں - "ہمارے انعامات کی بارشیں دونوں پر ہوتی ہیں، تیرے مالک کا فضل محدود نہیں"- "اس نے اپنی رحمت و شفقت کا حصہ تمہارے قلوب میں بھی ڈالدیا ہے، جو غور کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں* "-

بعض اوقات یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایک مہربان اور شفیق خدا، انتقام و عقوبت کا خدا نہیں ہو سکتا - یہ نہایت سطحی اعتراض ہے - حقیقی نظم و ضبط کے تحت عقوبت و سزا کسی غضب آلودہ انتقام کا نتیجہ نہیں، بلکہ اعتدال پسند

* ربنا وسعت کل شئی رحمته - المؤمن - ۷ - وجعل بینکم مودة ورحمته ان فی ذلک لایات القوم یتفکرون - روم - ۲۱

محبت کا ذریعہ ہے ۔ وہ بچے خراب محبت ہوتے ہیں جنہیں کبھی سزا نہیں دی جاتی کیونکہ ان کے والدین کی محبت اپنے جذبۂ محبت کے بارے میں اندھی اور تخریبی ہوتی ہے ۔ قرآن نیکی کے عوض جزا ، اور برائی کے بدلے سزا کے بیان سے مملو ہے۔ بدی کے عوض سزا نظام اخلاق کا ضروری جزو ہے ۔ مگر سزا کی خاطر سزا اور عقوبت کا مقصود بالذات ہونا ایک کھلی غیر معقولیت پر دلالت کرتا ہے ۔ دوزخ کا نقشہ ہو بہو ایسا ہی تمثیلی ہے جیسا کہ جنت کے نفس پرستانہ استعارے ۔ اصلی صداقت جس پر زور دینا مقصود ہے ، وہ یہاں اور ما بعد زندگی دونوں میں نیکی کے نتائج کے اچھے ہونے اور برائی کے نتائج کے برے ہونے کا لزوم ہے ۔ تشبیہات و استعارے عالم تخیل کی چیزیں ہیں ، لیکن نظام اخلاق ایک حقیقت ہے ۔ نفس انسانی کی ترکیب اس طرح واقع ہوئی ہے کہ ہم روحانی اور اخلاقی صداقتوں کے لئے بھی مادی اور نفسانی استعاروں کے استعمال پر مجبور ہیں۔ فلسفی جو خالص عقل کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں ، اور صوفیاء، جو روحانی حقائق کے غیر مادی، غیر نفسانی، غیر میکانی اور غیر زمانی ہونے کا فہم و احساس رکھتے ہیں ، نفسانی تشبیہات بکثرت استعمال کرتے ہیں ۔ کیونکہ بغیر اس کے کوئی چارہ نہیں ۔ نفس و روح کی کوئی اپنی زبان نہیں اور ہر پیرایۂ ادا حواس سے مستعار لیا جاتا ہے ۔

ہم قرآن میں عذاب کے متعلق معنی خیز بیانات پاتے ہیں ۔ مختلف مقامات پر یہ کہا گیا ہے کہ خدا نیکی اور بدی کو بالکل ٹھیک طور پر جانچتا ہے اور وہ عذاب دینے میں جلد باز نہیں ۔ نیز یہ کہ اگر خدا برائی کا بدلہ برائی سے دینے میں جلد باز ہوتا ، تو زمین پر کوئی جاندار

باقی نہ رہتا۔ کئی مقامات پر جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ خدا سزا دینے میں نہایت سخت ہے، وہاں ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ وہ بے انتہا مہربان اور احسان کرنے والا ہے۔ بظاہر یہ بیان متناقض معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ذرا غور کرنے سے یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ عقوبت محض اصلاح کے لئے ہے اور مہربان خدا محبت کی خاطر سزا دیتا ہے۔

باب ہفتم

خدا کی قدرت کاملہ اور ہمہ خیریت

لفظ خدا سے اسلامی خدا پرستی کا جو مفہوم مترشح ہوتا ہے اگر اس کو مختصراً بیان کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ذات ہمہ تواں ہونے کے ساتھ ہمہ خیر بھی ہے۔ محض قوت تخلیق اور جوش حیات سے خدا نہیں بنتا۔ تخلیقی توانائی بالقصد اور شعوری طور پر خیریت کی طرف مائل ہونی چاہئے۔ شوپنہار جسے بے بصر ارادہ کہتا ہے اور جو بلا کسی غایت و مقصد کے موجی طور پر تخلیق کرتا ہے، خدا پرستی کی عین ضد ہے۔ تجربی طور پر کائینات میں ہم نظم و ترتیب دیکھتے ہیں، لیکن یہ میکانی نظام ہو سکتا ہے، جو مادہ اور توانائی کے قوانین کا نتیجہ ہو، جس میں کوئی شعوریت اور غایت نہیں ہوتی۔ ہمارا غور و فکر سے عاری تجربہ، ہمہ توانی اور ہمہ خیریت کے متعلق ہمارے تصور میں چند خامیوں کے سبب، خدا پر ایمان لانے میں سخت دشواریاں پیدا کرتا ہے۔

ہم یہ سمجھنے کی کوشش کرینگے کہ از روئے عقل ہمہ تواں سے کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا قادر مطلق ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ کوئی خارجی قوت اس کے ارادہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی ایسی ہستی موجود ہے جس کا وصف ذاتی خیریت ہے، تو پھر فوراً شر کا مسئلہ ہمارے پیش نظر ہو جاتا ہے۔ کائیناتی شر کی طرح ہی اخلاق شر ہے، جس کی

تشریح ہمیں کرنی ہے ۔ فطرت میں ہم تعمیر کے ساتھ تخریب بھی دیکھتے ہیں ۔ یہاں حیات کے ساتھ موت اور فنا موجود ہے ۔ خود حیات انسانی ، اخلاقی اور طبعی خرابیوں سے مملو ہے ۔ جب خدا ہمہ تواں اور ہمہ خیر ہے تو پھر شر کسی صورت میں بھی کیوں باقی ہے ؟ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا ہمہ خیر ہے تو وہ اپنی مخلوق کو پوری طرح خوشحال رکھنا چاہیگا ، اور اگر وہ قادر کل ہے تو وہ اس قابل ہوگا کہ وہ جو چاہے کرسکے ۔ لیکن اس کی مخلوق خوش نہیں ہے ۔ اس لئے خدا میں خیریت یا قوت یا دونوں کی کمی ہے ۔ اس سوال کا جواب قدرت کاملہ کے تصور کی صحیح تشریح میں مل سکتا ہے ۔ قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ خدا کو یہ اختیار ہے کہ وہ جو چاہے اور جس چیز کا ارادہ کرے وہ پورا کرے ۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے ارادہ کی مخالفت کر سکے ۔ جب وہ کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ صرف لفظ ' کن ' کہہ دیتا ہے اور وہ موجود ہوجاتی ہے * ۔ لیکن قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اس کا ارادہ خود اس کے قوانین کا تابع ہے ۔ یہ عقلی ارادہ ہے ۔ یہ قدرت کاملہ پر چند قیود عائد کرتا ہے جو سنت الٰہی اور ضروریات تخلیق کے مد نظر خود عائد کردہ ہیں ۔ " خدا کے پاس ہر چیز کے بے انتہا ذخیرے ہیں ، لیکن وہ ان کو ایک انداز سے ظاہر اور پیدا کرتا ہے " ۔ " تم سنت الٰہی میں کبھی تبدیلی نہ پاؤ گے " † ۔ وہ مقررہ ضابطوں کے مطابق عمل کرتا ہے ۔ بغیر قوانین و

* ۔ کن فیکون † ۔ فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا

ہم آہنگی کے نہ کائینات قائم رہ سکتی ہے اور نہ زندگی - لیکن یہ قوانین خدا کے ہمہ تواں ہونے پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتے- یہ بطور خود خدا کی مصلحت پسند قوت کے اظہارات ہیں- ممکنات اور نا ممکنات اصلاً خیال اور اشیاء کی فطرت میں داخل ہیں- کوئی چیز بیک وقت ہست و نیست نہیں ہو سکتی- متضاد صفات ایک ساتھ کسی چیز کے ایک ہی رخ میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتے - اگر عدد خدا کی عقلیت کے اظہارات میں سے ایک ہے تو خدا بھی دو اور دو کو پانچ نہیں کریگا- یہ سچ ہے کہ خدا کے نزدیک ہر چیز ممکن ہے- مگر شئیت امکان کو ظاہر کرتی ہے- حقیقی تضاد کوئی شے نہیں اس لئے وہ خدا کے بارے میں بھی نہیں ہو سکتا - اگر ہمہ تواں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بلا کسی قانون کے کوئی کام کیا جائے یا قانون بنا کر اسے خود سرانہ طور پر توڑ دیا جائے تو اسلام ایسے ہمہ تواں تصور کی تردید کرتا ہے - کائینات یک رنگیوں کا نظام ہے، اور عقل خود اپنے ممکنات اور نا ممکنات رکھتی ہے - خدا کی فطرت اور عقل بے بصر اور خود سرانہ نہیں ہے- خدا جو چاہتا ہے وہ پیدا کرتا ہے- لیکن اس کا ارادہ پُر از مصلحت ہوتا ہے - وہ جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے، اس کے سبب عقلی کو ظاہر کرتا ہے- تخلیق نطق الٰہی کو معروضی شکل دیتی ہے - اصلاً نا ممکن اور متناقض بالذات کو قدرت کاملہ وجود نہیں بخشتی - ایسے وقوعات ہوسکتے ہیں جن کا معلومہ قوانین سے ادراک نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک قسم کی سببیت دوسری قسم کی سببیت میں تغیر پیدا کر دے- یہ وہ تصور ہے جس کو ہم ان واقعات کے بارے میں اختیار کرسکتے ہیں جنہیں معجزات

کہا جاتا ہے ۔ یہ بالعموم قانون سببیت کی شکست کے نتائج نہیں ہوتے ۔ بلکہ یہ کسی دوسرے قوانین کے نظام کے تحت وقوع پذیر ہونے والے تغیرات کے اثرات ہوتے ہیں۔ قوانین کے مطابق عمل کرنا عقلیت کی روح ہے ، اور اگر عقلیت میں خوبی و احسان ہے تو ہم قوانین قدرت کی بے رحمی اور سنگدلی پر کوئی حرف گیری نہیں کر سکتے ۔ اگر کوئی ولی یا پیغمبر گرتی ہوئی چھت یا دیوار کے نیچے بیٹھے گا تو وہ اس پر ضرور گریگی اور قوانین جذب و کشش اس کے تقدس کا کوئی پاس نہ کرینگے ۔ لیکن ایک گنہگار جو اس عمارت کو خطرناک سمجھ کر اس سے دور ہٹ جائے گا وہ محفوظ رہیگا ۔ سطحی مذہبیت یہ کہیگی کہ خدا کو چاہئے کہ وہ اس ولی کو بچا لے اور گناہ گار کو کچل ڈالے ۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا جس نے ایک نظام کائینات پیدا کیا ہے، افراد کے گونا گوں حالات میں ان کے مفاد کی خاطر ، اسے نظر انداز کر دے اور اس کے کاموں میں خلل اندازی کرے۔ اس صورت میں کائینات ، کائینات نہیں رہیگی بلکہ ایک خود سرانہ ارادہ کی بد نظمی بن جائیگی ۔ کون ایسے خدا کو ہمہ تواں اور مہربان یا عقلی سمجھیگا ، جو یا تو کوئی ایسا نظام پیدا ھی نہ کر سکتا یا پیدا کرنے کے بعد ہر قدم پر لا تعداد مخلوق کی آسانیوں اور خام خیالیوں کی خاطر اس میں دخل اندازی کرتا رہتا تھا ۔ عقلیت کا مطلب ایک نظام ہے ۔ ایک ہمہ تواں ہستی جو خود معقول ہو ، معقول ارادہ ھی کر سکتی ہے ۔ اگر وہ اپنی عقلیت کو خود سری سے بدل دے تو وہ مہربان اور عقلیت پسند خالق نہیں رہ سکتی ، جو خدا کا اسلامی تصور ہے ۔

قرآن کہتا ہے کہ کائینات میں کوئی خامی اور خرابی نہیں ہے۔ یہ صرف ہماری تمنائیں اور تن آسانیاں ہیں جو حادثات کائینات کے ساتھ نیکی اور بدی کو منسوب کرتی ہیں۔ کائینات قوانین کے مطابق تبدیلیوں کا ایک نظام ہے۔ حیات اور موت اضافی اصطلاحات ہیں۔ یہ صرف وجودی اشکال کی تبدیلیوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ خدا ہمیشہ زندگی کو موت سے اور موت کو زندگی سے نکالتا ہے، اور اس تمام عمل میں انفع کو باقی رکھتا اور غیر نافع کو چھانٹ دیتا ہے۔ اس عمل میں تحفظ اقدار اور بقائے اصلح کا اصول کار فرما ہے۔ یہ فرق و امتیاز بے نظم و ترتیب نہیں۔ حیات، ضعف سے قوت کی طرف بڑھتی ہے، اور ایک معین حد تک ترقی کرنے کے بعد وہ پھر ضعف کی طرف عود کرتی ہے۔ یہ سارے چڑھاؤ اور اتار، عروج و زوال کے خم و پیچ ہیں۔ لیکن ان تمام تبدیلیوں میں کوئی نا قابل تلافی نقصان نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر چیز ایک جاننے والے خدا کی مرتب کردہ اور ہدایت یافتہ ہے۔ ایک جاہل منکر یہ کہتا ہے کہ اگر خدا قادر مطلق اور مہربان ہے تو موت و فنا کا وجود نہ ہونا چاہئے۔ مگر قرآن ان مظاہر کو ایک علیم اور شفیق خالق کی ہستی ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ اللہ الذی خلقکم من ضعف قوۃ ثم جعل من بعد قوۃ ضعفاً و شیبۃ ؕ یخلق مایشا ؕ و ھو العلیم القدیر ؕ۔ (یہ اللہ ہی کی کار فرمائی ہے کہ اس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا کہ پہلے ناتوانی کی حالت ہوتی ہے، پھر نا توانی کے بعد قوت آتی ہے، پھر قوت کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے۔ وہ علم اور قدرت رکھنے والا ہے)۔ زندگی کی ترقی و انحطاط کی نیرنگیوں کو بیان کرنے کے بعد

دو صفات علم و قدرت کا اظہار نہایت معنی خیز ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمام کارو بار سوچ سمجھ کر مرتب کردہ اور متعین مقصد کی پا بجائی کرتا ہے ، جو کسی طرح علم و قدرت کے منافی نہیں ہو سکتا ۔ الم تر ان اللہ انزل من السمآء مآء فسلکہ ینابیع فی الارض ثم یخرج بہ ذرعاً مختلفاً الوانہ ثم یھیج فتراہ مصفراً ثم یجعلہ حطاما ان فی ذالک لذکریٰ لا ولی الا لباب ۔ (کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا ، پھر زمین میں اس کے چشمے رواں ہوگئے ، پھر اسی پانی سے رنگ برنگ کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں ، پھر ان کی نشو و نما میں ترقی ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہو گئیں پھر—ترقی کے بعد زوال طاری ہوا اور— تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی چھاگئی ، پھر بالآخر خشک ہو کر چورا چورا ہو گئیں ۔ بلا شبہ دانشمندوں کے لئے اس صورت حال میں بڑی ہی عبرت ہے ۔ و خلق کل شیء فقدرہ تقدیرا ۔ (اور اس نے تمام چیزیں پیدا کیں ، پھر ہر چیز کے لئے ایک خاص اندازہ ٹھہرا دیا) ۔ قال ربناالذی اعطیٰ کل شیء خلقہ ، ثم ھدیٰ (ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی ، پھر اس پر زندگی اورمعیشیت کی راہ کھولدی) ۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قدرت کاملہ ہے جو ایک منصوبہ کے مطابق عمل پیرا ہے ۔ قدرت جو ہر کام کر سکتی ہے ، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خود اپنی فطرت کے خلاف بھی جا سکتی ہے ۔ چونکہ قدرت کاملہ عقل پسند ہے اس لئے یہ جو بھی کام کرتی ہے وہ حسن و خوبی کیلئے کرتی ہے ، کیونکہ عقل خیر پر مشتمل ہے ۔ یہ خیال ہم افلاطون کے

فلسفہ میں بھی پاتے ھیں - حق معقول ہے اور معقول خوبی ہے -
وما خلقنا السموات والارض وما بینهما لاعبین ط وما خلقنهما الا بالحق
ولکن اکثرهم لا یعلمون - (اور ھم نے آسمان و زمین
کو اور جو ان کے درمیان ہے، محض کھیل اور تماشہ
کے لئے پیدا نہیں کیا بلکہ جو کچھ بھی بنایا ہے حکمت
و مصلحت کے ساتھ بنایا ہے - مگر اکثر انسان ایسے ھیں جو
حقیقت کا علم نہیں رکھتے)- اسلام اعتدال پسند قدرت کاملہ
کا اقرار کرتا ہے اور ایسے ارادہ اور اختیار کو خارج کر دیتا
ہے جو بے قید اور خود سرا نہ ھو - اس قسم کی قدرت مطلقہ
لازماً خیر و خوبی ھوگی - اس طرح کے زاویہ نظر سے کائنات
میں کوئی خامی نہیں ھو سکتی - فطرت کے اعمال بے داغ ھیں -
یہ ھماری کم نگاھی ہے کہ جہاں ھم قانون کو دیکھ نہیں
سکتے وھاں اس کو بخت و اتفاق پر محمول کردیتے ھیں -
اور جو ھماری فنا پذیر خواھشات اور ضروریات کے موافق نہیں
ھوتے، ھم ان کو شر سے تعبیر کرتے ھیں - ما ترٰی فی
خلق الرحمٰن من تفوت ط فارجع البصر ھل ترٰی من فطور ط
ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئاً وھو حسیر ط -
(تم اس رحمان کی بناوٹ میں کبھی کوئی اونچ نیچ نہ پاؤ گے،
نظر اٹھاؤ اور اس تماشہ گاہ صنعت کا مطالعہ کرو - ایک بار
نہیں بار بار دیکھو، کیا تمہیں کوئی خامی دکھائی دیتی
ہے؟ تم اسی طرح یکے بعد دیگرے دیکھتے رھو، تمھاری
نگاہ اٹھیگی اور عاجز و درماندہ ھو کر واپس آجائیگی، لیکن
کوئی نقص نہ نکال سکیگی) - قرآن اس پر زور دیتا
ہے کہ کائینات اور فطرت میں کوئی شر نہیں، فطرت یزدان
اور اھرمن کی رزمگاہ نہیں ہے - یہ تمام کارخانہ ایک قادر کل

اور عظیم ذات کا ترتیب دادہ ہے - یہ ہمہ خوبی اور ہمیشہ مائل بہ خیر ہے - موت اور فنا اس کے منصوبہ کی تکمیل کے طریق کار کے مختلف پہلو ہیں - وہی چیز تج دی جاتی ہے جو اپنی قدر کھو دیتی ہے - خدا اپنے قوانین کے اعلان اور تکمیل سے اپنی قدرت کاملہ کو برقرار رکھتا ہے - اسلام کائیناتی شر کے وجود سے انکار کرتا ہے - یہ سوال صرف جہالت اور کوتاہ نظری سے پیدا ہوتا ہے - حقیقی بصیرت قدرت کے معاملات میں کسی نقص و خرابی کو نہیں پاتی - رہا یہ سوال کہ جب خدا قادر مطلق ہے تو وہ کائینات میں کسی شر کے وجود کو کیوں گوارا کرتا ہے؟ اس کا جواب قرآن کائینات میں شر کی تکذیب سے دیتا ہے - فطرت عالم گیر قوانین کے مطابق عمل کرتی ہے اور وہ اس میں کسی شخص کا لحاظ نہیں کرتی - یہ قوانین معقول ہوتے ہیں اور بھلائی کے لئے کام کرتے ہیں - بعض اوقات ان کا عمل ہمارے مفید مطلب نہیں ہوتا تو ہم ان کو شر کا نام دیتے ہیں - کائینات میں شر کا مسئلہ خود کائینات سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہماری کوتاہ نظر تشبیہیت اور انسانی جذبات کو خدا سے متصف کر دینے سے پیدا ہوتا ہے - ہماری تنگ نظر اضافیت اور ہمارے جذبات و عواطف یہ مسئلہ پیدا کرتے ہیں جو اشیاء کی ماہیت میں باہمی تضاد سے رونما نہیں ہوتا - عام طور پر فطرت ایک طرح کا نظام یک رنگی ہے اور کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ یک رنگیاں جو قوانین فطرت کہلاتی ہیں، اپنا وجود نہیں رکھتیں - لیکن یہ یک رنگیاں ہمیشہ ہماری خواہشات یا ہماری محدود و متضاد آرزوؤں کے مطابق عمل نہیں کرتیں - فطرت کے متعلق بہترین طریق عمل یہ ہے کہ اس کے کاموں کو سمجھا جائے اور جو کچھ وہ

پیش کرتی ھے اس پر صبر کیا جائے ۔ سائنسدان کا فطرت سے کوئی جھگڑا نہیں ۔ وہ اس کو سمجھنے کے لئے محبت آمیز واقفیت حاصل کرتا ھے اور اس کے عمل کے سامنے سر تسلیم و رضا خم کر دیتا ھے۔ اس کی رائے کی قدر محض صداقت ھے۔ یہی انداز رواقیوں کا کائینات کے متعلق تھا جسے وہ کائیناتی عقل یا خدا کے مماثل قرار دیتے تھے ۔ مارکس آریلیس (Marcus Aurelius) کا قول ھے کہ '' اے کائینات ، جو تیرے لئے بہتر ھے وھی میرے لئے خیر و خوبی ھے ''۔ جیسا کہ آنحضرت صلعم کا ارشاد ھے ، '' دھر (کائینات ، موجودات اور زمانہ) کو برا نہ کہو ، کیونکہ خدا کہتا ھے کہ میں خود دھر ھوں ''۔ اسلامی خدا پرستی فطرت اور خدا کو ایک نہیں سمجھتی ۔ خدا اپنی سہارنے والی قوت اور علم سے اس پر محیط ھے ۔ لیکن وہ اس سے منزہ بھی ھے ' جیسے کہ ایک مصور اپنی تصویر سے ماوراء ھوتا ھے ' اگرچہ کہ وہ اس میں نفوذ و سرایت کئے ھوئے ھوتا ھے کیونکہ وہ اسی کے تخلیقی ارادہ کا نتیجہ ھوتی ھے ۔ اگر خدا خیر ھے تو فطرت بھی خیر ھوگی ' کیونکہ خیریت سے صرف خیریت ھی ظہور پذیر ھوتی ھے ۔ فطرت کی جانب اس انداز فکر کو ترقی دینے کی غرض سے ھم کو اپنے خیریت کے تصور کو کائینات کی سرحد تک وسعت دینا چاھئے ۔ صرف اسی صورت میں ھمیں کائینات بے عیب و بے نقص نظر آئیگی ۔ کوئی ناقص تصور صرف عیوب و فطور ھی پائیگا ۔ کائینات کا پورا نقشہ پیش نظر ھونا چاھئے تا کہ کوئی گوشہ اوجھل نہ رھے اور ربانی مشاھدہ تک رسائی حاصل ھو سکے ۔ سائنس کا یہ اعتقاد ھے کہ کائینات قانون سببیت کی تابع ھے ۔ اور جہاں کہیں ھم قانون کا سراغ نہیں پاتے اس کی علت خود ھمارے علم کی کو تاھی ھے ۔

وسیع تر علم اس قانون کی کارگذاریوں کو منکشف کر دیگا۔
جہانتک فطرت کا تعلق ہے ، اسلامی خدا پرستی کسی بڑے اعتقاد
کی طالب نہیں۔ جن باتوں کو ہم ابتک نہ سمجھ سکے ہوں ،
وہاں ہمیں فطرت کو برا نہ کہنا چاہئے ، بلکہ دعا کرنی
چاہئے کہ ہمیں مزید بصیرت و روشنی ملے۔ اعتقاد راسخ سے
مزید روشنی عطا ہوتی ہے۔

بہت سے پیروان ڈارون ارتقائی کائینات کا نقشہ خون
آلود لب و دندان اور بے رحمانہ کشمکش حیات کے رنگ میں
پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان کے مفروضہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ
فطرت زیادہ سے زیادہ اہلیت کو پیدا کرتی ہے اور بقائے
اصلح کائینات میں ایک ترقی دینے والی قوت ہے۔ حیات
ادنیٰ سے اعلیٰ صلاحیت کی طرف حرکت ہے لیکن کیا کوئی
تعمیر بلا تخریب کے ممکن ہے ؟ قلب ماہیت کے معنی ایک
حالت سے گزر کر دوسری حالت کے وجود میں آنے کے نہیں۔ وہ
لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ ایک مہربان خدا کو فنا اور موت
کے بغیر حیات کو ترقی دینا اور قائم رکھنا چاہئے ، وہ گویا ناممکنات
کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم اپنی روٹی
بھی کھاؤ ، اور اس کو صحیح سالم بھی رکھو ؟ طفولیت
ایک خوشگوار زمانہ ہوسکتا ہے ، مگر شباب کی طرف بڑھنے
کے لئے اس کو چھوڑنا ضروری ہے۔ ہر ترقی میں بے رحمی
کا عنصر پایا جاتا ہے ، حقیقی چیز زندگی کی ابھرتی ہوئی خواہش
ہے۔ ڈاروینی ارتقائی کہتے ہیں کہ ارتقاء ایک مہربان خدا
کی ہستی کو غلط ثابت کرتا ہے۔ مگر اسلامی خدا پرستی
یہ سمجھتی ہے کہ بقائے انفع ایک مہربان خدا کے وجود کا
قوی ثبوت ہے۔ قرآن میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں

فطرت کی اس اصل حیثیت کو واضح طور پر آشکارا کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ فطرت نافع کو باقی رکھتی اور غیر نافع کو اپنے عمل تکوین میں چھانٹ دیتی ہے۔ انزل من السمآء مآء فسالت اودیة بقدرھا فاحتمل السیل زبد ارابیاً ط ومما یوقدون علیه فی النار ابتغاء حلیة او متاع زبد مثله ط کذالک یضرب الله الحق و الباطل ط فا ما الزبد فیذھب جفاء ج و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض ط کذالک یضرب الله الا مثال ط ۔ (اس نے آسمان سے پانی برسایا تو اپنی سمائی کے مطابق وادیاں بہہ نکلیں۔ اور میل کچیل سے جھاگ بن بن کر پانی کی سطح پر اٹھا تو سیلاب کی رو اسے بہا لے گئی۔ اور دیکھو اسی طرح جھاگ اس وقت بھی اٹھتا ہے جب لوگ زیور یا کوئی اور چیز بنانے کے لئے آگ میں تپاتے ہیں۔ حق اور باطل کے معاملہ کی مثال ایسی ہی سمجھو جو الله بیان کر دیتا ہے۔ پس جھاگ رائیگاں گیا، اور جس چیز میں انسان کے لئے نفع تھا وہ زمین میں رہ گئی۔ اسی طرح الله مثالیں بیان کردیتا ہے)۔ پروردگار ایسی چیزوں کو وجود نہیں بخشتا جو صرف ایک حالت میں رہتی ہیں۔ زندگی درجہ بدرجہ ترقی کا نام ہے۔ ادنیٰ کی جگہ اعلیٰ اور فروتر کی جگہ برتر لیتی رہتی ہے۔ قانون تبدل و ترقی کا دوسرا نام قانون فنا و موت ہے۔ انسان اپنی زندگی مادی عناصر سے شروع کرتا ہے اور پھر درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہے۔ یہانتک کہ وہ حواس اور عقل سے نوازا جاتا ہے۔ ذالک عالم الغیب و الشھادة العزیز الرحیم الذی احسن کل شیء خلقه و بد اخلق الانسان من طین ج ثم جعل نسله من سللة من مآء مھین ج ثم سوله و نفخ فیه من روحه وجعل لکم السمع و الا بصار و الا فئدة ط قلیلاً ما تشکرون ط

(یہ محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا عزیز و رحیم ہے، جس نے جو چیز بنائی حسن و خوبی کے ساتھ بنائی - چنانچہ یہ اسی کی قدرت و حکمت ہے کہ انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس کے توالد و تناسل کا سلسلہ (خون کے) خلاصہ سے جو پانی کا ایک حقیر سا قطرہ ہوتا ہے، قائم کر دیا - پھر اس کی تمام قوتوں کی درستگی کی اور اپنی روح (میں سے ایک قوت) پھونک دی اور اس کے لئے سننے، دیکھنے اور فکر کرنے کی قوتیں پیدا کر دیں، لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کا شکر گذار ہو) - ہم اس آیت میں یہ دیکھتے ہیں کہ عمل تخلیق و ترقی میں قوت کو رحمت کے ساتھ اور ہمہ توانی کو خیریت کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے - اگر کوئی مادہ پرست ارتقائی یہ دعوی کرتا ہے کہ حیات کی نمود پہلے مادہ سے ہوئی ہے اور وہ خود اپنا ظہور مٹی میں کرتی ہے، تو ایک طرح پر قرآن اس کی توثیق تو کرتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ کہ کر اس کی تصحیح بھی کرتا ہے کہ مادہ بطور خود خالق نہیں بلکہ یہ خود مخلوق اور اثنائے تخلیق میں ارتقاء کی ایک حالت ہے - قرآن آسمانوں کے متعلق کہتا ہے کہ یہ ابتدائی مرتبہ میں ایک بے ترتیب انبار تھے اور بعد میں ترقی کر کے اجرام کی نمایاں صورت اختیار کی، اور زندگی صرف پانی کے سبب ممکن ہوئی - تمام آسمان ابتدا میں بھاپ کے سے دھندلکے اور دھکتے ہوئے دھویں کی سی کیفیت رکھتے تھے - فطرت یا اس کے طریق عمل کو دیکھتے وقت، خواہ اس کے تخریبی پہلو پر زور دیا جائے یا اس کے تعمیری پہلو پر، کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ فطرت ہمیشہ تعمیر میں سر گرم رہتی ہے لیکن

تعمیر کے ساتھ تخریب ہمیشہ ناگزیر ہوتی ہے اور ان میں سے کسی ایک کو بغیر دوسرے کے حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر اہلیت کی بقا اور موزوں و مناسب کا استحکام خیریت کی طرف ایک اشارہ ہے جو ازلی و ابدی تخلیقی امنگ ہے۔ اسلامی خدا پرستی قانون ارتقاء کی حمایت کرتی ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ نکمی چیز چھانٹ دی جاتی اور نافع باقی رکھی جاتی ہے۔ اس سے خدا کا انکار نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ایسے زبردست خالق کی ہستی کا ثبوت ہے جو ہمہ خوبی ہے۔ کائینات میں نام نہاد شر کا وجود اور اس کی بے رحمی اصل میں غیر صالح کی تباہی ہے جو حیات کے عروج و ترقی کے لئے ناگزیر ہے۔

یہ سوال کہ زندگی میں شر کا وجود کس لئے ہے، بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ زندگی ہی کیوں وجود میں آئی ہے - ایسی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا جس میں تبدیلی نہ ہو اور غلبہ حاصل کرنے کے لئے مزاحمت نہ ہو۔ کشمکش مزاحمتوں پر قابو پانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر اڑنے والے پرندہ کو ہوا کی مزاحمت ناگوار گذرے، جس پر وہ بصد کوشش قابو پا کر اڑتا رہتا ہے، تو وہ اس حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے کہ یہی تزاحم اس کے ہوا میں اڑنے کو ممکن بناتا ہے۔ فطرت نے جو مزاحمت پیدا کی ہے وہ پروں کے ساتھ لازم و ملزوم کی طرح ہے اور ان کی ساخت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس پر قابو پا سکیں۔ خدا کی خوبی کا ظہور ان ہر دو کی تخلیق میں ہے، جنہیں ہم خیر و شر کا نام دیتے ہیں، وہ ایک ہی سطح کے محدف و مجوف پہلو ہیں اور ہم کسی ایک کو دوسرے کے بغیر نہیں پا سکتے۔

اخلاقی برائی

کائنات میں شر کے مسئلہ کو پوری طرح رد کرنے کے بعد اب ہم حیات انسانی میں شر کے مسئلہ کی طرف آتے ہیں ۔ شر سے ہمارا مفہوم مصائب و محن اور اقدار کی بربادی ہے ۔ کائنات کی حد تک صرف خالق اس کا ذمہ دار ہے اور یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اس نے جو کچھ پیدا کیا ہے یا جن طریقوں سے وہ انہیں قائم رکھتا اور تکمیل کو پہنچاتا ہے، اس کے لئے وہ متہم نہیں کیا جا سکتا ۔ کائنات میں جو کچھ ہے ، وہ صحیح و درست ہے ، کیونکہ دیگر متبادلات ممکن نہیں اور کوئی شخص قانون کائنات میں کسی تجویز یا اضافہ کا تصور نہیں کر سکتا ۔

لیکن جب ہم انسانیت کی حد پر پہنچتے ہیں تو یہ مسئلہ دوسری سطح پر اٹھا لیا جاتا ہے ۔ جہاں انسان کا ارادہ فطرت کے کاموں میں حائل ہوتا ہے ۔ شر جس کو انسان سمجھتا اور محسوس کرتا ہے ، دو قسم کا ہے : (۱) وہ مصائب جو خود اپنے اعمال سے پیدا ہوتے ہیں ۔ (۲) وہ آلام و تکالیف جن کا سبب ایسے حادثات ہیں جن کا وہ ذمہ دار نہیں گردانا جا سکتا اور جو اس کے اختیار سے باہر ہیں ۔

انسان کو اختیار عطا کیا گیا ہے ۔ اگر وہ کائنات کا محض ایک جزو ہوتا ، جو مقررہ قوانین کی پابند ہے ، تو یہ جماد ونبات سے کچھ مختلف نہوتا ۔ یہ اختیار ایک پر اسرار عطیہ ہے جو اس کو دیگر مخلوقات سے مختلف اور ساتھ ہی ان پر بالقوہ فرماں روا بناتا ہے اور ایک بے قید ارادہ فطرت کی

جبریت سے جس پر ضرورت حکمران ہو، کسطرح ابھرتا ہے، یہ کسی حکمیاتی مفروضہ سے نہیں سمجھا جا سکتا - لیکن یہ ایسا ناقابل انکار واقعہ ہے کہ خود اس کے رد میں قبول کا پہلو مضمر ہے، کیونکہ انکار کرنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اس کی تکذیب پر مجبور نہیں بلکہ وہ آزادی سے اس کی تردید کر رہا ہے -

انسان کی پوری زندگی اختیار کے مفروضہ پر مبنی ہے - ہمارا اخلاقی ذمہ داری کا احساس، ہماری پسندیدگی اور ناپسندیدگی، خود ہمارے اعمال اور دوسروں کے حرکات، ہمارے نظامات قانون، ہماری تجدیدات، اور ہماری جزا و سزا کی بنیاد سب اختیار و ارادہ کی آزادی پر مبنی ہیں - اگر ہم صرف کائنات طبعی کی پیداوار ہوتے تو ہمارا اختیار نہ ممکن ہو سکتا اور نہ قابل فہم - یہ اختیار ہی ہے جو ہمیں کائنات پر برتری بخشتا ہے اور ہم عالم مقاصد میں قدم رکھتے ہیں، جس کا تعلق عالم روحانی سے ہے - خدا مقتدر و آزاد ہے - جیسا کہ قرآن کی تعلیم ہے، اس نے ہمیں اپنی صورت پر پیدا کیا اور اپنی روح ہم میں پھونکی - لهذا اس نے ہم کو بھی آزاد پیدا کیا ہے - لیکن آزادی دو دھاری تلوار ہے - اس کا مطلب صحیح یا غلط راستہ اختیار کرنے کی صلاحیت ہے - انسان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خالق سے بھی رو گردانی کر سکتا ہے - خدا کے خلاف انسان کے اختیار کا اولین استعمال وہ ہے جسے دینیات میں ہبوط آدم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے - بحیثیت انسان کے اس کی زندگی کا آغاز اسی ہبوط سے ہوتا ہے جو اس کے اختیار کی علامت ہے - اگر انسان کو آزادی عطا کرنا ایک شفیق پروردگار کی

مرضی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس آزادی سے جو شر پیدا ہو، وہ خالق کی ہمہ خیریت میں کسی کمی پر دلالت کرے۔ ہم کٹھ پتلی اور مشین کی طرح کاملاً ہمہ خوبی ہو سکتے ہیں اور اپنے مقررہ مدارات پر مثل سیاروں کے صحت و باقاعدگی کے ساتھ گردش کر سکتے ہیں، یا ملائکہ کی طرح جو خدا کی نافرمانی نہیں کر سکتے ہم اس کی تقدیس میں زمزمہ سنج ہو سکتے ہیں، ۔ مگر انسان ارادہ کی آزادی سے ملائکہ پر برتری حاصل کر سکتا یا حیوانات سے بھی نیچے گر سکتا ہے۔ اگر وہ حیوانات سے کم تر درجہ پر آنا پسند کرے تو اس کے نتائج وہ برداشت کریگا۔ خدا اس کی ان عقوبتوں کا ذمہ دار نہیں گردانا جا سکتا۔ انسان کی تکالیف کی بابت قرآن کا انداز دو پہلو لئے ہوئے ہے۔ ایک وہ تکالیف ہیں جو انسان اپنی خود رائی سے قوانین فلاح و بہبود کو توڑ کر اپنے سر لیتا ہے۔ بد اعمالیوں کو تکالیف کا موجب قرار دینا خدا کی معقولیت پسندی اور خیریت کو ثابت کرتا ہے۔ لیکن ناواجبی تکالیف کی بابت کیا کہا جا سکتا ہے؟ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے نہایت بلند مرتبہ انسان بد کردار افراد اور موجودات کے ہاتھوں مصائب و آلام سہتے ہیں۔ اس قسم کی تکالیف کی توجیہ خدا پرستانہ نقطۂ خیال سے یہ ہے کہ یہ تکالیف روح کے تزکیہ کا باعث ہوتی ہیں۔ روح کو بلندی و رفعت درسگاہ مصائب و آفات ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ اس کے اعلیٰ صفات کو ابھارتی اور اس کے کردار کا امتحان لیتی ہیں۔ کردار کی تعمیر مزاحمتوں پر غلبہ پانے سے ہوتی ہے۔ ایک پاکیزہ روح یا تو دوسروں کی بد اعمالیوں کے سبب مصیبت کا شکار ہوتی ہے یا کائنات

کی کارگذاریوں کے باعث اسکو مصائب سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں حیات کے متعلق اس کا درست رویہ اس کے کردار کو پاکیزہ اور مستحکم کرتا ہے۔ روح کی پاکیزگی کا تصور ان دونوں قسم کے مصائب سے تعلق رکھتا ہے۔ ناواجبی تکالیف سے انسان اپنے میں صبر و برداشت کے صفات پیدا کرتا ہے۔ اگر وہ اس طرح سے اپنی قدر و قیمت ثابت کر دے تو یہ ناواجبی مصیبتیں خالص شر نہیں ہو سکتیں بلکہ خیر کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اگر خدا تمام حالتوں میں نیکی کے ساتھ لذت اور برائی کے ساتھ الم کو متعلق کر دیتا تو انسان کی روح شرافت کی ان بلندیوں پر نہ پہنچ سکتی جس کے لئے وہ مقدر ہو چکی ہے۔ اگر نیکی کا بدلہ ہمیشہ جسمانی مسرتوں کی صورت میں نقد دے دیا جائے، اور بدی کا بدلہ فی الفور جسمانی صعوبتوں کی شکل میں دیا جائے تو نیکی اپنے درجہ سے گر کر محض حصول لذت کا لین دین بن جائیگی۔ اگر مسرتوں کو اکٹھا کرنا ہی زندگی کا واحد مقصد نہیں تو پھر یہ دونوں قسم کی تکالیف امکانی نیکی ہیں۔ انسانیت کی بد اخلاقیاں اور سفاکیاں اسلئے موجود ہیں کہ ان کا مقابلہ کریں اور ان پر غلبہ پائیں۔ تاکہ ہم محض فطری وجود ہونے کے بجائے عروج و ترقی کر سکیں۔ جیسا کہ لانگ فیلو نے مناجات حیات میں نہایت خوبی سے ادا کیا ہے :-

تیری مسرتیں تمام، تیرے مصائب ومحن
مقصد زندگی نہیں، جادۂ زندگی نہیں
تیرے عمل سے تیرا 'کل' 'آج' سے برترو بلند
یوں ہو اگر تو تو کبھی خاسر زندگی نہیں

آنحضرت صلعم کی خدمت میں جب عرض کیا گیا کہ کون زیادہ مصائب و محن کا شکار ہوتا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ پیغمبر سب سے زیادہ تکالیف جھیلتے ہیں* - آخر اس کا کیا سبب ہے کہ جو سب سے زیادہ مصیبتیں جھیلتے ہیں وہی سب سے زیادہ خدا کی بھلائی اور خوبی پر راسخ ایمان رکھتے ہیں؟ لیکن ایک منکر انسان جو کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا، اور اس کو اپنے حق میں نا انصافی سمجھتا ہے، وہ زندگی پر نا معقولیت کا الزام لگا دیتا ہے، اور تھوڑے سے ایمان والا شخص اپنے ایمان میں تزلزل کے سبب خدا کی همه توانی اور همه خیریت میں شک کرنے لگتا ہے۔ مصائب کے ان دو گونہ مقصد پر ایمان لانے سے کہ انسان یا تو قوانین کی خلاف ورزی سے مستوجب سزا ہوتے ہیں یا شر کا صبر و برداشت سے مقابلہ کرکے اس پر غلبہ پانے اور صحیح طریقہ پر اس کو رفع کر دینے کی کوشش کرتے ہیں، یہ شک دل سے دور ہوجاتا ہے کہ خدا خیر نہیں ہے یا اگر اس کا وجود ہے تو وہ شر پر کوئی اختیار نہیں رکھتا - یہ شک متزلزل ایمان کی وہ شکل ہے جو جے - ایس - مل نے حیات کے غلط علم اور تنگ نظر منطق سے حاصل کیا تھا - اور اسی لئے اس کا یہ خیال تھا کہ خدا، جو خود خوبی ہے اور خوبی کے لئے کوشاں بھی، اس کے وجود کا ثبوت موجود ہے، لیکن وہ قادر مطلق یا اتنا کافی مقتدر نہیں ہے کہ شر کو نکال باہر کر سکے -

* قلت یا رسول اللہ ای الناس اشد بلاءً قال الانبیاء—ترمذی

باب هشتم

مذهب کا اسلامی تصور

اسلام کی رو سے مذہب کا کیا مفہوم ہے ؟ اس سوال کا جواب خود لفظ اسلام سے ہمارے لئے آسان ہوجاتا ہے ۔ اسلام کے معنی امن اور تسلیم کے ہیں ۔ زندگی کا مقصد بہتر زندگی بسر کرنا یا بہ الفاظ دیگر فلاح و بہبود ہے ۔ فرض نمازوں کے لئے دن اور رات کے مختلف اوقات میں مؤذن پکارتا ہے کہ " نماز کی طرف آؤ ! فلاح کی طرف آؤ ! " مقصد حیات، خود حیات ہے اور وہ اس طریقہ پر بسر کرنی چاہئے کہ تدریجاً پاکیزہ ، صالح ، ہم آہنگ ، آراستہ ، مستحکم اور بلند تر ہوتی رہے ۔ جیسا کہ لانگ فیلو نے نہایت خوبی کے ساتھ اس خیال کو پیش کیا ہے ، زندگی کا مقصد لطف اندوز ہونا یا مصائب برداشت کرنا نہیں بلکہ زندگی اس طرح بسر کرنا ہے کہ ہر فردا ہمیں امروز سے بہتر حالت میں پائے ۔ اصلاح ذات حیات کا حقیقی مقصد ہے ۔ ظاہر و باطن میں حیات تصادمات سے معمور ہے اور اس کا ہر پہلو ایک رزمگاہ ہے ۔ خیر و شر ، یا خوبتر سے خوب کی باہمی آویزش انسانی وجود کی لازمی اور ناگزیر حقیقت ہے اور یہ اس کے تحت کی مخلوق سے زیادہ وسیع پیمانہ پر خود اس میں جاری ہے ۔ حیات اپنی مظہری ترتیب میں ہم آہنگیوں اور ایسے ہی بے آہنگیوں کو پیش کرتی ہے ۔ انسان کے وجود کی غایت اور تمام اخلاقی کشمکش کا مقصد ان بے

آھنگیوں پر غالب آنا ھے۔ یا تو انہیں درست کیا جائے یا پھر انہیں ختم کر دیا جائے۔ امن کا آرزو مند ھونا انسان کی فطرت میں داخل ھے، اس لئے ھر وجود اسلام یا امن کا آرزو مند ھوتا ھے۔ امن، خوشحالی اور مسرت، یہ تینوں ایک ھی حالت کے مختلف نام ھیں۔

لفظ اسلام کا دوسرا مفہوم، یعنی تسلیم و خود سپردگی، اپنے پہلے مفہوم سے قریبی تعلق رکھتا ھے۔ یہ اس حالت کی تعریف کرتا ھے جس میں امن بطور صلہ حاصل ھو چکا ھو۔ اب یہ سوال پیدا ھوتا ھے کہ ھم سے جو تسلیم و اطاعت کےلئے کہا جاتا ھے تو آخر یہ سر اطاعت کس کے آگے خم کیا جائے؟ اسلام کہتا ھے کہ یہ تسلیم و اطاعت خدا کے لئے ھے اور پھر خدا کی تعریف یوں کرتا ھے کہ وہ جس کی اطاعت کرنی چاھئے۔ چنانچہ خدا کا تصور اگر محدود یا غلط ھوگا تو پھر اطاعت کا انداز بجائے فلاح و بہبود کی طرف لیجانے کے زندگی کو محدود اور برگشتہ کر دیگا۔ ھر پرستار اپنی موضوع پرستش شئے کا رنگ اختیار کرتا ھے۔ خدا، جس کی اطاعت کا ھمیں حکم دیا گیا ھے، وہ دانا، عاقل، اور مہربان ھے اور اس کا خاص وصف شفقت و رحمت ھے۔ طریق و عمل میں ایسے خدا کی اطاعت ھماری زندگیوں کے انضباط پر دلالت کرتی ھے۔ اسلام کی رو سے خدا کوئی مذھبی عقیدہ نہیں بلکہ ایک نمونہ اور زندگی کو منضبط کرنے والی قوت ھے۔ خدا ھمارے اعلیٰ اقدار کا کفیل ھے۔ جب قرآن کہتا ھے کہ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کرے، عبادت اسکے حقیقی مفہوم میں، تواسکے یہ معنی نہیں ھوتے کہ صرف زبانی حمد و ثنا اور اپنے فائدہ کے لئے التجائیں کی جائیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ھوتا ھے کہ مشیت ایزدی

کے مطابق زندگی کو ڈھالا جائے ۔ ہر اچھا کام ایک عبادت ہے ۔ اگر ہم اپنی ذات سے وفا داری کر رہے ہیں اور اپنے خاندان اور ہمسایوں کے ساتھ مہربان ہیں تو ہماری زندگی عبادت گذارانہ ہے ۔ کیونکہ ہم اپنی فطرت کے نصب العین کی تکمیل کر کے خدا کی مشیت کی اطاعت کر رہے ہیں ، جس کا ظہور خود ہماری فطرت میں موجود ہے ۔ اگر خدا حق ہے ، تو حق کی تلاش گویا خدا کی اطاعت ہے اور اس لئے یہ ایک عبادت گذارانہ عمل ہے ۔

امن اور خوشحالی کے حصول کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ہم خود اپنے وجود میں ہم آہنگی پیدا کریں ۔ انسان متعدد جذبات و عواطف سے سرفراز کیا گیا ہے ، جو اس کی زندگی کے لئے تعمیری چیزیں اور حرکت دینے والی قوتیں ہیں ۔ ان میں بذاتہٖ شر نہیں ہے ۔ کیونکہ ایک صاحب لطف و کرم ذات شر کو پیدا نہیں کرتی ۔ قرآن اس کا اظہار کرتا ہے کہ خدا نے کوئی چیز بیکار پیدا نہیں کی ، لہٰذا انسان کی جبلتیں شیطانی قرار نہ دی جائیں ۔ انسان کی تخلیق کسی فطری معصیت پر نہیں ہوئی جو اس کو وراثتاً اپنے مورث اعلیٰ آدم سے ملی ہو ۔ یہ زندگی کو بنانے کے اسباب اور اختیار کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے ، اور خدا نے اسکو اعمال کی متبادل صورتیں دکھلا دی ہیں ۔ اس کا اختیار معصیت آلود اور شیطانی اس وقت بن جاتا ہے جب اس کی کوئی جبلت خود غرض اور خود سرہو جاتی ہے ۔ ہر قسم کی خودسری عقل کے مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہوتی ہے ، کیونکہ عقل ایک امتیازی استعداد ہے جو انسان کو عطا کی گئی تاکہ وہ اپنی جبلتوں کو اس کے تابع بنا کر کام میں لائے ۔ انسان میں عقل ایک اظہار

ربانی ھے اور اس کی اطاعت گویا خدا کی اطاعت ھے۔ چنانچہ اندرونی سکون حاصل کرنے کی صرف ایک ھی راہ ھے، یعنی فرمانبرداری کا کوئی عمل۔ ھم سکون و اطمینان صرف اس وقت حاصل کرتے ھیں جب ھماری جبلتیں عقل کے تابع ھوں۔ صرف عقل اور نیک زندگی کے ذریعہ ھم سکون و طمانیت حاصل کر سکتے ھیں جو ھماری فطرت کی اندرونی خواھش ھے۔

جو انسان اس طرح خود اپنے آپ سے امن و امان میں رھتا ھے، وہ اپنے ھمسایوں کے ساتھ بھی چین اور آرام سے رھتا ھے، جیسا کہ شیکسپیر نے کہا ھے: ''تو اپنے آپ سے وفادار رہ، اور جیسے دن کے بعد رات یقینی ھوتی ھے اس کا لازمی نتیجہ بھی یہ ھو گا کہ تو کسی دوسرے کے ساتھ دغا نہ کرے گا''۔ صرف وھی انسان اپنی ذات کے ساتھ وفا کر سکتا ھے جس کی زندگی کی رھنمائی عقل اور نیکی کرتی ھیں۔ اپنی خواھشات کو عقل کا مطیع بنا لینا، کسی بیرونی قوت کے آگے جھکنا نہیں ھے بلکہ خود اپنی برتر حیثیت کی اطاعت کرنا ھے اور اس کی برتر حیثیت الوھیت کی حامل ھے۔ قرآن کہتا ھے کہ ھم نے انسان کو پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی*۔ اس لئے اسلام کی رو سے خدا کی اطاعت کسی بیرونی قوت کے آگے جھکنا نہیں بلکہ اپنی اس فطرت کے تقاضوں کو ماننا ھے، جس پر خدا نے ھم کو پیدا کیا ھے۔ قرآن میں نیکی کے قوانین کو خدا کے مقرر کردہ حدود سے تعبیر کیا گیا ھے۔ یہ خود ھمارے لئے فلاح و بہبود کے قوانین ھیں۔ اگر کوئی نیک ھے تو خود اپنے لئے ھے، اور اگر کوئی برائی کرتا ھے تو اس کا وبال بجز اس کی ذات کے کسی دوسرے پر نہیں پڑتا۔ قانون

* ونفخ فیہ من روحہ—سجدہ ۹

کی خلاف ورزی کا اثر قانون یا قانون بنانے والے پر نہیں پڑتا بلکہ اس خلاف ورزی کی سزا اس کے توڑنے والے کو بھگتنی پڑتی ھے۔ عیسائیوں کی دینیات فطری معصیت، نیابتی سزا اور مبتلائے مصیبت خدا کے عقیدے پیش کر کے اس کے ساتھ ھی بطور علاج مسیح کے کفارہ کا تصور پیش کرتی ھے۔ لیکن قرآن ان عقائد و اصول کی پر زور تردید کرتا ھے۔ اس کے نزدیک ایک طرف یہ خلاف عقل اور نظام اخلاق کے منافی ھے اور دوسری طرف خدا، انسان، اور خود حضرت مسیحؑ کی توھین ھے۔

انسان کی تخلیق اس طرح پر ھوئی ھے کہ وہ امن و آسودگی کے لئے آرزو اور کوشش کرتا، اور آزاد ھونے کی بھی خواھش رکھتا ھے۔ کسی نصب العین کی متابعت ھی انسان کو آزادی عطا کر سکتی ھے۔ ایک بد کردار یہ سمجھتا ھے کہ وہ فطری قوانین کے توڑنے میں آزاد ھے اور قانون کو توڑ کر یہ گمان کرتا ھے کہ اس نے اپنی آزادی کا ثبوت دے دیا۔ لیکن وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر رھتا ھے کہ قانون کی شکست خود اس کی اپنی شکست ھے۔ نیکی خود اپنی جزا اور بدی اپنی آپ سزا ھے۔ جیسا کہ ایمرسن نے کہا ھے: "چور خود اپنے ھی پاس سے چوری کرتا ھے۔"

اسلام کی رو سے مذھب بجز اس کے کچھ اور نہیں کہ انسان عملاً اور موثر طریقہ سے خدا پر ایمان لائے۔ اس کو کائنات اور حیات انسانی میں نظام عقل و اخلاق کا خالق اور ان قوانین کا مبداء اور نافذ کنندہ سمجھے جو اقدار کے تحفظ اور فلاح و بہبود کے قیام و ترقی کا

ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس کا فرض ہے کہ وہ خدا کو خود اپنے اندر اور بیشتر کائنات میں دریافت کرے۔ اسلام کا یہ اعتقاد ہے کہ ایسا خدا حقیقتاً وجود رکھتا ہے اور نظری وعملی طور پر مشاہدہ اور عقل کے ذریعہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔ ہم فطرت کے قوانین سے بذریعہ ادراک و اطاعت استفادہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی اخلاقی اور معاشری فطرت کو سمجھیں تو ہم ان قوانین کو بھی معلوم کر سکتے ہیں جن کی اطاعت ہماری خوشحالی کی ضامن ہوگی۔ چنانچہ اسی مفہوم میں اسلام کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں۔

کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ایک سائنسدان خدا کی طرف رجوع کئے بغیر قوانین فطرت کو دریافت کرتا ہے اور اسی طرح اخلاقی نظام اور قوانین فلاح و بہبود کی بابت بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا پر ایمان کی شرط کے بغیر بھی ان کا ہونا ممکن ہے۔ کیا ہم سائنسدان کو دہریہ اور ایک معلم اخلاق کو منکر خدا نہیں پاتے؟ اسلام اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ یہ لوگ بھی خدا کی جستجو میں ہیں، اور خدا کے قوانین کی بلا جانے بوجھے پیروی کرتے ہیں۔ صداقت و حقیقت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو منواتی ہے، حالانکہ تم ان کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ اگر نیکی کی ضرورت پر کسی کو ایمان ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے ذریعہ ہم آہنگی، اطمینان اور ترقی حاصل ہوتی ہے تو اس حد تک وہ صداقت پر اپنی زندگی بسر کر رہا ہے اور خدا کی اطاعت بلا پہچانے کر رہا ہے۔ اگر کوئی سائنسدان اس مفروضہ پر آگے قدم بڑھاتا ہے کہ کائنات عقل و قانون کے تابع ہے، ہیولٰی اور اتفاق کی نہیں، تو اس نے بھی خدا

کی وحدانیت کی تجلی اس کی مخلوق میں پائی ہے ۔ اسلام کے بموجب اس کی یہ حکمیاتی تحقیق ایک عبادت گذارانہ عمل ہے ، کیونکہ یہ بات سینکڑوں جگہ قرآن میں دھرائی گئی ہے کہ ارباب علم و صلاح وہ لوگ ہیں جو مخلوقات کی معقولیت میں غور و فکر کرتے ہیں ۔ مطالعۂ فطرت اور خدا پر ایمان میں بس تھوڑا ہی فاصلہ رہ جاتا ہے ۔ اسلام کہتا ہے کہ انسان کی تلاش و جستجو پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ وہ خدا تک رسائی حاصل نہ کرے ۔ اسلامی خدا پرستی میں اخلاقیت اور تمام انسانی اقدار کائناتی اعانت و استعداد حاصل کرتے ہیں ۔ تمام سچائیاں اگر اپنے اصل مرجعوں کی طرف پھیری جائیں تو وہ بالآخر خدا کی طرف راجع ہونگی ۔ خدا پر ایمان زندگی کو حقیقی و اصلی بناتا ہے اور اس کو ایک استحکام عطا کرتا ہے ۔ اگر انسان صداقت ، حسن اور خوبی پر اعتقاد رکھتا ہے ، لیکن ان کی معروضی اور ابدی حقیقت پر یقین نہیں لاتا تو اس کے اس ایقان کے لئے کوئی مستحکم اساس نہ ہوگی ۔ انسان تلاش حق میں حقیقتاً خدا ہی کی جستجو کرتا ہے ۔ اس لئے ایک سچا مذہب صرف یہی ہے کہ ایک ہمہ دان اور ہمہ تواں خوبی پر یا تحفظ اقدار پر ایمان لایا جائے ۔ مقصد اس ہم آہنگی کا آخری حصول ہے جو کائنات اور اس ہستی کے ساتھ سازگار و موافق ہو جس کی یہ کائنات مظہر ہے ۔ خدا کے قوانین کو سمجھنا اور ان کی اطاعت کرنا ، اور ان سے زندگی کا انضباط و اتحاد اور ترفع حاصل کرنا ہی زندگی اور تمام سچے اور صحیح مذاہب کا مقصود ہے ۔ اس کے سوا

کوئی اور مذہب سچا نہیں ہوتا۔ جہاں یہ چیز پائی جائیگی وہاں خدا کی صداقت اور خدا کی سکینت ہوگی۔ اس لئے قرآن کہتا ہے کہ جو کوئی خدا پر ایمان لاتا ہے اور اپنی ہستی کو خدا کی اطاعت کی طرف رجوع کرتا ہے، وہ سچائی پاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خوف اور غم سے آزاد ہیں۔

مذہبی زندگی سپردگی کی زندگی ہے۔ یہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے، شخصی خواہشات کو لا شخصی عقل کے، بے قدر کو قابل قدر کے، دنیوی کو اخروی کے اور جزوی کو کلی کے تابع کرنا ہے۔ خدا پر ایمان ایک غیر فانی کا ادراک ہے۔ اور چونکہ علم صحیح بالواسطہ یا بلا واسطہ عمل سے تعلق رکھتا ہے اسلئے تمام زندگی اس سے ہدایت یاب اور مبدل ہوجاتی ہے۔ تمام علم ایک مضمر قوت ہے اور عاقل و مہربان کا حقیقی علم زندگی کو عقل کل کے ذریعہ عقل و محبت کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ اس مفہوم میں سپردگی زندگی کے تحفظ اور ترفع کے معنی رکھتی ہے۔ اسلام کے معنی اسی عقیدہ اور طرز عمل کے ہیں، اور باقی تمام اسی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جو کوئی اس کے خلاف جاتا ہے وہ اپنی ہستی کو ذلیل اور تباہ کر دیتا ہے۔ اس لئے خدا پر ایمان، تخمین و ظن یا محض مفروضہ نہیں ہے، اور نہ یہ کوئی مذہبی عقیدہ کہلایا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ موت اور زیست کا سوال ہے۔ ایمان لاؤ اور زندہ رہو۔ یا ایمان نہ لاؤ اور تباہ ہو جاؤ۔ کثرت پرستی یا خدا کے علاوہ دوسری ہستی یا ہستیوں کی پرستش کے خلاف قرآن کا جوش غضب ایک اذعانی مسلک کی دوسرے مسلک کے خلاف لڑائی یا کسی الہیاتی نظریہ کی دوسرے نظریہ پر ترجیح نہیں ہے۔ حق یا حسن یا خوبی کی تلاش بالآخر

صحیح اور فوق الذات حقائق کی تلاش ہوتی ہے، اور یہ تمام اصلاً ایک ہیں۔

ایمان کے اصل اصول بیان کرتے وقت قرآن اکثر اعمال صالحہ کو ان کے ساتھ ملا کر بیان کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کا محض لفظی اقرار یا مبہم ذہنی تصور ناکافی ہے۔ اگر علم و رائے کے درمیان قدیم یونانی فرق کو اختیار کیا جائے، تو ایسا ایمان جس سے اعمال صالحہ صورت پزیر نہوں اور اس میں عمل کے لئے قوی محرک بننے کی صلاحیت نہو تو وہ محض ایک رائے ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم قرآن میں بھی مسلم اور مومن کے درمیان یہی فرق پاتے ہیں۔ مسلم وہ ہے جو عقائد اسلام کو مانتا اور اس کے قوانین و رسوم کی پیروی کرتا ہے۔ اور وہ اس طرح مسلم برادری کا ایک رکن ہوتا ہے۔ ایمان و اعتقاد کچھ اس سے زیادہ ہے۔ وہ قلب میں داخل ہو کر زندگی کو اندر سے ڈھالنا شروع کرتا ہے۔ باطنی اعتقاد کے بغیر ظاہری پابندی کم قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اسلام خدا پر ایمان کو مذہب کا حقیقی باطن قرار دیکر اس کو پھیلاتا اور ان لازمی نتائج کو اس سے وابستہ کرتا ہے، جو اس سے رونما ہوتے ہیں۔ اگر اس بنیادی ایمان سے یہ نتائج حاصل نہو سکیں تو پھر خود ایمان کے اندر کچھ نہ کچھ خامی موجود ہوگی۔

قرآن کی رو سے خدا پر ایمان لانے سے جو لازمی نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) اگر خدا کا وجود ہے تو وہ ہم سے بشمول ہماری ذات کے کسی اور چیز سے زیادہ قریب تر ہے۔ یہ قربت راست وجدان اور تجربہ کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ اس چیز سے پیدا ہوتا

ہے کہ عبادت خدا تک پہنچنے کا حقیقی اور مؤثر ذریعہ ہے۔ اس قربت کا حصول، جس کا مطلب قرآن کے نزدیک رویت الٰہی سے ہے، ان لوگوں کو بطور صلہ ملنے کا وعدہ کیا گیا ہے جو پرہیزگارانہ زندگی گزارتے ہیں۔ خدا سے ربط و تعلق ہمیں بلند کرتا اور ہمارے تمام نقائص دور کر دیتا ہے، کیونکہ وہ نور اور حیات کا سر چشمہ ہے۔ وہ اس انسان کی روح میں نفوذ کرتا ہے جو اپنے قلب کو اس کی پذیرائی کے لئے کھول رکھتا ہے۔ عبادت اپنی اعلیٰ ترین صورت میں خدا کی یاد ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم زندگی کے نصب العین اور اعلیٰ اقدار کو اپنا مطمح نظر بنالیں۔ خدا اور انسان کا تعلق یک طرفہ نہیں بلکہ یہ ایک باہمی ارتباط ہے۔ ایک ندا سنی جاتی اور اس پر لبیک کہا جاتا ہے خواہ اس سننے اور جواب دینے کا طریقہ ہمارے فہم میں نہ آسکے۔ تمام حقیقی عبادات، مادی یا انفرادی فوائد یا ہماری نفسانی خواہشات کی تکمیل پذیری کے لئے نہیں ہیں، بلکہ ان سے مقصود صراط مستقیم پر ہدایت یاب ہونا ہے۔ یہ ایک زیادہ روشنی کی تمنا ہے۔ جولوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ عبادت پر ضرور یقین کرتے ہیں۔ کیونکہ قبول و اجابت سے عاری ایک لا شخصی ذات مطلق مابعد الطبیعات کی پیداوار ہے، جس کا مذہبی زندگی میں کوئی مقام نہیں۔

(۲) اگرچہ تمام دنیائے تخلیق خدا کے روحانی پیامات سے مملو ہے، جسے قرآنی اصطلاح میں آیات اللہ کہا گیا ہے، اور عقل اپنی خالص صورت میں ایک زبردست رہنما ہے، لیکن قرآن ایک اور ربانی ہدایت کے طریقہ کو بتلاتا ہے، جسے وحی کہتے ہیں۔ یہ ان کو عطا ہوتی ہے جو خاص

قسم کی روحانی برتری کے حامل ہوتے ہیں۔ جس طرح عقل حواس کی تکمیل کرتی ہے اسی طرح وحی عقل کی دستگیری اور ساتھ ہی ساتھ اس کی تکمیل کرتی ہے۔ عقل صرف سمجھتی ہے، لیکن وہ شخص جو وحی سے سرفراز کیا جاتا ہے، بلا واسطہ حقائق کو معلوم کرتا ہے اور اس کے لئے غیب ایک جانی بوجھی چیز ہوتا ہے۔ وہ اس کا ادراک ان صلاحیتوں کے ذریعہ کرتا ہے جو دوسروں کے مقابلہ میں اس میں زیادہ مکمل ہوتے ہیں۔ جس طرح مختلف علوم و فنون میں اختراعی قابلیت کے اشخاص پیدا ہوئے ہیں، جن کے مخصوص وجدان اور ادراک کے سبب حقیقی ترقیاں ہوئی ہیں، ایسے ہی روحانی صلاحیتوں کے لوگ بھی ہوتے ہیں، جن کی قوتیں عام لوگوں سے سربرآوردہ ہوتی ہیں۔ اگر خدا کا وجود ہے اور ہدایت اس کے لئے لازمی اوصاف میں سے ایک ہے، تو وہ ضرور ایسی منعم علیہ ہستیوں کو پیدا کرتا ہے جو اس کی طرف ہدایت کرنے کی خدمت انجام دیتی ہیں۔ روحانی زندگی پند و موعظت سے زیادہ نمونہ و مثال کے ذریعہ ترقی کرتی اور بلند ہوتی ہے، اس لئے انسانیت روحانی پیشواؤں کی سخت منتظر رہتی ہے۔ اس قسم کے روحانی مکمل نمونے انبیاء کہلاتے ہیں۔ مہربان اور ہدایت دینے والے خدا پر ایمان سے لازمی نتیجہ کے طور پر پیغمبروں پر ایمان پیدا ہوتا ہے۔

(۳) قرآن نبوت پر ایمان کے ساتھ وحدت نبوت اور وحدت دین کا اعتقاد وابستہ کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمام اقوام میں انبیاء مبعوث ہو چکے ہیں، اور سب پیغمبروں کا بنیادی پیغام ایک ہی تھا، کہ تمام لوگ ایک قادر مطلق اور مہربان خدا کو خالق و قیوم سمجھیں اور باہم

نیکی و عدل کریں نیز ان کا یہ ایمان ہو کہ وہی حقیقی مالک ہے، وہ اس کو مثل مقتدر اعلیٰ کے تسلیم کریں اور سوائے اس کے کسی دوسرے کی پرستش نہ کریں ۔ قرآن نے مختصراً ان پیغمبروں کے حالات بیان کئے ہیں جو ایک ہی پیغام پہنچاتے رہے ہیں۔ تمام بڑے مذاہب نے ایک ہی قسم کی اساسی صداقتوں کی تبلیغ کی ہے ۔ مختلف انبیاء کی تعلیمات کا اختلاف ان طریقوں، قاعدوں اور رسموں کا اختلاف ہے جو مختلف زمانوں اور بدلے ہوئے حالات کے سبب رونما ہوتے رہے۔ مذہب کی روح وحقیقت ہمیشہ ایک ہی رہی اگرچہ جسم و لباس بدلتا رہا۔ آنحضرت صلعم کی نبوت پر ایمان لانے میں ان تمام پیغمبروں پر ایمان لانا شامل ہے جن کے الہامات پر آپ نے اپنی مہر تصدیق ثبت فرمائی۔ آپ نے اصل کو نقل سے جدا فرما دیا ۔ آپ نے تمام کتب سماوی کا اس حد تک احترام کیا جہاں تک کہ انہوں نے خدا کی وحدت اور انسانوں کے لئے انصاف کی تعلیم کو اپنے اندر برقرار رکھا تھا ۔ لیکن کسی ایسی چیز کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار فرمایا جو اس اعتقاد کے خلاف جاتی تھی یا جو خدا اور انسان کے لئے باعث توہین تھی ۔

(۴) عالم غیب میں ایسی ہستیاں ہیں جو خدا کے کاموں کو اس کی مشیت کے مطابق پورا کرتی ہیں ۔ یہ ملائکہ کہلاتے ہیں ۔ ملائکہ کی حقیقی نوعیت اور ان کے کاموں کا طریقہ ایک عام انسان کے لئے کبھی براہ راست تجربہ کا معاملہ نہیں ہو سکتا ۔ انبیاء اور اولیاء ایسے عوامل کو کار گذار دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں ۔ فطرت ان ہی وسیلوں سے کام کرتی ہے جو خدا کی مشیت کی تکمیل کرتے ہیں ۔ ہم کائنات میں لاتعداد وسائل کو کار فرما دیکھتے ہیں، لیکن جیسا کہ ہم

نے آغاز میں کہا ہے، یہ اسلام کی بنیادی شرط ہے کہ زندگی جیسی کہ دیکھی جاتی اور معلوم کی جاتی ہے، وہ مجموعی زندگی نہیں ہوتی۔ غیر محسوسات کا بھی وجود ہے اور وہ محسوسات سے بدرجہا زیادہ ہیں۔ اگر غیر مرئی نیک و بد ہستیاں موجود ہیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ نیکی کے عوامل ملائکہ کہلاتے ہیں۔ نبوت کے تجربات میں وہ اسقدر نمایاں ہیں کہ ان کی حقیقت اور وظائف کی بابت ایقان اس قسم کے تجربات کا جزولاینفک بن جاتا ہے۔

(۵) تخلیق کرنے والے اور حفاظت کرنے والے خدا پر ایمان سے حیات بعد الممات کا اعتقاد بھی پیدا ہوتا ہے۔ انسان کی حیات ایک قابل مضحکہ چیز بن جاتی ہے اگر اس کا آغاز و انجام صرف جسم ھی کے ساتھ سمجھا جائے، اگر انسان کی خودی آنی و فانی ہو تو اس کے تمام اقدار خاک میں مل جاتے ہیں۔ اگر حفظ ذات قانون ہستی ہے اور فطرت حیرت انگیز اور پر اسرار طریقوں سے اپنا تحفظ تمام حالت بہ حالت تبدیلیوں میں کرتی رہتی ہے، اور اگر کائنات کے اصلی عناصر باوجود لگاتار مظہری تغیرات کے برقرار رہتے ہیں، تو یقیناً انسانی خودی کے لوازمات بھی قائم و باقی رہینگے۔ یہ اپنی انفرادیت کو تمام ترقیات و تنزلات میں ضرور قائم رکھیگی۔ تمام زندگی نشوونما پاتی ہے اور کوئی ضروری چیز فنا نہیں ہوتی اور جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا ہے۔ اقدار کی حفاظت پر اعتقاد تمام مذھبی عقیدہ کی اصل ہے۔ سب سے زیادہ قابل قدر وجود، جس کو ہم جانتے ہیں، انسانی انا ہے۔ انسان کے انا کی زندگی خیر و شر کی باھمی کشمکش کی ایک تمثیل ہے۔ جب کبھی وہ فکر یا احساس یا عمل کرتا ہے تو وہ اپنی زندگی کو بھلائی یا

برائی کے لئے بدلتا ہے۔ قرآن کہتا ہے ہر خوبی اور ہر بدی جو انسان سے سرزد ہوتی ہے، وہ نہایت باریک بینی اور دقیقہ سنجی کے ساتھ شمار اور وزن کی جاتی ہے۔ روح کی ترازو ایک نہایت حساس میزان ہے۔ روح میں پے درپے تبدیلیاں ہماری زندگیوں کے، جو ہم بسر کرتے ہیں، خود بخود پیدا ہونے والے انفعالات ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ خودی کی زندگی جسم کے تحلیل ہونے کے بعد بھی جاری رہتی ہے اور اپنے مجموعی تاثرات کو جو وہ زندگی میں رکھتی تھی، دیگر سطحات وجود پر اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ قانون جزا وسزا مستقلاً اس زندگی میں بھی اپنا کام کرتا رہتا ہے اگرچہ یہ ہمیشہ ہم پر ظاہر نہیں ہوتا۔ موت کے بعد کی زندگی میں یہ انفعالات اور بھی نمایاں ہو جائینگے، شاید یہ اس لئے ہوگا کہ مادی جسم کا غلاف اتر جانے سے روح کی بصیرت زیادہ تیز ہو جائیگی۔ حیات بعد الممات، نظام اخلاق اور قانون مکافات ومجازات پر اعتقاد ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر حفاظت کرنے والے خدا کی ہستی موجود ہے تو زندگی کا تحفظ بھی، بہتر سے بہتر وجود میں نشوونما پانے کے لئے، ضرور ہونا چاہئے۔ یہانتک کہ تمام آلودگیاں دور ہو کر روح کی بالقصد تفویض اس کی فطری حالت بن جائے۔ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ دوزخ بالآخر خالی ہو جائیگی۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں، قرآن ایک مہربان خدا پر ایمان کو مذہب کا لازمی عقیدہ قرار دیتا ہے اور ایمان کے دیگر لوازمات جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ منطقی طور پر خود اس اعتقاد سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ایک مہربان خدا، جو 'رب' ہے، اپنا وجود رکھتا ہے تو اخلاقی نظام کا ہونا

بھی ایک لازمی حقیقت ہے۔ اگر اخلاقی نظام ایک حقیقت ہے تو نیک و بد کے اثرات ضرور پیدا ہونگے، جنہیں ہم جزا و سزا سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر زندگی جسم کے ساتھ فنا ہو جائے تو اخلاقی نظام کی کوئی حقیقت نہوگی اس لئے حشر و آخرت کا ہونا ضروری ہے۔ نیکی کے لئے خدا کے ذرائع ہونے ضروری ہیں اور یہ ملائکہ کہلاتے ہیں۔ جو ہمارے معمولی حواس سے دیکھے نہیں جا سکتے، لیکن جن کے کام ان لوگوں کے لئے علم وتجربہ کا معاملہ ہیں جو اعلیٰ روحانی بصیرت کے حامل ہیں۔ خدا نے مثالی نمونے پیدا کئے جنہیں انبیاء کہا جاتا ہے تا کہ یہ بنی نوع انسان کو پند و موعظت اور اپنی مثال کے ذریعہ خدا کی طرف رجوع کریں۔ ان انبیاء کی تعلیمات میں کوئی بنیادی تناقص نہونا چاھئے، کیونکہ ان سب کو ایک ہی خدا کی طرف سے وحی کی گئی ہے اور وہ انسانیت کو ایک ہی بنیادی صداقت پر پہنچانا چاہتا ہے۔ اس انعام سے تمام انسانیت کو سرفراز ہونا چاھئے، اس لئے تمام بڑے مذاہب بھی اصلاً اور اساسی طورپر سچے ہونے چاھئیں۔ اور جن باتوں میں یہ مختلف ہوں وہ یا تو وقتی اور اتفاقی ہوں یا الحاق۔ یہی تمام سچے مذاہب کے لوازم ہیں اور یہی اسلام کے اصول ہیں۔ تمام مذاہب کا اصلی اور حقیقی عنصر، جس کی تمام انبیاء نے تبلیغ کی ہے، اسلام کہلاتا ہے۔ اگر خدا کا وجود ہے تو بجز اس کے کوئی دوسرا مذہب سچا نہیں۔ یہ وسیع ترین اور بہت ہی ہمہ گیر مذہب ہے۔ اس میں کوئی فرقہ پرستی یا مقامی قید نہیں۔ اگرچہ آنحضرت صلعم نے ایک مخصوص ترتیب و انضباط کے ساتھ ایک ملت کو وجود بخشا، جس کی زندگی کی نظم و ترتیب اصول انصاف کے مطابق کی گئی تھی، لیکن آپ نے کبھی

ان خدا ترس اور نیک انسانوں کوجو اھل ایمان کے دائرہ میں داخل نہوئے تھے، نجات سے محروم نہیں سمجھا ۔ خدا کے فضل و احسان کو اس طرح محدود کر دینے کا خیال آپ کے قلب مبارک میں نہیں آیا۔ یہودیوں نے آپ کی سخت مخالفت کی اور اسلام کو عین اس کی طفولیت ھی میں ختم کر دینے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ۔ انہوں نے مشرکین کے ساتھ ساز باز کی اور آپ کو قتل کرنے تک کی تدبیر اختیار کی۔ چنانچہ آپ کو ان کے خلاف قوت استعمال کرنی پڑی ۔ یہاں تک کہ ان کی طاقت پاش پاش ھوگئی اور نونہال اسلام محفوظ ھوگیا ۔ لیکن آنحضرت صلعم نے حضرت موسیٰؑ کی تعریف میں کبھی کمی نہیں کی اور یہودیوں کی آسمانی کتاب کی مثل نور و ھدایت کے توصیف فرماتے رھے۔ یہودیوں میں نیک اور ایماندار اشخاص بھی کشادہ قلبی کے ساتھ داد تحسین پاتے رھے ۔ اسلام کا یہی رویہ حضرت عیسیٰؑ اور عیسائیوں کے ساتھ رھا۔ اسلام کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کی انتہائی قدر و منزلت ھے اور وہ کوشش کرتا ھے کہ ھر اس افترا کو جو انکی ذات سے منسوب ھے، دور کر دیا جائے ۔ چنانچہ وہ عقیدہ ابنیت ' فطری معصیت اور کفارہ کو دینیاتی گمراھی اور الحاقات سمجھتا ھے ۔ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت پر ایمان ھر مسلمان کا جزو ایمان ھے ۔ سچے عیسائی بھی اپنی ایمانداری' رحمدلی، خدا کے ساتھ محبت اور پر جوش عقیدت کے سبب مخلصانہ قدر و منزلت کے مستحق سمجھے جاتے ھیں' اگرچہ کہ راھبانہ تقشف کو بطور طریق زندگی و خدا رسیدگی کے نا پسند کیا گیا ھے، ھر چند کہ اسلامی ایمان کے لوازمات' اس کا قائم کردہ نظم و ضبط اور اس کے قوانین ایک مکمل اور تشفی بخش طریق زندگی کی حیثیت سے پیش کئے گئے ھیں' لیکن اس کے باوجود جو

لوگ اس نظام سے باہر ہیں اور دیگر نظامات اور ضابطوں کی پیروی کرتے ہیں، ان میں اگر ایمان کے اصول موجود ہیں تو وہ نجات سے خارج نہیں کئے گئے ہیں۔ ''ان الذین امنو و الذین ھادو والنصریٰ و الصابئین من امن باللہ و الیوم الا خرو عمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ؀''۔ جو لوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لائے، وہ ہوں، یا وہ لوگ ہوں جو یہودی کہلاتے ہیں، یا نصاریٰ اور صابی ہوں (کوئی بھی ہو، اور کسی گروہ بندی سے تعلق رکھتا ہو، لیکن خدا کا قانون نجات یہ ہے کہ) جو بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے کام بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائیگا۔ اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

یہ مذہب انسانیت کا واضح ترین اعلان ہے۔ قرآن میں کئی مقامات پر صرف خدا کو پر ایمان اور نیک زندگی کو نجات کے لئے ضروری بتلایا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے، بعض اوقات ضروری متعلقات مثلاً نظام اخلاق اور روز جزا پر ایمان، بھی اس کے ساتھ وابستہ کئے جاتے ہیں۔ یہ ایمان کی بنیادی چیزیں نہیں بلکہ فقہی اصول ہیں۔ تقلید پرستی اور مذہب کے ثانوی پہلوؤں پر زور دینے سے انسانیت باہم متخالف گروہوں میں بٹ جاتی اور مذہبی تعصب و تعذیب کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے جہاں تک ظاہری شکلوں اور رسوم کا تعلق ہے، مختلف قومیں مختلف سمتوں کی طرف اپنا رخ کرتی ہیں۔ مگر یہ چیزیں بنیادی لوازمات نہیں۔ اصل چیز تو اعمال صالحہ ہیں۔ جب مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ

نماز ادا کرتے وقت اپنا رخ کعبہ کی طرف پھیر لیا کریں تو ساتھ ہی اس کی صراحت بھی کر دی گئی کہ یہ پرہیزگاری کی کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ ''اللہ ہی کے لئے مشرق و مغرب ہے، تم جدھر بھی اپنا رخ کرو اس کو اپنے سامنے موجود پاؤ گے*۔'' اس میں شک نہیں کہ آنحضرتؐ نے جس اسلام کو پیش فرمایا اور جس پر عمل کر کے دکھلایا وہ محض ایک عقیدہ نہیں بلکہ ایک نظام حیات ہے، جس کے خود اپنے ضوابط بھی ہیں اور جماعتی تنظیم بھی۔ لیکن اس نظام میں کوئی سخت گیری نہیں ہے۔ بہت سی صورتوں میں یہ ایک ایسا آزادانہ نظام ہے جس میں مختلف حالات اور مختلف ضرورتوں سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے ضروری آزادی حاصل ہے۔ خالق کائنات یہ جانتا تھا کہ کل انسانیت کسی ایک نظام کی اس کی پوری تفصیلات کے ساتھ پابند نہ ہو سکیگی۔ قرآن میں یہ بار بار کہا گیا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو پورے انسانوں کو ایک دین پر جمع کر دیتا، مگر اس کی قدرت نے ایسا نہیں چاہا۔ مذہبی اعمال میں اختلاف تا ابد جاری رہیگا۔ بایں ہمہ دنیا کے تمام اقوام و ملل کو عالم گیر امن اور خیر خواہی کے لئے چند بنیادی چیزوں پر متحد ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ ''اے اہل کتاب! آؤ اس چیز کی طرف جو تم میں اور ہم میں مشترک ہے، یعنی یہ کہ خدا پر ایمان اور اس کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرانا†''۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام اپنے اعتقادات اور معمولات

* وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ—بقرہ—۱۱۵
† قل یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً—آل عمران ۶۳

کا ایک نظام رکھتا ہے، جو امتداد زمانہ کے باعث شدید تقلید پرستیوں میں مبدل ہوچکا ہے تاہم جس شخص کے پیش نظر ایمان کی بابت قرآن کے بنیادی اصول ہیں وہ کبھی اس حد تک تنگ نظر نہیں ہو سکتا کہ دوسرے مذاهب میں کسی خیر و خوبی سے یکسر انکار کر دے۔ یا ایسوں کی نجات کا منکرھو جو اگرچہ دوسرے مذہبی رسومات کی پیروی کرتے ہیں، لیکن ان میں تمام سچے مذاهب کی اصل موجود ہو یعنی خدا پر ایمان اور نیکو کاری۔ یہ انسانیت کا مذہب ہے جو تمام اقوام کو باہم جوڑتا ہے۔ یہ وہ مذہب ہے جس میں نہ کوئی اذعان ہے اور نہ چیستان، نہ اس میں کوئی توھم پرستانہ اعتقادات ہیں اور نہ اس کی دست گیری کے لئے کوئی قانون شکن ساحرانہ معجزات ہیں۔ ہر قسم کی عقلی ترقیوں کے لئے راستہ کھلا ہوا ہے۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا کبھی سائنس کے ثابت شدہ حقائق سے تصادم ہو سکے اور نہ اس میں کوئی ایسی چیز شامل ہے جس سے بنی نوع انسان کے اخلاقی ضمیر کو دھکا پہنچے۔ اس کے اصول استوار اور مستحکم ہیں۔ ان کا صرف استعمال بدل سکتا ہے اور وہ زندگی کی تبدیلیوں اور ترقیوں کے ساتھ ضرور بدلتے رہینگے۔

ایک منکر مذہب اخلاق پرست یہ کہہ سکتا ہے کہ محض اخلاقیت، حب نوع انسانی اور معاشری عدل ھی کیوں کافی نہیں ہے۔ اور اس کے ساتھ خدا پر ایمان کو کیوں شامل کیا جائے جس کا ثبوت عقل اور تجربہ سے دشوار ہے۔ اسلام اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ خدا پر ایمان حقیقت کا صحیح علم ہے۔ انسان حقیقت کو تلاش کرنے والا وجود ہے۔ اگر وہ زندگی کے

آغاز و انجام سے بے خبر ہو تو وہ اصلاً بے بصیرت ہے اور جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے، ایسا انسان تاریکی میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ صداقت نور اور حیات ہے اور جہالت ظلمت اور موت ہے۔ خدا پر ایمان کے بغیر انسان سچائی کی صرف جھلک دیکھتا ہے۔ ''وہ اس روشنی میں چند قدم چلتا ہے اور فوراً ٹھٹک کر اندھیرے میں ٹٹولنا شروع کر دیتا ہے''۔* اخلاقیت صرف اس اعتقاد کے ذریعہ اپنی وجہ جواز اور زندگی پر مضبوط گرفت حاصل کرتی ہے کہ محبت و انصاف تمام اقدار و موجودات کی روح ہے اور یہ حقیقت میں جاگزیں ہے۔ بغیر اس اعتقاد کے نیکیاں ایک ظلی نمود ہو جاتی ہیں اور پس منظر میں یہ رنجدہ احساس اس بات کا باقی رہتا ہے کہ تمام خود پسندی اور خام خیالی ہے۔ مذہب کہتا ہے صداقت اور نیکی فریب نہیں ہیں جو خوش فہمی پر مبنی ہوں، اور نہ یہ محض حیاتی وجود کی عملی اعانتیں یا انواع کی طبعی بقا ہیں۔ یہ بقا کے ضامن و کفیل ہیں، مگر ایک اعلیٰ نظام کے لئے یہ ابدی حقائق ہیں۔

ایمان اپنے وسیع مفہوم میں زندگی کی تمام خوبیوں پر مشتمل ہے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ ''ایمان کی ساٹھ سے زیادہ شاخیں ہیں اور حیا ان میں سے ایک ہے''†۔ دوسری حدیث میں ہم پاتے ہیں: ''ایمان کی ستر سے اوپر شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ یہ ہے کہ سوائے خدا کے کوئی قابل پرستش نہیں، اور ان میں سب سے ادنیٰ یہ ہے کہ راستہ سے کوئی ایسی چیز ہٹائی جائے جس سے کسی دوسرے کو نقصان

* وجعلنا له نوراً یمشی به فی الناس—انعام ۱۲۳
† الایمان بضع وستون شعبة والحیاء شعبة من الایمان—صحاح ستہ۔

پہنچنے کا اندیشہ ہو'' *۔ '' تم میں سے کوئی صاحب ایمان نہیں جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جو خود اپنے لئے پسند کرتا ہو''۔ † امام بخاریؒ نے آنحضرتؐ کی بہت سی ایسی احادیث جمع کی ہیں جن میں ایمان کی سادہ تعریف صرف اعمال صالحہ کو بتلایا گیا ہے ۔ اس لئے جب ایک انسان یا تو اپنی فطرت کے بل بوتے پر یا تربیت کے ذریعہ یا مفید معاشری اثرات سے راست باز اور نیک ہو جاتا ہے ، تو وہ ایمان کے ایک بہترین جز کا حامل ہوتا ہے ۔

اسلام پر اعتقاد کسی اذعان کا سیدھا سادہ اقرار نہیں ہے ۔ تمام اعتقادات کا تعلق عمل سے ہے ۔ صداقت وہ ہے جو عمل پیرا ہو ، اور اسلام کے نزدیک ہر وہ اعتقاد جس کا تعلق عمل سے نہ ہو ، روحانی طور پر بے قدر ہے ۔ عقائد اور ان کے مطابق اعمال ایک منظم کل کی تشکیل کرتے ہیں ۔ نیک اعمال ایمان کا جز بن جاتے ہیں ۔ اور ایمان کی متعدد شاخوں میں سے اچھے عمل ، اگرچہ ان کا کوئی الٰہیاتی پس منظر نہ ہو ، بجائے خود ایک حقیقی جز بن جاتے ہیں ۔ کوئی آدمی جو خدا پر ایمان لاتا ہے ، اور یہ ایمان اس کے بطن البطون میں داخل ہو جاتا ہے ، اور وہ نیک زندگی بھی بسر کرتا ہے ، تو وہ مومن یا صحیح معنوں میں صاحب ایمان ہے ۔ اسلام کی رو سے یہ کامل انسان ہے کیونکہ یہ علم صحیح کو عمل صحیح سے متحد کرتا ہے ۔ بعض اوقات ایمان کا محض زبانی اقرار نیک اعمال سے بیگانہ ہوتا ہے ۔ اور ایسے ہی بعض اوقات اچھے عمل خدا پر باخبر اور واضح ایمان کے بغیر خود بخود سرزد ہوتے ہیں ۔

* وافضلها قول لااله الاالله وادناها اماطة الاذی عن الطریق — صحاح ستہ
† لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه — شخین

ان دونوں صورتوں میں مذہب یا انسان کی فلاح و بہبود ادھوری رہتی ہے۔ ایمان اعمال سے جانچا جاتا ہے۔ اگر وہ محض زبانی اقرار ہو، یا سنی سنائی بات پر مبنی ہو، یا ایک رائے ہو اور ابھی انسان کے قلب میں داخل نہ ہؤا ہو، تو یہ آزمائش کے وقت فوراً ٹوٹ جاتا ہے۔ جبکہ انسان خود اپنے آپ پر قابو پانا چاہتا ہے، یا ایسے داعیہ کے لئے ایثار و قربانی کرنی چاہتا ہے جس پر ایمان کا اس نے اقرار کیا ہے۔

قرآن کی متعدد آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ایمان کو بلا عمل کے بے معنی سمجھتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ سچے ایمان کا نتیجہ اچھے اعمال ہونا چاہئے۔ اگر اس سے اعمال صالحہ کا صدور نہ ہو تو وہ محض گمان اور زبانی اقرار ہے۔ صداقت اعمال صالحہ کی طرف راجع ہوتی ہے۔ اور اعمال صالحہ انسان کو صداقت کی قبولیت کے لئے تیار کرتے ہیں۔ قرآن میں چند ہی مقامات ہیں جہاں ایمان کا اظہار بغیر اعمال صالحہ کی معیت کے کیا گیا ہے۔ ''وہ جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں'' اکثر دھرایا جانے والا فقرہ ہے۔ اعمال صالحہ ایمان کی کسوٹی ہیں۔ اور وہ بجائے خود قابل قدر بھی ہیں۔ اگر انہیں ابھی تک واضح علم کی روشنی حاصل نہ ہوئی ہو، تب بھی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ قرآن غیر مرئی روحانی میزان سے اعمال کا وزن کیا جانا بیان کرتا ہے۔ یہ نیک و بد اعمال ہیں جو وزن کئے جاتے ہیں نہ کہ ایسا اور ویسا ایمان۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اچھے کام کا پلہ برے کاموں سے وزن میں بھاری رہے۔ خدا پر ایمان انسان کو نیکی پر استقامت عطا کرتا ہے، جو ایک محکم اساسی سہارا ہے۔ لیکن نیکی خود اپنی آپ جزا ہے اور بدی خود اپنی آپ سزا۔ جہاں کہیں نیکی پائی جاتی

ہے وہ ایمان کا جز ہے، خواہ مقررہ الفاظ میں اس کا اقرار کیا جائے یا عدم اقرار۔ اور جہاں کہیں برائی کا ارتکاب ہوگا وہ عملاً ایمان میں کوتاہی کے سبب وقوع پذیر ہوگی۔ انسان زندگی کی طرف اپنے عملی رویہ سے جانچا جائیگا۔ محض یہ نہیں دیکھا جائیگا کہ وہ کس عقیدہ کا اقرار کرتا ہے۔ عمل میں اخلاقیات ایمان کا بڑا حصہ ترتیب دیتی ہے، اگرچہ یہ، بلا خالق اور محافظ جملہ اقدار پر ایمان لائے ہوئے، کافی نہیں اور نہ روح کو تشفی دے سکتی ہے۔

مناجات و عبادت

عبادت منطقی طور پر خدا کے تصور سے پیدا ہوتی ہے، جو کائنات کا روح رواں اور نور ہے۔ ہم میں سے ہر ایک زندہ رہتا، حرکت کرتا، اور اپنا وجود خدا کی ذات میں رکھتا ہے۔ ہر وہ چیز جو وجود رکھتی ہے، وہ اسی کے توسط سے زندہ ہے۔ اگر زندگی ذرات کا اتفاقی اجتماع نہیں ہے، جو مادہ اور توانائی کے زور اور دباؤ کے تحت میکانی طور پر قوانین تپش مرکبات (Thermodynamics) کے ذریعہ بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ اگر زندگی کوئی مقصد و غایت رکھتی ہے، جس کا ماخذ وجود حقیقی ہو، تو پھر اس مقصد سے آگاہی ضروری ہے، تاکہ زندگی اس کے مطابق ڈھالی جا سکے۔ انسان ایک کل کا جز ہے اور وہ کل خدائے تعالیٰ ہے۔ اگر ایک کل، جیسا کہ مخلوقات میں اس کا ظہور ہے، ایک عضوی کل ہے، تو کل کا جز سے تعلق اصلاً اس سے مختلف ہوتا ہے جو ایک مادہ کے ٹکڑے میں اجزاء کا اپنے کل سے ہوتا ہے۔ ایک عضو زندہ رہتا اور اپنا وظیفہ اس وقت تک ادا کرتا ہے جب تک کہ وہ ایک جسم کی حیات سے حیاتی ربط

رکھتا ہے، جیسا کہ ہم مادی عضویت رکھتے ہیں، جس میں اجزاء ترکیبی طور پر کل سے تعلق رکھتے ہیں، ایسے ہی ہم اخلاقی اور روحانی عضویت رکھتے ہیں، جو مادی عضویت کی طرح ظاہر اور قابل ادراک نہیں ہوتی۔ ایک فرد ترکیبی طور پر انسانی معاشرہ سے ارتباط رکھتا ہے، وہ اپنی ذہنی اور اخلاقی زندگی اس ہیئت اجتماعی سے اخذ کرتا ہے۔ ایک فرد اپنی جوہری اور جداگانہ فردیت میں ایک تجرید ہوتا ہے جس کا کوئی ٹھوس وجود نہیں ہوتا۔ ایک فرد کی زندگی کی اصلی حقیقت فوق الفرد اور فوق الذات ہوتی ہے۔ اپنے وجود کے مختلف پہلوؤں میں ہم مختلف النوع کل کے اجزاء ہیں۔ ہم ادنیٰ ترین حیثیت میں مادی کائنات کے اجزاء ہیں، اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کل کی نوعیت کو سمجھیں اور اپنی مادی زندگی کو اس کے قوانین کی متابعت میں ترتیب دیں۔ ایسے ہی ہم حیاتی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں اور ہمیں اپنے آپ کو عضوی نمو کے قوانین غذا و ہضم کے مطابق بنانا پڑتا ہے تا کہ ہم صحت مند مادی زندگی گذار سکیں۔ حیاتی حکمت کا صلہ مادی صحت، قوت حیات کا احساس، اور لطف زندگی ہے، جو اس سے قدرتاً پیدا ہوتے ہیں۔ ہر عضو جسم کل عضویت کے ساتھ یکجہتی سے زندگی گذارتا ہے، اور زندگی کی دائمی داد وستد میں پیہم مصروف رہتا ہے۔ ایسے ہی معاشری نظام کے قوانین ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے تمام بنی نوع انسان ایک روح کے اضعاف ہیں، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کل انسانیت ایک معاشری نظام ہے۔ فلسفی شاعر سعدی نے قرآن کی اس تعلیم کی ان الفاظ میں ترجمانی کی ہے:—

بنی آدم اعضائے یکدیگرند   که در آفرینش ز یک جوهرند
چو عضوے بدرد آورد روزگار   دگر عضوها را نه ماند قرار

انسانی وحدت کا حصول اخلاقیات کی اعلیٰ ترین صورت ہے ، اور انسان کی مرفہ الحالی کے لئے لازمی شرط ہے۔

ہم بلند سے بلند تر ہوتے ہوئے روحانی نظام کے تصور تک رسائی پاتے ہیں ، جس کی روح خالق کائنات ہے ۔ ہم مادی کائنات کے اجزاء ، حیاتی دنیا کے اعضاء ، اور معاشری نظام کے حصے ہیں ، جو بالاخر تمام انسانیت کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے ۔ لیکن ہم اپنے نفس کی گہرائیوں میں اس روحانی نظام کے اجزاء ہیں جسے ہم خدا کہتے ہیں ، جو اس نظام کا روح رواں ہے ۔ ہم بحیثیت افراد اس سے اپنا وجود اور وظائف حاصل کرتے ہیں ۔ ہر عضو اس نظام سے ہم آہنگ رہ کر حقیقی طور پر زندہ رہتا ہے ۔ جب کبھی جسم کے کسی حصہ میں کوئی خرابی ہوتی ہے تو پورے نظام کی قوت عمل اس کی مدد کے لئے ہجوم کرتی ہے ۔

عبادت روحانی نظام کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے ، جو ایسے افراد کی اعانت کرتا اور زندگی بخشتا ہے جو اپنا حیاتی رشتہ مرکزی تخلیقی محرک کے ساتھ برقرار رکھنے کی جد و جہد کرتے ہیں ۔ جو شاخ اپنا رشتہ درخت سے توڑ لیتی ہے وہ مرجھا جاتی ہے ۔ ایسے ہی ہم بحیثیت ارواح کے پژمردہ ہو جاتے ہیں ، اگر ہم اپنا تعلق شجر حیات یعنی خدا سے منقطع کر لیں ۔ عبادت خدا کے ساتھ ہماری یگانگت کا احساس ہے ، اور اس احساس سے ہم حقیقی غذا پاتے ہیں ۔ خدا پالنے والا اور پرورش کرنے والا ہے ، لیکن یہ پرورش یا پرداخت صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ہم اپنی زندگی کا رشتہ اس کے ساتھ قائم رکھیں ۔ وہ جز جو کل کے ساتھ یگانگت حاصل کرتا ہے وہ کل کی زندگی میں شریک کار ہوتا ہے ۔ اس شرکت کے نتائج

ہمارے وجود کے ہر عضو سے نمایاں ہوتے ہیں۔ عبادت ایک کیفیت ہے جس میں ایک محدود غیر محدود سے ربط پیدا کرتا ہے۔ جب ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ جس وقت خدا نے ہم کو پیدا کیا تو اپنی روح ہم میں پھونکی، تو اس کا صرف یہی مفہوم ہوتا کہ روحانی نظام کی روح، یعنی روح حق تعالیٰ نے اپنا قلبی اور جانی رشتہ ہر فرد بشر کے ساتھ قائم کر لیا۔

اگر ہم غیر شعوری وجود رکھتے تو ہم اپنا وجود خدا کی ذات میں مثل جنین کے رکھتے جو رحم میں اپنی غذا از خود بلا کسی ارادی کوشش کے حاصل کرتا ہے۔ لیکن انسان شعوریت اور اختیار سے سرفراز کیا گیا ہے۔ بعض اوقات وہ اپنی اصل سے بے خبر اور اپنے مصدر سے غافل ہو جاتا ہے، جہاں سے کہ وہ تنہا اپنی روحانی غذا حاصل کر سکتا ہے۔ حقیقی، کامل اور ٹھیک طرح اپنے وظائف ادا کرنے کے لئے اسے اپنا رشتہ روح کائنات سے جوڑنا پڑے گا، جہاں سے کہ وہ نور اور حیات پاتا ہے۔

جس طرح مذہبی خیالات اور کیفیات ادنیٰ سے اعلیٰ تک مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح ایک انسان کی عبادت دوسرے انسان کی عبادت سے مختلف ہوتی ہے۔ عبادت کی نوعیت کا انحصار بالآخر خدا کے تصور پر ہوتا ہے، جس کی وہ عبادت کرتا ہے۔ نسل انسانی کے ایسے وحشی اور غیر متمدن قبائل ہیں جو اپنی تخویفات اور امیدوں کو تمثل کا رنگ اور الوہیت کا درجہ دیتے ہیں، اور ان کا تخیل مختلف فطری قوتوں اور صفات کے ساتھ خداؤں کی تخلیق کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "مشرکین اور بت پرستوں نے اپنی باطل خواہشات کو خدا

بنا رکھا ہے''۔* اس نوبت پر عبادت صرف ایک جھوٹی نفسیاتی تسکین پہنچاتی ہے۔ بعض قبائل میں اگر کوئی خدا بار بار التجاؤں اور نذرانوں کے بعد دعا قبول نہ کرے اور مطلوبہ چیزیں عطا نہ کرے تو اس کی گردن میں رسی ڈال کر نیچے گھسیٹا جاتا اور بر سر عام توہین کی جاتی ہے۔ انسان کے ایک ہمہ داں اور ہمہ تواں خدا کے تصور تک پہنچنے کے بعد بھی، جو سنتا اور قبول کرتا ہے اور جو صاحب لطف عمیم ہے، انسان اپنی نا مکمل روحانی حالت کے سبب حقیر مادی فائدوں کیلئے دعائیں کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ خدا اسکے ناپائیدار اور انفرادی فائدوں کی خاطر فطرت کے طریق عمل کو بدل دے۔ اگر خدا ایسی دعائیں سنا کرے تو انسان کی زندگی اور کل موجودات میں انتہائی بد نظمی واقع ہو جائے۔ کیونکہ شخصی انسانی خواہشات نہ بطور خود پائیدار ہیں اور نہ یہ فطرت کے طریق عمل کی موافقت کرسکتی ہیں، جس کی یک رنگیوں پر تمام زندگی کا مدار ہے۔ اس لئے ایک مسلمان کو دعا کی یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ جس چیز کو اپنے حق میں درست اور مناسب سمجھتا ہے، اس کو نہ مانگے بلکہ صراط مستقیم پر ہدایت یاب ہونے کی دعا کرے، جو اس کو فوز و فلاح کی طرف لے جاتا ہے۔ صراط مستقیم کی مزید تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ راستہ جس پر انعام یافتہ لوگ چل چکے ہیں۔ راستہ کے صحیح ہونے کی تعریف یہ ہے کہ وہ راہ جو منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرتی ہو، اور منزل مقصود، جیسا کہ قرآن نے تشریح کی ہے، یہاں اور آخرت میں فلاح و بہبود اور برکت و سعادت ہے۔ اگرچہ انسان کو بہت سی ایسی چیزوں کے لئے دعا کرنے سے روکا نہیں گیا

* ارایت من اتخذ الٰھہ ھوٰنہ — الفرقان — ۴۳

ہے جن کے صحیح ہونے کا اس کو یقین ہے ، مگر ایک مقررہ دعا جس کو وہ دن اور رات کے مختلف وقتوں میں دھراتا رہتا ہے وہ یہی صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت ہے۔ ہمیشہ قطعیت کے ساتھ یہ کون جان سکتا ہے کہ کون سی چیز مناسب ہے ، جس کے لئے دعا کی جائے۔ کیونکہ انسان کی خواہشات اور تمنائیں انتہائی غیر یقینی ہیں ۔ قرآن کہتا ہے ''ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے حق میں ضرر رساں ہو ، اور ایک چیز سے تم نفرت کرو اور وہ تمہارے حق میں نفع بخش ہو''*۔ جیسا کہ رومی نے کہا ہے :

بس دعاھا کاں زیاں است و وبال
از کرم می نشنود شان ذو الجلال

ایسے مدعیان ایمان بھی ہیں اور منکرین بھی جو دعاؤں کی بے حاصلی کی بابت بحث و حجت کرتے ہیں۔ وہ خدا پر ایمان تو رکھتے ہیں ، لیکن یہ کہتے ہیں کہ خدا کسی شخص کو خوش کرنے کے لئے فطرت کا طریق عمل نہیں بدلتا ۔ تمام واقعات فطری اسباب کے نتائج ہوتے ہیں ، اور حصول مقصد کا صحیح طریقہ ان اسباب کا علم اور اس علم کے مطابق عمل کرنا ہے جس سے حسب دلخواہ اثرات مرتب ہوسکتے ہیں ۔ یہ خیال جو معین حدود میں صحیح ہے ، اپنے سببیت کے تصور میں غلطی کرتا ہے ۔ ہم اس کتاب میں سببیت کے موضوع پر اس سے قبل بحث کر چکے ہیں ۔ وجود کے ہر دائرہ اور درجہ میں سببیت کی نوعیت بدلتی رہتی ہے ۔ یہ ایک عام تجربہ ہے کہ جب حیات مادہ پر عمل کرتی ہے تو مادی سببیت بدل

* عسی ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم وعسی ان تحبوا شیئا وھو شر لکم — البقرۃ — ۲۱۶

جاتی ہے ، اور جب نفس مادی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے تو وہ حیاتی سببیت کو بدل دیتا ہے ۔ بعض اوقات ادنیٰ سطح پر سببیت ان اسباب کے تابع ہوتی ہے جو اعلیٰ سطح پر کارفرما رہتے ہیں ۔ یہ ادنیٰ اور اعلی سببیت کا فعل و تفاعل بھی متعین اور کلی قوانین کا تابع ہوتا ہے ، جو تمام انواع کی سببیت پر حاوی ہوتے ہیں ۔ لہذا اگر فوق النفسی قوتوں کو ان پر توجہ کے ذریعہ رو بہ عمل لایا جائے ، اور ماتحت اشیاء کے کاموں میں تبدیلی کے لئے ان کی مدد تلاش کی جائے ، اور اعلیٰ تصورات کے حصول کی خاطر ، جس سے کسی ماتحت سببیت کی خلاف ورزی نہیں ہوتی بلکہ اعلیٰ مقاصد میں مدد ملتی ہے ۔ انہیں کارآمد بنایا جائے ، تو کوئی چیز دعا کے مؤثر ہونے کی راہ میں حائل نہیں ۔ یہ بالکل بے نتیجہ اور فضول بات ہوگی اگر ہم فطرت کے طریق عمل میں تبدیلی کی دعا کریں یا ہم موسم کی تبدیلی کی صرف اس لئے دعا کریں جو ہمارے کسی عارضی مقصد کے لئے مناسب و موزوں ہو ۔ لیکن اگر عام انسانوں کی فلاح و بہبود اور اعلیٰ مقاصد کا حصول پیش نظر ہو تو اس کی توقع کی جاسکتی ہے کہ مافوق قوتیں ہمارا جواب دینگی ، بشرطیکہ ہم حقیقی روحانی کوشش کو کام میں لائیں ۔ فطرت کا طریق عمل کچھ ایسا بے لچک اور میکانی طور پر ترتیب نہیں دیاگیا ہے کہ انسان کی خواہش یا اس سے اعلیٰ تر خواہشات اس کی بے رحم ضرورت کے مقابلہ میں بالکل بے اثر ثابت ہوں ۔

مذہبی لوگوں کی ایک دوسری جماعت یہ خیال کرتی ہے کہ ایک ہمہ دان خدا بہتر جانتا ہے کہ کونسی چیز کی جائے ۔ اس صورت میں یہ بالکل فضول ہے کہ اسے یاد دہی یا کسی کام کے کرنے کی ترغیب دی جائے ۔ اس نقطۂ خیال کے بموجب

دعا انسان کی جانب سے ایک نازیبا گستاخی ہے کہ خدا سے اپنی خواہش کے مطابق کوئی چیز طلب کی جائے اور پھر اس کو اس کام کے کرنے کی ترغیب دی جائے۔ مگر یہ اعتراض مشیت الٰہی اور دیگر ارادوں اور انسانی اور فوق الانسانی کے غلط تصور پر مبنی ہے۔ جہاں کسی وجود کو اختیار کی آزادی سے سرفراز کیا گیا ہو، یہ تقدیر ہی کی کارفرمائی ہوسکتی ہے کہ چند اثرات کسی خاص سمت اختیار کے استعمال سے مشروط ہوں۔ انسانی اور فوق الانسانی طبقات وجود میکانی قربت اور غیر ارادی حرکت (Automatism) کے تابع نہیں ہیں۔ تمام بڑے مذہبی اشخاص ٹینی سن کے اس ایقان سے متفق ہیں کہ "بہت سی چیزیں دعاؤں سے تکمیل پاتی ہیں، جن کا دنیا وہم و گمان بھی نہیں کرسکتی"۔ دعا کی ضرورت اور اثر انگیزی پر اعتقاد اسلام کا ایک ضروری عنصر ہے۔ یہ ان ارکان میں سے ایک رکن ہے جس پر مذہبی زندگی کی ساری عمارت سہارا لئے ہوئے ہے۔ دعا اگر صحیح طریقہ پر کی جائے تو یقیناً نیکی کے لئے قوت میں ازدیاد کا باعث ہوگی۔ اگر اعلیٰ قوتوں کی استعانت طلب کی جائے تو دعا کی تحریک اعلیٰ مفادات سے ہوگی۔ یہ فضول خواہشات کا اظہار نہ ہوگی، جن کی بناء خود غرضی اور جہالت ہوتی ہے۔ اگر کوئی خود کو تمام جائز مساعی سے باز رکھے اور خدا سے یہ التجا کرے کہ وہ اس کے لئے وہ کام کرے جس کو خود اسے کرنا چاہئے تھا، تو وہ خدا سے ایسی مروت کی توقع نہ رکھے۔ ایک مہربان خدا کبھی اس کو تن آسانی اور جہالت کے بڑھانے میں اعانت نہ کرے گا۔ انسان کو پہلے صحیح کام کرنا چاہئے اور پھر نتائج کے لئے خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

تمام حقیقی مناجات و عبادت اپنی اور دوسروں کی روحانی کیفیت کو ترقی دینے کے لئے ھے، تا کہ سب اس سطح پر آجائیں جنھیں خدا نے اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا ھے۔ اور پستی کی طرف گرنے والے لوگوں کی حالت سے احتراز کریں جنھوں نے اپنے روحانی تنزل سے اپنے لئے ناگزیر مکافات مول لیں جن کو خدا کے غضب سے تعبیر کیا جاتا ھے۔ درست طریق پر دعا کا لب لباب قرآن کے افتتاحی آیات میں نہایت سادہ الفاظ میں پیش کیا گیا ھے، جس پر ناممکن ھے کہ کسی قسم کا اضافہ کیا جا سکے :۔ " ھر طرح کی ستائش (یعنی حسن و جمال کے اعتراف، اور کبریائی و کمال کے اعتقاد کے ساتھ جو کچھ اور جیسا کچھ بھی کہا جائے) صرف اللہ کیلئے ھے۔ اللہ ھی کیلئے، جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ھے۔ (جس کی پروردگاری کائنات خلقت کے ھر وجود کو زندگی اور بقا کا سر و سامان بخشتی، اور پرورش کی ساری ضروریات مہیا کرتی رھتی ھے)۔ جو رحمت والا ھے اور جس کی رحمت تمام کائنات ھستی کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رھی ھے۔ جو جزا و سزا کے دن کا مالک ھے۔ (اور جس کی عدالت نے ھر کام کے لئے بدلہ اور ھر بات کے لئے نتیجہ ٹھہرا دیا ھے)۔ خدایا ! ھم صرف تیری ھی عبادت کرتے ھیں، اور صرف تو ھی ھے جس سے (زندگی اور آخرت کی ساری احتیاجوں میں) مدد مانگتے ھیں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں جس کی بندگی کی جائے۔ (اور طاقت اور بخشش کا کوئی سہارا نہیں جس سے مدد مانگی جائے)۔ خدایا ! ھم پر (فلاح و سعادت کی) سیدھی راہ کھول دے ! وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ھے جن پر تیرا انعام ھوا۔ ان کی نہیں جو تیرے حضور مغضوب ھوئے، اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے اور

منزل کا سراغ ان پر گم ہو گیا ،، * آمین! ۔ تمام جہانوں کا پالنے اور پرورش کرنے والا موجود ہے جس کی اعانت طلب کرنی چاہئے تا کہ ہماری زندگی کی پرورش و پرداخت ہو سکے ۔ زندگی کے روز مرہ کے تعلقات میں ، اور ادنیٰ معاملات کے اندر انسان ایک دوسرے کے کام آتا ہے اور چشمداشت اعانت ہوتا ہے ، لیکن روحانی زندگی کے اہم معاملات میں صرف خدا کی استعانت نفع بخش ہو سکتی ہے ۔ اور بلا واسطہ مناجات و عبادت کا نذرانہ اسی کی خدمت میں پیش کیا جانا چاہئے ۔ عبادت اپنی ارفع و اعلیٰ حیثیت میں ایک دعا ہے نور اور حیات کے لئے ۔ نور صراط مستقیم پر ہدایت کے لئے ۔ اور منزل مقصود صحیح ہدایت اور درست زندگی کی سرفرازیوں کا حصول ہے ۔ ہمیں ہر حال میں خدا سے استعانت طلب کرنی چاہئے تا کہ ہم راہ سے نہ بھٹکیں ، اور منزل کا نشان گم نہ کردیں ۔ نماز کے وقت پکارنے والا پکارتا ہے 'حی علی الفلاح' جس کا مطلب ہے خیر اعلیٰ کا حصول اور وہ فلاح و سعادت جس سے تمام حقیقی اقدار کی وصولیابی ہوتی ہے ۔ جس چیز کی دھن ہے وہ اپنی ذات کے تمام ممکنات کو پوری طرح ظاہر کرنا ہے ، کامل ترقی ذات یا استکمال نفس پیش نظر ہے ۔ اذان کے اندر نماز کی دعوت کے بعد ہی صلواۃ کی توجیہ فلاح سے کی گئی ہے جو حصول خوشحالی پر دلالت کرتی ہے ۔ اس لئے عبادت استکمال نفس کا ایک زبردست ذریعہ ہے ۔ بغیر نماز کے کوئی شخص جزوی فوز و فلاح ، یا کچھ مادی نفع یا موقتی فائدے حاصل کر سکتا ہے ، لیکن اگر انسان کی روح ہستی اعلیٰ کے ذکر و فکر سے ہم آہنگ نہ ہو تو انسان کا انتہائی مقصد حاصل نہیں ہوتا ۔

* سورہ فاتحہ ۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن کہتا ہے، قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۙ (المومنون ۲-۱) بلاشبہ ایمان لانے والے کامیاب ہوئے۔ (کون ایمان لانے والے؟) جو اپنی نمازوں میں خشوع و خضوع رکھتے ہیں۔

خدا ہماری روح کا عطر اور زندگی کی جان و جوہر ہے۔ ہمارا نمود و ظہور اس سے غیر ارادی طور پر نہیں ہوا ہے۔ ہم اس سے ترکیبی طور پر ملے ہوئے ہیں۔ "وہ ہماری رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے!"* "وہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے"†۔ لیکن نور بغیر بصارت کے بیکار ہے۔ اگر ہم اپنی آنکھیں بند رکھیں تو مہر نیمروز کی تابانی بھی ہمارے لئے ظلمت ہی ظلمت ہے۔ عبادت بجز اس کے کچھ اور نہیں کہ ہم اپنے دل کی آنکھیں باز رکھیں تاکہ نور الٰہی کا اپنی روحوں میں خیر مقدم کرسکیں۔ یہ نور خود وجہہ حیات بھی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم ایک حد تک اپنی زندگی کی رہنمائی عقل اور فطری جبلتوں کے ذریعہ کرسکیں، جس طرح یہ ممکن ہے کہ رات کی تاریکی میں مصنوعی روشنی کے ذریعہ ایک مدود حد تک ہم کچھ دیکھ سکیں، اگرچہ کہ اس روشنی کا اقتباس بھی آفتاب ہی سے ہوتا ہے۔ انسان عبادت کے وقت ایک شمس الشموس اور سر چشمۂ نور و حیات کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہ اپنے کو برقی قوت کے خزانہ سے جوڑ لیتا ہے، جس کی برقی لہریں بے اندازہ قوت و توانائی بخشتی ہیں۔ وہ ٹٹولتے ہوئے نہیں چلتا بلکہ سیدھا چلا جاتا ہے۔ مادہ پرست معتقدین اور دھریے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دعا کی اثر پذیری کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ بہت سی

* نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔

† اللہ نورالسمٰوات والارض۔

چیزوں کی دعائیں مانگتے ھیں لیکن مقبول دعاؤں کا فیصد تناسب جس میں کہ زندگی انہیں حسب مراد چیزیں عطا کرتی ہے، نا مقبول دعاؤں کے مقابلہ میں قلیل رہتا ہے، اس لئے دعاؤں کی تاثیر اعداد و شمار سے بھی ثابت نہیں کی جا سکتی۔ یہ واقعہ ہے کہ روحانی حقائق منطقی اور تجربی طور پر بالکلیہ ثابت نہیں کئے جا سکتے۔ تجربی ثبوت سے قطع نظر عزم الاعتقاد مذھبی زندگی میں ایک موثر عامل ہے۔ جیسا کہ ھم نے اس سے قبل کہا ہے دعاؤں کی اتنی ھی قسمیں ھیں جتنی کہ انسانوں کی قسمیں ھیں۔ اگر انسان موسم کی تبدیلی کیلئے دعا کرے اور موسم اپنے موسمیاتی طریق پر عمل کرے، تو اس سے ایک مخصوص قسم کی دعا کی نامعقولیت ثابت ھوتی ہے۔ یا اگر لوگ اپنے انفرادی فائدوں کے لئے دعا کریں، اور وہ فائدے حاصل نہ ھوں تو یہ چیز بھی دعا کی تاثیر کی بابت اس بہتر صورت میں بھی کچھ ثابت نہیں کرتی، جب یہ ٹھیک طریقہ پر روحانی چیزوں کی طرف متوجہ کی جاتی ہے۔ کوئی مذھب اس کی ضمانت نہیں دیتا کہ جو تم خدا سے مانگوگے وہ تمہیں عطا کرے گا۔ عموماً ھماری خواھشات سطح وجود پر ھلکی سی ترنگیں ھوتی ھیں، یہ انسان کے معاملات میں کوئی انقلابی صورت پیدا نہیں کرتیں۔ اسلام کہتا ہے کہ ھم کو صراط مستقیم پر چلنے کی دعا کرنی چاھئے۔ کوئی شخص یہ دعوے سے کہہ نہیں سکتا کہ کوئی انسان جو مخلصانہ طریقہ پر صحیح ھدایت اور نیکی کی راھوں پر چلنے کا خواھشمند ھو، وہ اپنی شخصیت کی طاقتوں کو اس خواھش کی وصولیابی پر مرتکز کرکے کوئی اعانت و دستگیری نہیں پاتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دعا کے اثرات صرف نفسیاتی ھوتے ھیں۔ اپنی باطنی قوتوں کو ایک نقطہ پر جمع کرکے اور حالات کو اس کے مطابق ڈھال کر کسی خواھش پر توجہ دینا اس کی قبولیت کا

موجب ہوتا ہے۔ یہ ایک غیر اخلاقی قانون ہے، جو اچھی اور بری دونوں خواہشات کے متعلق کارآمد ہوسکتا ہے۔ قرآن اس نفسیاتی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر غیر مبہم طریقہ پر اظہار کرتا ہے کہ جو کوئی دنیا کی بھلائیوں کا آرزو مند اور ان کے لئے کوشاں ہوتا ہے، وہ بھی اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ ایک نفس جس چیز کی ساعی ہوتی ہے وہ اسے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن صرف مادی اور دنیوی کاموں میں کامیابی فی الحقیقت زندگی کے حقیقی مقصد کے حصول میں ایک ناکامی ہے۔ ان خوبیوں کی قدر باطل و فانی ہے۔ اس قسم کی کامیابی انسان کو ابدی اقدار سے اکثر محروم رکھتی ہے۔ یہ جتنا ظلم و زیادتی سے دنیوی قوت جمع کرتا ہے اتنا ہی زیادہ حقیقی فلاح و بہبود کے راستہ سے دور بھٹکتا رہتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سطح کے نیچے بھی قوانین کارفرما رہتے ہیں جن سے پر خلوص دعا کا تعلق ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص مادہ کے قوانین کو دریافت کرکے ان کے ذریعے فطرت کی قوتوں پر قابو حاصل کرے تو وہ یقیناً ان پر غالب ہوگا، خواہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہو یا نہیں۔ ایک منکر خدا سائنسدان صرف مادی قوانین فطرت پر ایمان لاتا ہے، اور جب وہ اس اعتقاد کی بنیاد پر عمل کرتا ہے تو اس کی توقعات پوری ہوتی ہیں اور اس کا اعتقاد حق بجانب قرار دیا جاتا اور صلہ یاب ہوتا ہے۔ لیکن یہ صلہ اس سے ذرا بھی آگے نہیں جاتا۔ اگر اس نے نظام اخلاق کے قوانین کے مطالعہ سے غفلت برتی ہے اور واقعتاً مثالی اقدار کے ماننے سے انکار کیا ہے تو وہ علم کو شر اور تخریبی مقاصد میں استعمال کرکے خود کو اور انسانیت کو فائدہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔

عبادت کی اولین غرض انسان کے اخلاق و عادات اور روحانی کیفیت کو تقویت پہنچانا ہے - اس لئے قرآن عبادت کی تاثیر کے متعلق یہ بات واضح کرتا ہے کہ اگر نماز ٹھیک طریقہ پر ادا کی جائے تو وہ انسان کو برے خیالات اور برے کاموں سے بچاتی ہے - اس طرح کی اعانت میں بے شبہ نفسیاتی عوامل بھی کار گذار رہینگے ، لیکن اسلام کہتا ہے کہ فوق النفسی عوامل بھی مزید تقویت پہنچاتے ہیں - خدا نیکی کے لئے ایک قوت ہے ، اس لئے ایک انسان جو خیر کے حصول کے لئے عبادت کرتا ہے وہ ایک لایزال قوت کو اپنی جانب پاتا ہے - اگر خدا وجود حقیقی ہے تو یہ ضروری ہے کہ اس شخص کی جو اس کی راہ میں جہاد کرتا ہے ، مدد کی جائے - بعض لوگ دعا کے متعلق غلط تصور رکھتے ہیں ، اور اس کو عمل کے خلاف سمجھتے ہیں - کیونکہ وہ جو دعا کرتا ہے ، ایک سائل کی طرح ہے اور اس لئے اس آدمی سے فروتر ہے جو بجائے دعا کے محنت و سعی کرتا ہے - یہ نہایت غلط اور غیر منصفانہ تصور ہے - خواہش و ارادہ میں تمام انسانی اعمال کا صدور ہوتا ہے - ہمارے اعمال ہماری خواہشات اور ارادوں کی صورت پذیری کا نام ہیں - دعا صحیح عمل کی طرف ، بحیثیت خواہشات کی سر بلندی اور تطہیر کے ، ایک ضروری قدم ہے - جیسے کہ اسلام اعمال صالحہ کے ساتھ ہمیشہ ایمان کا حکم دیتا ہے ایسے ہی دعا کے ساتھ انتہائی محنت و سعی کا حکم دیتا ہے ، جو انسان کسی اچھے مقصد کے حاصل کرنے میں بروئے کار لاتا ہے - ''استعینوا بالصبر والصلواۃ ''* (صبر اور نماز کے ذریعہ اعانت حاصل کرو) - قرآن میں عبادت کا حکم اکثر مقامات پر خدمت خلق کے ساتھ دیا گیا ہے - جیسا کہ اعمال

* البقرہ — ۱۵۳ -

صالحہ ایمان کا اصل معیار ہیں ، اسی طرح عبادت میں اخلاص بھی اچھے اعمال ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ ''سو خرابی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی عبادت سے غفلت برتتے ہیں۔ جو اچھے کام صرف اوروں کو دکھانے کی خاطر کرتے ہیں۔ اور جو خیرات نہیں کرتے۔''*

اسلام کی رو سے عبادت کے گوناں گوں مقاصد ہیں۔ یہ عالم غیب سے تعلق قائم کرتی ہے ، جو خیر کی وہ لا محدود قوت ہے ، جو پیدا کرتی اور تمام موجودات کی پرداخت کرتی ہے۔ یہ عبادت کا سب سے بڑھ کر مقصد ہے۔ اس تعلق مع اللہ سے تزکیۂ قلب ہوتا ہے ، یہ ہمارے جذبات و عادات کو روحانی اور اخلاقی بناتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے : ''نماز بے حیائی کی باتوں اور منکرات سے روکتی ہے۔ خدا کا ذکر ایک بڑی قوت ہے''۔† حضرت ابوہریرہ رض کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا کہ ''اگر تم میں سے کسی کے گھر کے دروازے کے سامنے دریا بہتا ہو ، اور وہ اس میں دن میں پانچ مرتبہ نہاتا ہو تو تم اس کی پاکیزگی کی بابت کیا خیال رکھتے ہو ؟ کیا کوئی نجاست اس پر رہ جائیگی'' ؟ صحابہ نے عرض کیا اس پر کوئی میل کچیل باقی نہیں رہیگا۔ آنحضرت نے ارشاد فرمایا ''یہی مثال نماز پنجگانہ کی ہے۔ جس سے خدائے تعالیٰ انسان کے تمام گناہ دھو ڈالتا ہے''۔‡ اسی طرح بار بار خدائے تعالیٰ سے اپنے تعلق کی تجدید و تقویت سے ایک انسان اپنے آپ کو پاکیزہ اور قوی بناتا ہے۔ خدا کے ساتھ تعلق خیر و نیکی کے ساتھ اس کے ارتباط کو تقویت بخشتا ہے۔ بقیہ

---

* فویل للمصلین الذین ہم عن صلوتہم ساہون الذین ہم یراؤن و یمنعون الماعون ہ

† ان الصلوۃ تنہی عن الفحشاء و المنکر و الذکر اللہ اکبر—عنکبوت—۴۵۔

‡ شیخین ، ترمذی و نسائی۔

ہر چیز کی طرح اسلام میں عبادت بھی ایک مؤثر حقیقت ہے، اور یہ اپنا تعلق بلا واسطہ عمل سے رکھتی ہے۔ یہ مانگنا نہیں بلکہ جہد و سعی کرنا ہے۔ اپنی مساعی میں صحیح رخ پر گامزن ہونے کے لئے یہ ایک حقیقی قوت سے استعانت کی خواستگاری ہے۔

روحانی طور پر ترقی یافتہ اشخاص ہمیشہ اس بات کو مانتے ہیں کہ عبادت بھی علم کا ایک ذریعہ ہے۔ جب ہم مذہبی مفہوم میں علم کی بابت گفتگو کرتے ہیں تو اس سے مراد مادی مظاہر کی یک رنگیوں کا علم نہیں، بلکہ اس سے مراد خیر و شر کا علم، معرفت الٰہی یا علم حقیقت سے ہوتا ہے۔ ایک انسان جو خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت کرتا ہے وہ اپنے میں تمام شعوری اور غیر شعوری قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔ کسی صورت حال میں، صحیح راہ عمل کی بابت اس کے خیالات کی پراگندگی دور ہو جاتی ہے اور وہ اس سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ ایمرسن یہ کہا کرتا تھا اور اس کا قول بالکل درست ہے کہ کسی انسان نے بلا کچھ سیکھے ہوئے کبھی پر خلوص عبادت نہیں کی۔ یا جیسا کہ لوتھر نے کہا ہے کہ تحصیل و مطالعہ کا بہترین جزو اچھی طرح عبادت کرنا ہے۔ جب ہم صداقت تک مشتاقانہ پہنچتے ہیں تو ہمیں اپنے نفوس پر اس کے انعکاس کا تیقن ہوتا ہے۔ ہمارے جذبات کو سکون بخش کر اور لاحاصل خواہشات کو دبا کر نیز شہوات کی آویزشوں سے بلند ہو کر عقل کو اپنی لطافت اور معروضیت میں خود کو ظاہر ہونے دیا جاتا ہے۔ عبادت خود ایک طرح کا ولولہ ہے، لیکن یہ ایک فوق الطبیعی ولولہ ہے جو ان پست تر ولولوں کا قلع قمع کرتا ہے جو انسان کی روح کو ایک چشمۂ مضطرب کی صورت دیتے ہیں، جس میں

آسمان کے ستارے منعکس نہیں ہوسکتے ۔ مناجات اپنے فرومایہ ذاتی اغراض سے بلند ہونے کا ایک طریقہ ہے ۔

سورۂ فاتحہ ، جو بدرجہ اتم مسلمانوں کی دعا ہے ، اور جو بہترین دعائیں کی جا سکتی ہیں ان کا جوہر اس میں موجود ہے ۔ ضرورت ہے کہ دقت نظر سے اس کی تشریح کی جائے ۔ یہ ایک ساتھ اسلام اور مناجات کا عطر عطیر پیش کرتی ہے ۔ یہ بیک وقت ایک مذہب ، اور خدا ، انسان اور عموماً دنیا کے متعلق ایک دستور العمل ، اور حصول آزادی کا بہترین طریقہ ہے ۔ اس کا آغاز تمام جہانوں کے پرورش کرنے والے کی حمد و ثنا سے ہوتا ہے ۔ خدا کی حمد و ستائش کیوں کی جائے ؟ کیا وہ اپنے پرستاروں کی خوشامد سے لطف اندوز ہوتا ہے ؟ کیا وہ مطلق العنان بادشاہوں کی طرح اپنی مدح سرائی کا شائق ہے ؟ اگر اس قسم کی کوئی کمزوری خدا کی ذات سے منسوب کی جائے تو وہ ان نیک انسانوں سے بھی فروتر ہوجائیگا جو اچھے عمل صرف نیکی کی خاطر کرتے ہیں اور تعریف سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی ۔ خدا کی حمد و ثنا کا حقیقی مفہوم بالکل جداگانہ ہے ۔ جب ہم خدا کی حمد کرتے ہیں تو حقیقت میں ہم چند صفات کی تعریف کرتے ہیں ، جن کی قدر شناسی ہمیں نور بخشتی اور میزان وجود میں ہمارا پلہ بھاری کرتی ہے ۔ جب ہم خدا کی تعریف جہانوں کے پالنے والے کی حیثیت سے کرتے ہیں تو اس کا فوری اثر ہماری زندگیوں پر یہ پڑتا ہے کہ ہم بھی اس کی طرح تمام اقدار حیات کی پرورش و پرداخت کریں ۔ کوئی چیز جو حقیقت ہو ، اس کو پورا کرنا زندگی کا مقصد ہے ، نہ کہ تباہ کرنا ۔ جب ہم اس کو رب العالمین کہہ کر پکارتے ہیں تو ہم تمام کائنات کی وحدت کا اعلان کرتے ہیں جو خدا کی ذات میں متحد ہے ۔ ایک دوسرے سے لاپروا اور

مخالف رہ کر مختلف جہان اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے۔ بعض مذاہب اور فلسفوں میں دنیا کو، بحیثیت ایک مجسم شر کے، نظر حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ دنیائے دوں خدا کی راندۂ درگاہ تھی۔ جسم ظلمت اور نفسانی خواہش شیطان کے مثل سمجھی جاتی تھی۔ قدیم علم الاصنام اور علم کائنات میں ہم موجودات کی تقسیم آسمانی دنیا اور تحت القمری دنیا میں پاتے ہیں۔ آسمانی دنیا خدا اور فرشتوں سے آباد تھی اور یہ خاکی دنیا رنج و محن کی وادی تھی۔ اسلام خدا کا تصور بحیثیت تمام جہانوں کے پالنے والے کے کرتا ہے اور موجودات میں خدا کے منظور اور خدا کے مقہور حصوں کے امتیازات کی تردید کرتا ہے۔ موجودات میں ہر چیز کی تخلیق کسی مقصد کے تحت ہوئی ہے اور تمام موجودات کے مقاصد باہم مربوط ہیں۔ انسان ایک سے زائد دنیاؤں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ ایک عالم اصغر ہے، جس میں عالم اکبر کے ہر پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک ہی وقت میں مادہ، حیات، نفس اور روح سب کچھ ہے اور اس کے وجود کا مقصد فروتر نظام کو برتر نظام کے تحت لاتے رہنا ہے۔ یہ فروتر نظام کو کچلنا اور فنا کرنا نہیں بلکہ اس کی فطرت کو سمجھنا اور اعلیٰ مقاصد کی خدمت گذاری کے لئے اس کو تیار کرنا ہے۔ جیسے کہ خدا تمام جہانوں کا پالنے والا اور پرورش کرنے والا ہے ایسے ہی ہم کو بھی دنیا کی ہر صورت حال کی جس سے کہ ہم کو سابقہ پڑتا ہے، پرورش و پرداخت کرنی چاہئے۔ مادہ کی تحقیر نہ کی جائے اور نہ ہی جسم کو اپنی تمام فطری جبلتوں کے ساتھ روح کی ترقی کے لئے کسی طرح مانع سمجھنا چاہئے۔ ہم ایک باہم سازگار اور متعاون کائنات میں رہتے ہیں، جو اپنی یگانگت و ہم آہنگی اپنے خالق سے حاصل کرتی ہے۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ ہم ان

تمام کی پرورش و پرداخت کریں جن سے وحدت و اتحاد کا اظہار اور صورت پذیری ہوتی ہے۔ جیسے دوسری دنیائیں اپنی وحدتیں رکھتی ہیں، عالم انسانیت کی بھی ایک وحدت ہے۔ تمام جہانوں کے پروردگار کی بندگی کرنے والے کو اس وحدت کی بھی نگہداشت کرنی چاہئے۔ خداوند عالم کی اس کیفیت کی تعریف یہ معنی رکھتی ہے کہ ہم فہم و قدرشناسی کے ساتھ حیات کے اصل مقصد کو پیش نظر رکھیں۔ اصل مقصد حیات، تمام ابدی اور حقیقی اقدار جو ہر سطح وجود پر صورت پذیر ہیں، ان کی نگہداشت کرنا ہے۔ قرآن کسی وجود کو مردہ اور بےجان تصور نہیں کرتا۔ قرآن کہتا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں ہر چیز جو وجود رکھتی ہے، ایسی زبان میں خدا کی تحمید و تقدیس کرتی ہے جس کو تم سمجھ نہیں سکتے۔ بےجان مادہ کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ ہر چیز زندہ ہے اور اپنا وجود خالق کائنات میں رکھتی ہے۔

تمام جہانوں کے پرورش کرنے والے کی حیثیت سے خدا کی تعریف کرنے کے بعد، ہم اس کی تعریف مہربان و رحیم کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ رحمان و رحیم کا انگریزی میں کسی ایک لفظ سے ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان الفاظ میں خوبی، رحم، محبت اور فضل و کرم کے اعتبارات شامل ہیں۔ اگر محبت کا لفظ ان تمام اعتبارات پر حاوی ہوسکتا تو ہم کہہ سکتے کہ ہمیں خدا کی تعریف مثل محبت کے کرنے کو کہا گیا ہے۔ یہ عشق ہے، جو حیات، نور اور حسن پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک متحرک اور تخلیقی جوش ہے۔ عشق پرورش کرتا ہے اور اس کو فنا نہیں کرتا جس کو کہ وہ پیدا کر چکا ہے۔ قرآن کہتا ہے ”خدا کی

رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے''۔* کسی دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ ''جنت آسمانوں اور زمین کے برابر برابر پھیلی ہوئی ہے''۔† یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت کی زندگی میں جب اس آیت کی تلاوت کی گئی کہ جنت تمام کائنات کے ہم زمان و ہم مکان ہے تو اس وقت ہرقل کا سفیر موجود تھا۔ سفیر نے اعتراض کیا کہ پھر دوزخ کہاں ہے؟ آنحضرت نے ارشاد فرمایا کہ ''جب صبح نمودار ہوتی ہے تو رات کہاں رہتی ہے''؟ رحمٰن و رحیم کی عبادت اور اس کی ان صفات سے تعریف، ہم میں محبت و شفقت کے اوصاف پیدا کرتی ہے۔ اس طرح عبادت کرنے والا خیر کے لئے ایک تخلیقی قوت بن جاتا ہے۔ انسان اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اس زاویۂ نگاہ سے تمام مخلوقات اور اپنے بنی نوع کو دیکھے۔ جب وہ ان صفات کو تلاش کرتا ہے تو جہاں ان کا وجود پہلے نمایاں نہیں تھا وہاں انہیں رفتہ رفتہ پانا شروع کرتا ہے، اور جہاں ان کی کمی پاتا ہے، وہاں ان کو پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی صرف خیر کو پانا نہیں ہے، بلکہ جو خیر ہے اس کو پیدا کرنا بھی ہے۔ حیات و عشق ساکن و جامد نہیں بلکہ متحرک ہیں۔

مبادا کوئی عشق الٰہی کو مثل انسانی محبت کے خیال نہ کر لے، جس میں اخلاقی پابندی اور کوئی قاعدہ قانون نہیں ہوتا، ہمیں جتلایا گیا ہے کہ ہمارا مالک وہ ہے جو قانون ساز اور عادل بھی ہے۔ دائرۂ انسانیت میں محبت اکثر بے قید رہی ہے، جیسے کہ قانون نا آشنائے محبت ہوتا ہے۔ لیکن خدا کی فطرت میں قانون اور محبت ملے جلے ہیں۔ نظام اخلاق ایک

---

* ربنا وسعت کل شئی رحمۃً و علما۔ المؤمن۔ ۷۔

† وجنۃٌ عرضھا السمٰوات والارض۔ آل عمران۔ ۱۳۳۔

محبت کی تخلیق ہے۔ عشق الٰہی خود پرست نہیں ہے۔ وہ خود اپنی آپ پرورش نہیں کرتا بلکہ وہ غیر نفس کی پرداخت کرتا ہے۔ جس طرح بہترین والدین وہ ہوتے ہیں جو اولاد کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار اخلاقی تادیب اور نیکی اور برائی پر جزا اور سزا کے ذریعے کرتے ہیں، تاکہ وہ خوش اطوار ہوں اور پروان چڑھ کر محب و محبوب بن جائیں' اسیطرح عشق الٰہی نے نظام اخلاق قائم کیا ہے' جہاں خیر و شر اپنے فطری نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اگر برے افعال سے ہمیشہ در گذر کیا جائے تو وہ بالآخر فاعل کی شخصیت کو برباد کر دیتے ہیں۔ بعض مذاہب یہ شیخی بگھارتے ہیں کہ انہوں نے قانون کی بجائے محبت کو قائم مقام کیا ہے۔ لیکن یہ ہر دو کی ماہیت کا غلط تصور ہے۔ قانون بلا محبت کے ظلم بن جاتا ہے، اور محبت بغیر قانون کے اندھی اور تباہ کار ہو جاتی ہے۔ قانون مادی کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اگر قانون نہ ہوتا تو ایک افرا تفری رونما ہوتی۔ خدا کی رحمت مادی مخلوقات میں اپنا ظہور مثل قانون، نظام، اور حسن کے کرتی ہے۔ اور انسان میں یہ ابتداًء اپنی نمود نظام اخلاق کی صورت میں کرتی ہے۔ ظاہر و باطن میں قانون ہی قانون ہے، جو حاکمانہ اور باوقار دونوں ہے۔ کانٹ اپنے حقیقی جذبہ کا اظہار کر رہا تھا جبکہ اس نے کہا کہ دو چیزوں نے اسے پر خوف کردیا' اوپر تاروں بھرا آسمان اور باطن میں اخلاقی قانون۔ اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ ہم ہمیشہ خدا کی اس صفت کو ذہن نشین رکھیں کہ وہ مالک یوم الدین ہے۔ اس نے قوانین مکافات و مجازات کو قائم و جاری کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خیر و شر نہایت دقیقہ سنجی سے میزان حیات میں تولے جاتے ہیں، خواہ وہ ایک

روحانی طور پر غیر تربیت یافتہ آنکھ کے لئے کتنے ہی غیر محسوس ہوں ۔ مگر خدا سزا دینے میں اسطریقہ پر جلد باز نہیں جس سے انتقام ظاہر ہو ۔ قرآن کہتا ہے کہ ''اگر خدا سزا دینے میں جلد باز ہوتا تو روے زمین پر کوئی جاندار باقی نہ رہتا'' ۔* انسان کی زندگی میں برائی کے اثرات کا دفعیہ اس نیکی سے جو وہ کرتا ہے، ہوتا رہتا ہے ۔ کوئی گناہ ایسا نہیں جو ناقابل تلافی طور پر اس کی جان کا لاگو ہو جائے۔ گناہ کرنے کے بعد جس لمحہ وہ خدا کی طرف رجوع کرتا اور توبہ کرتا ہے ، اور اپنی انابت کا اظہار عملاً اس گناہ سے رخ پھیر کر کرتا ہے ، تو وہ پھر سے اپنا توازن حاصل کر لیتا ہے ۔ اور حاصلہ تجربہ کے فوائد سے اپنے کام کا از سر نو آغاز کرتا ہے ۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ ہم خدا کے صفات مثل قانون اور محبت کو دہرائیں تا کہ وجود حقیقی کی ماہیت کے علم سے اپنی زندگیوں میں ان دونوں کا امتزاج پیدا کریں ۔ قانون کی صحت کی جانچ یہ ہے کہ محبت اس کی محرك ہو ۔ محبت حقیقی ہے اور قانون اس کا ایک ذریعہ اور آلہ ۔ مثالی خوشحالی میں ان دو کے مابین کوئی تزاحم نہ ہونا چاہئے لیکن اگر کسی موقع پر دونوں باہم متصادم نظر آئیں تب قانون محبت کے لئے جگہ خالی کردے ، جس کو خود ایک بر تر قانون تصور کیا جا سکتا ہے ۔

* ولو یؤاخذاللہ الناس بظلمھم ما ترک علیھا من دابۃ — نحل ٦١ ۔

باب نہم

عبادت و اطاعت

اللہ تعالیٰ کو نظام اخلاق کا نافذ کرنے والا اور خیر و شر میں انصاف کرنے والا ماننے کے بعد ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم محبت اور انصاف کے تصورات کا امتزاج کریں - قرآن کی رو سے یہ دونوں تصورات ایک دوسرے میں شامل ہیں - اگر اللہ تعالیٰ محبت کرنے والا اور عادل ہے تو ہم کو صرف اسی کی خدمت، اطاعت اور عبادت کرنی چاہئے - سورہ فاتحہ میں یہ اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے کہ ''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے اعانت کے خواستگار ہیں''۔* عربی میں لفظ عبادت انگریزی میں لفظ ''سروس'' سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے - اس کے معنی پر خلوص اطاعت اور پرستش کے ہیں - اس کے معنی اپنے اختیار کو کسی دوسرے کے اختیار میں کاملاً تفویض کرنے کے ہیں - چنانچہ عبد کے معنی غلام کے ہیں، جس کی زندگی اور اختیار اپنے آقا کے دست تصرف میں ہوتا ہے - اسلام جس کے معنی خدا کی مشیت کے سامنے کامل سپردگی کے ہیں، اس عمل اور حالت کی طرف لازماً لے آتا ہے جس کا اظہار لفظ عبادت سے ہوتا ہے - ہم انسانی تعلقات میں عاشقوں اور غلاموں کی حالت میں اس تفویض کی ایک قریبی جھلک دیکھتے ہیں - خدا سے انسان کے تعلق کی پوری وضاحت نہیں ہو سکتی ہے، اس لئے صرف تمثیلات

---

* ایاك نعبد و ایاك نستعین — فاتحہ ۴ -

میں اس کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ عشاق کی قبیل غلاموں سے جداگانہ ہے لیکن وہ اپنے آپ کو بندۂ عشق کہنا پسند کرتے ہیں ، بوجہ اس ایثار و خود فراموشی کے جسکی محبت متقاضی ہوتی ہے ۔ خدا ہم سے جس چیز کا مطالبہ کرتا ہے وہ رضاکارانہ اور والہانہ خدمت ہے ۔ اگر خدا ہمارا نصب العین ہے تو ہمیں حکم ہے کہ صرف اسی کی اطاعت کریں ۔ اگر نصب العین تمام اقدار حیات کا حاصل جمع ہے تو یقیناً کوئی آدمی کسی اور کی جائز طور پر اطاعت نہیں کر سکتا ۔ چنانچہ جب ہم اپنے نصب العین کی بجائے کسی دوسرے کی اطاعت کرتے ہیں تو ہم گم کردہ راہ ہو کر اپنی زندگیوں کو خطرہ میں ڈال لیتے ہیں ۔ اور جب ہم اپنے نصب العین کی متابعت کے بغیر اپنی انفرادی جبلتوں کی پیروی کرتے ہیں تو اپنی زندگیوں میں ایک افراتفری پیدا کر لیتے ہیں ۔ اگر ہم دولت اور قوت کی چاکری کریں تو ہم اپنی اعلیٰ تر خودی کے وفادار نہیں رہتے ۔ جب ہم دوسرے انسانوں کی ، بوجہ خوف یا محبت ، کسی دنیاوی فائدہ کی خاطر اطاعت کرتے ہیں تو ہم خود اپنے اور دوسروں کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں ۔ جب ہم توہم پرستی کے باعث اپنے خود ساختہ خداؤں یا فطرت کی طاقتوں کو خوف زدہ ہو کر پوجتے ہیں تو ہم انسانیت کے وقار کو صدمہ پہنچاتے ہیں ۔ حقیقی آزادی اپنے نصب العین کی اطاعت میں مضمر ہے ۔ جب آدمی کئی تصورات اور مختلف خواہشات کی پرستش کرتا ہے ، جو باہم مخالف اور بے جوڑ ہوتے ہیں ، تو وہ اپنی ہستی کی ہم آہنگی کو تہ و بالا کر دیتا ہے ۔ ہم اپنی زندگی کامل طور پر بسر نہیں کر سکتے جبتک کہ ہم اپنے تمام تصورات اور خواہشات کو ایک محیط کل نصب العین میں مدغم نہ کردیں ، جس کی اطاعت

ہمارے وجود کے ہر پہلو کی رعایت رکھتے ہوئے کاملاً تشفی بخش ہونی چاہئے - حیات انسانی کا یہ حزنیہ ہے کہ انسان باطل تخویفات کا محکوم اور فریب دہ فائدوں کی ترغیب میں آجاتا ہے، جو اس کو نصب العین سے ہٹا دیتے ہیں - خدا کی مطلق اطاعت کے معنی مشیت الٰہی کی شناخت کے ہیں اور کامل سپردگی کے معنی اپنی شخصیت کی نفی کے نہیں بلکہ تکمیل کے ہیں - استکمال نفس کا یہی واحد طریقہ ہے - اس کے معنی تسخیر حیات اور سعادت کے ہیں، ہم مغلوب ہو کر حصول مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں -

موجودہ زمانہ میں ہم مذہب کے خلاف ایک عام منافرت دیکھتے ہیں، جس کا باعث مختلف خیالات و محرکات ہیں - نٹشے نے، جسنے خود ادعائی اور فوق البشر کے عقیدہ کی دعوت دی تھی، اخلاقیات کی حاکمانہ اخلاق اور غلامانہ اخلاق میں درجہ بندی کر دی اور حضرت عیسیٰ[۴] کو غلامانہ اخلاق کے مبلغ کی حیثیت سے مطعون کیا - اس نے مذہب کی بھی درجہ بندی کی - ایک وہ مذاہب جو زندگی کا اثبات چاہتے تھے، دوسرے وہ جو زندگی کی نفی کرتے تھے - اس کا فوق البشر محبت اور انصاف کے اقدار سے ماوراء ہے اور کسر نفسی و رحمدلی کو عیب تصور کرتا ہے - یہ ان تمام اقدار کی دوبارہ تشخیص کرتا ہے، جن کی انبیاء اور اولیا نے تبلیغ کی تھی اور جنہیں وہ رو بہ عمل لائے تھے - یہ فوق البشر صرف قوت کا پرستار ہے اور اس کو بہر قیمت، بے دردی کے ساتھ ترقی دینا چاہتا ہے - وہ سوائے اپنی خواہش کے کسی کی اطاعت نہیں کرتا اور وہ خود ہی اپنا قانون ہے - جس طرح لوئی چہاردہم نے کہا تھا کہ "میں مملکت ہوں" ویسے ہی یہ بھی کہتا ہے کہ "میں قانون ہوں، میں زندگی

ہوں۔ خدا مر چکا ہے ‘‘۔ اگر ہم اقدار کے دوبارہ تعین کی بابت
نٹشے کی تعلیمات کی تحقیق کریں ، تو ہمیں صرف ایک قوت کی
قدر تمام دیگر اقدار کی جگہ لیتی ہوئی نظر آئیگی ۔ یعنی حیاتی
زندگی بسر کرنے کے لئے ایک زیادہ طاقت ور قوت ۔ جب وہ کہتا
ہے ایک نئی نوع موجودہ انسان کی قائم مقام ہوگی تو اس کے
تصور میں کوئی فوق البشر نہیں بلکہ ایک فوق الحیوان وجود
ہے ، جس کی رہنما محبت یا عقل یا انصاف نہیں ہے بلکہ اپنے
ماحول پر چھا جانیوالی زیادہ جسمانی صلاحیت اور قوت کی
طلب ہے ۔

ایسے بھی لوگ ہیں جو مذہب کو جہالت اور خوف کی
پیداوار کہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ انسان اپنے علم اور
کوشش سے ان ہردو کی تسخیر کرے ۔ نیز یہ بھی دعویٰ
کیا جاتا ہے کہ مذہب غلامی کی تعلیم دیتا ہے اور یہ مظلوموں
کے لئے ایک خواب آور دوا ہے جو انسانیت کا استحصال کرنے
والوں نے تیار کی ہے ۔ چنانچہ آئندہ سے انسانوں کو بجز اپنے
وقار انسانیت کے کسی قوت کی اطاعت نہیں کرنی چاہئے ۔

یہ تمام اعتراضات پا در ہوا ہو جاتے ہیں جس وقت ہم
اسلام کے پیش کردہ خدا کے تصور کو اور اس کے شایان
شان عبادت و اطاعت کو اپنے ذہن میں لاتے ہیں ۔ خدا
ایک تخلیقی وجود ہے ۔ وہ ایک قوت حیات ہے ۔ پالنے والے
اور پرورش کرنے والے رب کی حیثیت سے وہ نشو و ارتقاء عطا
فرمانے والا خدا ہے ۔ وہ حیات اور اس کے اقدار کو برقرار رکھنے
کا کفیل ہے ۔ جب ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم اس کی اطاعت
کریں تو گویا ہم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ہم زندگی میں
عقل و انصاف کی اطاعت کریں اور اس کو ترقی دیں ۔ کوئی

ایسا حکم نہیں جو ہماری ترقی کے لئے سود مند نہ ہو۔ اسلام کی رو سے زندگی کا ہر صحیح عمل ایک عبادت ہے۔ تمام مخلوقات عبادت کے لئے ہیں اور یہ خدا کی عبادت ارادی یا غیر ارادی اور شعوری یا غیر شعوری طور پر کرتی ہیں۔ قرآن کی رو سے زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا، جو جائز طریقہ سے حاصل کی گئی ہوں، ایک عمل عبادت ہے۔ ''اے اہل ایمان! تم صرف میری عبادت کرو۔ زندگی کی نعمتوں سے شادکام ہو۔ اور شکر گذار رہو۔'' * موجودات کا پورا کاروبار ایک عبادت و اطاعت ہے۔ '' شمس و قمر باضابطہ اور مقررہ قوانین کے بموجب حرکت کرتے ہیں اور ستارے اور اشجار خدا کے آگے سر بسجود رہتے ہیں۔'' اجرام سماوی کی سیر وگردش فطرت کا ایک تعبدانہ عمل ہے اور تمام نمود و بالیدگی بھی خدا کی اطاعت ہے† ۔

''ساتوں آسمان اور زمین، اور جو کچھ بھی ان میں ہے، سب اللہ کی بڑائی اور پاکی کا اعتراف کر رہے ہیں، اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد و تسبیح نہ کر رہی ہو۔ مگر تم اس حمد و تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے ''۔'' آسمانوں اور زمین میں تمام مخلوقات اس کی فرماں بردار ہیں، اس لئے ہم سے کہا گیا ہے کہ ہم اس کی اطاعت اور عبادت کریں جس کی تمام کائنات اطاعت و فرمانبرداری کرتی ہے۔'' چنانچہ اسلام کی رو سے خود ہمارے قوانین فطرت کی متابعت خدا کی پرستش اور خدمت گذاری ہے۔ ہم سے یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ہم اپنے سے باہر کسی قوت کی خوف کے تحت اطاعت کریں۔ قرآن کہتا ہے کہ سچا مذہب خود تمہاری فطرت ہے جو

---

* واعبدوہ واشکروا لہ — عنکبوت - ۱۷ -

† فسبح لہ السموت السبع و الارض و من فیھن ؕ و ان من شیء الا یسبح بحمدہ و لکن لا تفقھون تسبیحھم انہ کان حلیماً غفوراً ۝ (۴۵ : ۱۷)

خدا کی طرف سے پیدا اور مقرر کی گئی ہے - جس نصب العین کی ہمیں مطلقاً فرماں برداری کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام مخلوقات کا بھی نصب العین ہے - خدا کی اطاعت گویا غیر محدود کے ساتھ توافق سے زندگی بسر کرنا اور خود کو اپنے وجود کے قوانین کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے -

یہ ایک ایسا دین ہے جو زندگی کا اثبات چاہتا ہے جو کہ ایک حیاتی وجود سے کہیں زیادہ ہے - تمام زندگی خدا کی پیدا کردہ ، ہدایت یافتہ ، اور پروردہ ہے - وجود کا ہر رخ ہماری زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد پورا کرتا ہے - تمام موجودات پر حکومت انسان کے لئے مقدر ہو چکی ہے ، لیکن یہ چیز صرف قانون کے علم و اطاعت سے حاصل ہو سکتی ہے - جیسا کہ قرآن میں قصۂ آدم سے معلوم ہوتا ہے ، آدم نے علم کے سبب ملائکہ پر برتری حاصل کی اور نافرمانی کی وجہ سے اپنے مقام سے نیچے گرا دیا گیا - ہم علم کے ذریعہ اسی وقت بلندی حاصل کر سکتے ہیں جبکہ ہم علم کے تقاضوں پر عمل کریں - اس طرح ہم موجودات کے غلام نہیں بلکہ حاکم بن جاتے ہیں - یہ حاکمانہ اخلاقیت ہم پر کہیں باہر سے مسلط نہیں کی جاتی بلکہ خود ہماری فطرت سے ابھرتی ہے - ایک نصب العینی ذات مطلق کی اطاعت کامل حقیقی معنوں میں آزادی ہے - ہمیں وجود کے کسی جزوی پہلو ، یا خدا کے سوائے کسی دوسری ہستی کا خواہ وہ کتنی ہی خوف زدہ کرنے والی ہو ، غلام بننے سے انکار کرنا چاہئے - انسان ، انسان کا غلام بن جاتا ہے - وہ اپنی جہالت و نادانستگی کا بھی حلقہ بگوش ہوجاتا ہے - اس کا میلان خاطر یہ ہے کہ وہ کسی قوت کا غلام بن کر رہے ، لیکن صداقت ہر قسم کی غلامی سے نجات دلاتی ہے -

انسان ایک عبادت گذار حیوان ہے۔ اگر وہ ذات حق کی عبادت نہ کرے تو وہ خود اپنی مخلوق بتوں کی پرستش کریگا۔ انسان کے لئے کوئی سانحہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ایسی چیزوں کی پرستش کرے جو نہ صرف خدا سے فروتر ہیں بلکہ خود اس سے بھی پست تر ہوتی ہیں۔ اسلام میں عبادت کوئی ساحرانہ فعل نہیں ہے جو فوق الفطرت طریقہ پر عالم اسباب میں عمل دخل رکھتی ہو۔ اور نہ یہ کسی غیر محدود ہستی کی محض خوشامد کرکے اس کی مہربانیاں حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ یہ روح حیات سے ایک انتساب ہے۔ یہ ایسی آزادی کا حصول ہے جس میں ہم بجز اس ایک ذات کے دوسری تمام قوتوں سے انکار کرتے ہیں جو ہمیں زندگی بخشتی، ہماری تطہیر کرتی اور ہمیں سر بلندی عطا کرتی ہے۔

صلوات

مکتوبہ نمازیں

ہم دیکھتے ہیں کہ عبادت تمام مدارج میں مذہبی زندگی کی مشترک خصوصیت ہے۔ خدا کے تصور کے کمال کے ساتھ عبادت کے معنی بھی دقیق ہوتے جاتے ہیں۔ اسلام توحید پرستی کی ایک خالص شکل ہے، جس نے عبادت کے مفہوم کو وسیع و عمیق کردیا ہے، اور یہ ناممکن ہے کہ اس میں کوئی اضافہ کیا جا سکے۔ اسلام عبادت کو کفر و ایمان کے درمیان خط فاصل قرار دیتا ہے۔ اسلام میں عبادت کو تمام پست اور خلاف عقل عناصر سے پاک کیا گیا ہے اور خدا کے ذکر کے ذریعہ تعمیر اخلاق میں زبردست معاون ہونے کی حیثیت سے اسے فرض

گردانا گیا ہے ۔ قرآن میں نماز کو ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے اور عبادت کی اولین غرض یہی ہے ، نہ کہ چند روزہ فائدوں کے لئے دعائیں مانگنا ۔ اگر خدا تمام موجودات کا سرچشمہ اور نصب العین ہے تو عبادت کے معنی اپنے پیش نظر ایک اعلیٰ مثال کو رکھنے اور اپنے عادات و اطوار کو اس ابدی معیار پر جانچتے رہنے کے ہیں ۔ زندگی کے شور و شر میں ، جذبات و مفادات کے تصادم میں ، فوری محرکات کے جوش و خروش میں ، اور ذاتی منفعتوں کے ہنگامہ میں ، ہم اپنے نصب العین سے غافل ہو جاتے ہیں ۔ محض ایمان کا اقرار یا مبہم ذہنی رضا مندی کافی نہیں ہوتی ، بلکہ اپنے نصب العین تک رسائی اور اپنی زندگیوں میں اس کو محسوس شکل دینے کی جد و جہد کرنی چاہئے ، تا کہ کردار کی تعمیر ہو سکے ۔

عبادت کی ضرورت اور تاثیر بالعموم تمام خدا پرست مذاہب نے تسلیم کی ہے ۔ لیکن اسلام میں عبادت چند امتیازی اوصاف کی حامل ہے ۔ انسان کو ہمیشہ اپنے تمام حرکات و حالات میں خدا کو یاد کرنے کے لئے کہا گیا ہے اور یہی ذکر عبادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ کوئی عمل جو مشیت الٰہی کی موافقت میں سر انجام پائے ، وہ بیکار نہیں ہو سکتا ۔ جیسا کہ آنحضرت ؐ کا ارشاد ہے کہ ' الکاسب حبیب اللہ '* (محنت کرنے والا خدا کا دوست ہوتا ہے) ۔ اسلام نیک زندگی کی کلیت کو مثل دائمی عبادت کے دیکھتا ہے ، لیکن نظم و انضباط کے لئے پانچ وقت کی نمازیں فرض کی گئی ہیں ۔ اور یہ فرض نمازیں جماعت کے ساتھ ہیں ۔ انفرادی عبادات ، جب انسان خدا کے ساتھ تنہائی میں ہو ، نفلی ، ضمنی ، اور اختیاری ہیں ۔ لیکن فرض نمازیں دن اور رات کے مقررہ اوقات میں جماعت کے ساتھ اور لازمی ہیں ۔ اور یہ اسی طرح فرض کی گئی ہیں جس طرح

انسان اپنے دیگر فرائض انجام دیتا ہے - اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان با جماعت فرض نمازوں میں کتنی چیزیں شامل کی گئی ہیں :-

(۱) جسمانی طہارت لازمی ہے - کوئی نجاست جسم اور لباس کو لگی ہوئی نہ ہو - صفائی خدا پرستی کے قریب لے آتی ہے - ایک شخص جو فرض شناسی کے ساتھ دن اور رات کے مختلف اوقات میں اپنی نمازیں ادا کرتا ہے وہ لازماً ہمیشہ صاف ستھرا رہیگا - نماز سے قبل اسے ان حصوں کا دھونا ضروری ہے جو عموماً روز مرہ کے کاموں اور فطری ضرورتوں کو پورا کرنے میں میلے ہو جاتے ہیں -

(۲) اس کے بعد ایک اجتماعی عنصر اپنی تمام اخلاقی اور نفسیاتی فائدوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے - جب کئی آدمی ایک ساتھ مل کر عبادت کرتے ہیں تو مذہبی جذبہ کو ترقی ہوتی ہے - جیسا کہ پیٹرونیس (Petronius) نے کہا ہے جب عبادات متحدہ طور پر ادا کی جاتی ہیں تو وہ زیادہ قوت کے ساتھ اثر کرتی ہیں یا جیسا کہ مادام ڈی اسٹیل (Madame De Stael) نے اقرار کیا ہے متحدہ عبادت ، خواہ وہ کسی زبان اور طریقہ سے ادا کی جائے ، ایک نہایت محبت آمیز و امید آفرین برادری ہے، جو انسان اس زندگی میں حاصل کر سکتا ہے -

(۳) عبادت کی قوت کو اجتماعی طور پر ترقی دینے کے علاوہ اسلامی صلوات جمہوریت کی ایک ذہنی و اخلاقی تربیت ہے - خدا کے روبرو مساوات ، انسانوں میں باہمی مساوات کی طرف راجع ہوتی ہے - امیر و غریب ، ادنیٰ و اعلیٰ ، اور قوی و ضعیف تمام عجز و انکسار کے ساتھ شانہ بشانہ خدا کے حضور میں کھڑے ہوتے ہیں - اسلام میں نماز با جماعت ایک

زبردست مساوات آفریں طریقہ ہے۔ بلا فرق و امتیاز مواقع کی یہی برابری انسانی معاشرہ کا مقصود ہونا چاہئے۔ مسجد میں مسلمان ایک غیر طبقاتی جماعت ہوتے ہیں۔ اگر وہ مسجد سے باہر اس کو عملی شکل نہ دیں تو اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ ان کی نماز ان کی روحوں میں اس طرح داخل نہیں ہوئی، جیسا کہ اس کو ہونا چاہئے تھا۔ ایک نصب العین بہر حال موجود ہے، بشرطیکہ اس کو ان کی زندگیوں میں عمل پیرا ہونے دیا جائے۔

(۴) جہد و سعی میں ربط و ترتیب ایک دوسرا نفع بخش پہلو ہے۔ تمام حرکات متحدہ طور پر ادا کئے جاتے ہیں۔ وہ ایک ساتھ اٹھتے ہیں، ایک ساتھ جھکتے ہیں، اور ایک ساتھ سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ یہ ایک سبق ہے اس امر کا کہ زندگی کی ان تمام باتوں میں، جس میں متحدہ کوشش کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ایک جماعت کی طرح کام کریں اور انفرادی ارادہ اجتماعی ارادہ کے تابع ہونا چاہئے۔

(۵) اس سے قیادت کا اصول بھی مستحکم ہوتا ہے۔ اسلام میں کوئی موروثی اور مقررہ ملائیت نہیں ہے۔ پیشہ ور ملاؤں کا کوئی تصور نہیں۔ حکم یہ ہے کہ جماعت کا بہترین فرد نمازوں کی امامت کرے۔ وہ جو علم اور تقوے کے لحاظ سے سب سے بہتر سمجھا جائے۔ یہ حکم قائدین کے انتخاب کے لئے ایک دستور ہے۔ ان کا انتخاب اس لحاظ سے نہ کیا جائے کہ وہ زیادہ دولت مند یا صاحب حیثیت یا کسی خاص پیشہ سے تعلق رکھتے ہیں، بلکہ ان کا انتخاب صرف علم و کردار کی اساس پر ہونا چاہئے۔ عمر کی زیادتی بھی کوئی لازمی چیز نہیں ہے۔ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ میں ایسی مثالیں موجود ہیں جبکہ آپ نے ناخواندہ لوگوں کی جماعت میں ایک کم سن بچہ کو حکم فرمایا کہ وہ

نمازوں کی امامت کیا کرے۔ کیونکہ وهی ایسا شخص تها جو قرآن کی چند آیتوں کی تلاوت کر سکتا تها۔ ایک مرتبه قائد کا انتخاب هونے کے بعد هر معامله میں اس کی اطاعت کرنی چاهئے۔ آنحضرت ص کا ارشاد هے که ''تم اپنے سردار کی اطاعت کرو اگرچه وه ایک حبشی زاده هو''۔* اسلام نے اپنی با جماعت عبادات میں بهی عسکری نظم و انضباط کو محسوس شکل دی هے۔ اذان کے موقع پر سینکڑوں، هزاروں آدمی جو ادهر آدهر بیٹهے یا گهومتے رهتے هیں، فوراً نماز کے لئے صف بسته هو جاتے هیں۔ جسمانی حرکت بهی ایک صحت مند دماغی حالت کے لئے موجب تقویت هوتی هے۔ منکر خدا نٹشے نے بهی اس امر کا اظهار کیا هے که بے حس و حرکت غور و فکر اعتبار کے قابل نهیں۔ نهایت صحت مند خیالات وه هیں جو صحیح جسمانی حرکات کے دوران میں پیدا هوتے هیں۔

(٦) مسلمانوں کی نماز میں اتحاد کا ایک اور اهم عنصر یه هے که تمام کرۂ ارض پر هر مسلمان اپنا رخ ایک مرکز یعنی کعبة الله کی طرف کرتا هے۔ یه یگانگت ایک عالم گیر اخوت کے احساس کو تقویت بخشتی هے۔ جب تمام مسلمانوں کو قرآن یه حکم دیتا هے که وه نماز ادا کرتے وقت اپنا رخ کعبه کی طرف پهیر لیا کریں تو وه اس کے ساته یه بهی اضافه کرتا هے که یه عبادات کی کوئی اصل نهیں هے، بلکه اتحاد کے لئے مزید تقویت کا ایک ذریعه هے۔ ورنه ''مشرق و مغرب الله هی کے لئے هے، تم جس سمت بهی اپنا رخ کرو گے، الله هی کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ اصل چیز نیکی کی طرف سبقت کرنا هے''۔*

(٧) انفرادی یا اجتماعی عبادات کے لئے کسی قسم کی

* اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی — بخاری

خاص عبادت گاہیں مثل کنیسہ اور کنشت کے لازمی نہیں ہیں۔ آنحضرت کا فرمان مبارک ہے کہ ”خدا نے تمام کرۂ ارض کو ہمارے لئے مسجد قرار دیا ہے“۔† جہاں کہیں بھی نماز کے وقت ایک یا ایک سے زائد مسلمان اپنے آپ کو موجود پائیں، وہاں وہ تنہا یا جماعت کے ساتھ نماز ادا کر سکتے ہیں۔ نیز عبادت کے لئے کسی قسم کے ساز و سامان کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

نماز خدا کے ساتھ براہ راست ربط و تعلق ہے۔ کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت نہیں۔ کسی پیغمبر یا اوتار کا کوئی وسیلہ نہیں ڈھونڈا جاتا۔ اپنی مناجات میں ایک مسلمان اپنے لئے اور دوسروں کے لئے، جن میں آنحضرت ؐ بھی شامل ہیں، دعائیں مانگتا ہے۔ آنحضرت ؐ پر صلوٰۃ و سلام کا نذرانہ اس شکریہ میں پیش کرتا ہے کہ آپ کے ذریعہ سے اس کو ہدایت حاصل ہوئی۔ آنحضرت ؐ بھی خدا کے بندوں میں سے ایک ہیں اور اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ اس طرح ایک مسلمان جماعت میں رہ کر بھی خدا کے ساتھ تن تنہا رہتا ہے، نیز اپنے اجتماعی وجود کو جماعت میں رہ کر مستحکم کرتا ہے۔

اسلام کا طریق عبادت اولاً اس کے اجتماعی مذہب ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا ہر حکم بلا واسطہ یا بالواسطہ معاشرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کسی انسان کو جماعت سے علیحدہ ہو کر اپنی نجات تلاش کرنے کی ممانعت کرتا ہے۔ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ عبادت مقصود بالذات نہیں ہے، بلکہ یہ شخصی اور اجتماعی اصلاح و ترقی کا ذریعہ ہے۔ اس کا

---

* وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ—البقرہ - ۱۱۵ -

† وجعلت لی الارض طیبۃ و طھورا و مسجدا—شیخین، نسائی -

مقصد انسان کے اجتماعی اخلاق کو ترقی دینا ہے - یہ اس کو جمہوری معاشرہ میں ، جس کا معیار عمل عام فلاح و بہبود ہوتا ہے ، کام کرنے کی تربیت دیتی ہے - قرآن کہتا ہے کہ اگر عبادت ان مقاصد سے عاری ہو ، تو وہ عبادت نہیں رہتی - قرآنی تعلیمات میں نماز اکثر مقامات پر زکواۃ کے ساتھ مثل لازم و ملزوم کے یکجا بیان کی گئی ہے - قرآن کے آغاز ہی میں ہم مذہبی زندگی کے تین لوازم یکجا پاتے ہیں - ھدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب و یقیمون الصلواۃ ومما رزقنھم ینفقون (بقرہ—۳) ''متقی انسانوں پر (فلاح و سعادت کی) راہ کھولنے والی (متقی انسان وہ ہیں) جو غیب (کی حقیقتوں) پر ایمان رکھتے ہیں ، نماز قائم کرتے ہیں ، اور ہم نے جو کچھ روزی انہیں دے رکھی ہے ، اسے (نیکی کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں''- '' کیا تم نے اس کو دیکھا جو قانون مکافات یعنی نظام اخلاق کا انکار کرتا ہے ؟ یہ وہ ہے جو یتیموں سے کنارہ کش رہتا ہے اور غریبوں کو کھانا کھلانے کی دوسروں کو ترغیب نہیں دیتا ''-* '' ان لوگوں کے لئے خرابی ہے ، جو نماز تو پڑھتے ہیں لیکن اپنی نمازوں سے غافل ہیں ، یہ نمود و نمائش کے لئے نماز پڑھتے ہیں اور خود کو خیرات سے روکتے ہیں ''- چونکہ نماز ایک اجتماعی نسبت رکھتی ہے ، اس لئے وہ شخص جو نماز پڑھتا ہے' اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی عبادت میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہ کرے بلکہ خدا سے مناجات کرتے وقت جمع متکلم کا صیغہ استعمال کرے - ''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں''- ''خدایا ! ہم تیری مددچاھتے ، تجھ پر بھروسہ کرتے ، اور تیری بہترین طریقہ پرحمد و ثناء کرتے ہیں ''-

* الماعون—۱ - ۲ - ۳ - ۴

نماز با جماعت کے بعد یہ اجتماع دیگر تمام مقاصد زندگی کی تکمیل کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ عام فلاح و بہبود کے مسائل زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ امام انہیں تمام اہم موضوعات پر مخاطب کرتا ہے۔ سیاسی اور معاشی مسائل بحث و تمحیص کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ کوئی شخص بھی کھڑا ہو کر اپنی انفرادی حاجت کو ملت کے روبرو پیش کر سکتا ہے۔ ہر مسئلہ پر نماز کا ماحول اثر انداز ہوتا ہے، کیفیت و مزاج پر اخلاق اور روحانی رنگ غالب ہوتا ہے اور نفسیاتی طور پر فضا صداقت اور خیر خواہی سے معمور ہوتی ہے۔ ایک قوم جس کی عبادت کا یہ تصور ہو، اسے کسی انجمن اور اجتماعات کی ضرورت نہیں۔ اسلام کے آغاز میں صرف یہی مسلمانوں کا اجتماع تھا، جہاں امن و جنگ کے اہم مسائل پر بحث کی جاتی تھی۔ صدر جمہوریہ اپنی تجاویز پیش کرتا تھا اور نماز کے بعد احکام صادر کرتا تھا۔ جماعت کا کوئی رکن کسی مسئلہ کی بابت جسے وہ قابل اعتراض سمجھتا تھا، کھلے طور پر نکتہ چینی کر سکتا تھا۔ بار بار کی یکجائی کے سبب ہر کوئی دوسرے سے باخبر اور واقف تھا۔ سیاسیات میں کوئی مخفی حکمت عملی نہیں تھی۔ ہر چیز برملا اور منظر عام پر تھی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے نماز باجماعت کے آئین میں کس قدر عناصر عام فلاح و بہبود اور قومی زندگی کے جمع کردئے ہیں۔ نماز زندگی کے لئے روشن خیالی اور انضباط کا موجب اور انفرادی و اجتماعی اخلاق کا سب سے بڑا سہارا بن جاتی ہے۔ عبادت کے لئے کسی بڑے آداب و تکلف یا رسوم کی ضرورت نہیں۔ نہ مورتیں ہیں، نہ تصاویر اور نہ ملّا یا منتر و افسوں۔ خداؤں یا فرشتوں یا ارواح کی دہائی بھی نہیں

اور نہ ھی درمیانی واسطوں کی شفاعت کی طلب گاری ھے۔ نمازیں صرف اخلاقی اور اجتماعی اصلاح و ترقی اور زندگی کے لئے آمادگی کے طور پر کام میں لائی جاتی ھیں۔ حیات دنیوی کے مقابلہ میں آخرت کی زندگی ثانوی حیثیت رکھتی ھے۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ھے کہ وہ اس طرح دعا مانگا کریں کہ ''خدایا! ھمیں یہاں اور آخرت کی زندگی میں خوشحالی عطا فرما''۔* کیونکہ ھم جس طرح یہاں زندگی بناتے ھیں اس سے آخرت کی زندگی کا تعین ھوتا ھے۔ ''جو یہاں بے بصیرت ھوگا وہ آخرت میں بھی بے بصیرت رھیگا''۔† اسلام حیات موجودہ کا مذھب ھے، محض دوسری زندگی کی بابت ما فوق تجربہ اسرار یا اذعانات پر ایمان لانا نہیں۔ اسلام کوئی اذعانات نہیں رکھتا۔ یہ ایک طریق زندگی ھے، جس کا تعین فلسفۂ زندگی سے ھوتا ھے۔ جس کی تعلیم ھے کہ زندگی جینے کے قابل ھے کیونکہ اس کا جوھر عقلیت ھے اور تمام حقیقی اقدار محفوظ رکھے جائیں گے۔

صراط مستقیم

ھمیں حکم دیا گیا ھے کہ ھم صراط مستقیم پر چلنے کی دعا مانگا کریں۔ لیکن اس صراط مستقیم کے شناخت کس طرح کی جائے۔ فلسفوں اور مذھبوں کے تمام باھمی جھگڑے اور نظریات و تصورات کی آویزشیں اسی صراط مستقیم کے تعین و تعریف کے متعلق ھیں۔ اب ھمیں اس تصور کی کسی قدر دقت نظر سے تشریح کرنے کی اجازت دیجئے۔ راہ وہ ھے جو ایک منزل مقصود تک لیجاتی ھے۔ یہ مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ھے۔ انسان کی

---

* ربنا آتنا فی الدنیا حسنة—بقرہ ۲۰۱۔

† اسرائیل—۷۲۔

زندگی ایک دنیائے مقاصد ہے - بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان لا تعداد مقاصد اور ان کے حصول کے بے شمار ذرائع رکھتا ہے -لیکن ان میں سے بہت سے مقاصد چند حقیقی اقدار سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں ، جن کی تحصیل محض ان کی ظاہری خوبی کے سبب کی جاتی ہے - صداقت ، حسن ، اور خوبی کی تلاش اس لئے نہیں کی جاتی کہ وہ خارج میں اپنے کوئی مقاصد رکھتے ہیں ، بلکہ انسان ان کو بالذات قابل قدر محسوس کرتا اور سمجھتا ہے - افلاطون نے خیر اعلیٰ کا تصور قائم کیا جو تمام حقیقی اقدار کو اپنے میں مجتمع کر لے - انسان بالآخر خیر اعلیٰ کے حصول کے لئے جد و جہد کرتا ہے - انسان ایک غیر مطلق وجود ہے ، جو اپنے اندر مطلقیت کے امکانات رکھتا ہے - اس لئے کوئی جزوی ، محدود یا ادھوری چیز اس کی کاملاً تسکین پذیری کا باعث نہیں ہو سکتی - صراط مستقیم کا تصور ایک صحیح مقصد کے تخیل کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت سے ہے - کسی راہ یا راہوں پر گامزن ہونے سے پہلے ہمارے پیش نظر کوئی مقصد ہونا چاہئے ، جو ہمیں وہاں تک لے جاسکے - حیات کا لفظ دو مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے - ہم مادی اور حیوانی ترکیب رکھتے ہیں ، اور حفظ ذات کے ان قوانین کے تابع ہیں جو ان پہلوؤں کی نگہداشت کرتے ہیں - انسان مثل دیگر حیوانوں کے اپنے جسم کی حفاظت کیلئے جد و جہد کرتا ہے - یہ غذا کا خواہاں ہے ، اور ان چیزوں سے بچاؤ چاہتا ہے جو اس کے مادی وجود کو خطرہ میں ڈالتے ہیں - اگر انسان محض مادی جسم ہوتا تو اس کی زندگی کا مطمح نظر صرف قوت اور صحت کو برقرار رکھنا ہوتا ، اور جو راہ اس کو اس مقصد کی طرف لیجاتی وہ جسمانی قابلیت کی راہ ہوتی - مگر یہ چیز اس کو دیگر حیوانات

سے ممتاز نہ کرتی ۔ انسان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ ایک باشعور ، ذی عقل نفس رکھتا ہے ، اس لئے اس کا مقصد حیات عقلیت و شخصیت کی اصلاح و ترقی ہونا چاہئے ۔ اگر اس کی یہ عقلیت مادی وجود کی کشمکش میں محض حیاتی آلۂ کار ہوتی تو یہ اس کو دیگر حیوانات پر زیادہ برتری عطا نہ کرتی ، کیونکہ یہ اپنی جبلت کے ذریعہ زیادہ کامیابی اور سیدھے طریقہ سے وہ چیز حاصل کر لیتے ہیں جس کو وہ محض عقل کے ذریعہ بھونڈے اور بے ڈھنگے طریقہ پر حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے ۔ حیوانات کی جبلتوں کی حیرت انگیزیاں انسانی عقل تک کے لئے بھی ناقابل فہم ہیں ۔ اس لئے عقل کا مقصد محض ہمارے حیاتی وجود کی خبر گیری کے لئے ایک ضمنی امداد نہیں ہو سکتا ۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کا ارشاد ہے ’ اگرچہ زندگی کے لئے روٹی ضروری ہے ، لیکن ہم صرف روٹی ہی سے زندہ نہیں رہتے‘۔ روحانی زندگی کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں جسمانی زندگی اپنا سفر حیات ختم کرتی ہے ۔ جب ہم اپنی جسمانی احتیاجات کی تکمیل کر لیتے ہیں تو ہم صرف اپنے انسان ہونے کا آغاز کرتے ہیں ۔ جب تک ہم اپنی جسمانی ضروریات کی تسکین پذیری میں منہمک رہتے ہیں ، ہم حیوانات کے درجہ میں ہوتے ہیں ، بلکہ حاصل شدہ کامیابی کے لحاظ سے ہم ان سے بھی نیچے گر جاتے ہیں ۔ جیسا کہ روحانی زندگی سے غفلت برتنے والوں کے متعلق قرآن کہتا ہے ، ” وہ جانوروں کی طرح ہیں ، نہیں بلکہ ان سے بھی فروتر “۔* انسان دو زندگیاں گذارنے پر مامور ہے : ایک حیات جسمانی اور دوسری حیات روحانی ۔ مگر ان دو کو ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے ۔ ادنیٰ کو اعلیٰ کے ماتحت کرنے سے یہ

* اولئک کالانعام بل ہم اضل — اعراف ۱۷۹ ۔

ہم آہنگی حاصل ہوسکتی ہے ، یہ نہیں کہ ادنیٰ کو فنا کر دیا جائے ۔ تمام بڑے مذاہب حیات کے یہ دو مفہوم تسلیم کرتے ہیں ۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ[ع] کا ارشاد ہے ، جو کوئی حیات کے صرف جسمانی پہلو کی متابعت کرتا وہ اعلیٰ زندگی سے محروم ہوگا ، اور جو ادنیٰ کو کھونے کے لئے آمادہ ہے وہ اعلیٰ زندگی حاصل کر لیگا ۔ چونکہ ہم زندگی سے کوئی اعلیٰ تصور قائم نہیں کر سکتے اس لئے ہم کہتے ہیں کہ مقصد حیات ، خود حیات ، زائد حیات ، اعلیٰ حیات اور زیادہ ہمہ گیر حیات ہے ۔ لہذا خیر اعلیٰ اپنے تمام امکانات کے ساتھ حیات کی تکمیل پذیری ہے ، جو زندگی کے ابدی اقدار کی وصولیابی اور اس کے ممکنات کی وقوع پذیری ہے ۔

جب کبھی قرآن اعلیٰ اور ادنیٰ زندگی کا مقابلہ کرتا ہے تو یہ بالعموم حیات دنیا اور حیات آخرت کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے ۔ مگر آخرت کوئی مادی یا مکانی تصور نہیں ہے ۔ اس سے کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ آخرت یہاں کی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے ، اور یہاں کی زندگی گویا اس کے لئے ایک تیاری ہوتی ہے ۔ اعلیٰ نہ از روئے مکانی برتر ہے اور نہ از روئے زمانی مابعد ہوتا ہے ۔ اسلام زمان میں بھی انسانی 'انا' کی بقا کا یقین رکھتا ہے ، لیکن دنیا و آخرت میں ادنیٰ و اعلیٰ کا تعین اس قسم کی زندگی سے ہوتا ہے جو بسر کی جاتی ہے ۔ دنیوی زندگی کے محض جسمانی مطالبات اور حیوانی خواہشات کو روز مرہ کی زندگی میں حاصل کیا جاتا ہے ۔ اس لئے جب ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ ہماری ہدایت صراط مستقیم پر ہو ، تو یہ راہ مافوق جسمانی اقدار کی وصولیابی کی طرف لیجانے والی ہونی چاہئے ۔

سورۂ فاتحہ راہ صداقت کا ایک نہایت سادہ معیار پیش کرتی ہے - یہ راہ انعام یافتوں کی ہے ، وہ جنہیں حقیقی اقدارحیات سے سرفراز کیا گیا -

ہم اپنی عضویاتی ترکیب کی بابت بہت کم علم رکھتے ہیں ، لیکن یہ جانتے ہیں کہ صحت یا اس کی ضد بیماری کا کیا مفہوم ہے - ہم تندرست و توانا اشخاص کو ان کی زندگی اور سرگرمیوں سے پہچانتے ہیں - یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک اوسط آدمی صحت کا علم و احساس رکھتا ہے - زندگی کے چند طریقے ہیں جو جسمانی صحت کی طرف لیجاتے ہیں ، اور یہ ہم سب جانتے ہیں کہ صحت بڑی نعمت ہے - اگر ہم محض جسمانی وجود ہوتے تو ہمارا انتہائی مقصد جسمانی صحت ہوتی ، اور جس راہ سے ہم اسے حاصل کرتے وہی صحیح راہ ہوتی - یہ ان کی راہ ہوتی جنہوں نے صحت حاصل کی - لیکن جب ہم کسی انسان کو انعام یافتہ تصور کرتے ہیں تو ہمارے خیال میں اس کی جسمانی صحت مقدم نہیں ہوتی ، اگرچہ کامل انعام یافتگی میں یہ بھی شامل ہے - اجسام کے ساتھ ساتھ ارواح بھی ہیں - ہماری انعام یافتگی روحانی انعام یافتگی پر مشتمل ہونی چاہئے - اگر کسی انسان کی عقل کامل اور قوی ہے تو یہ زندگی میں صحیح رہنمائی کرتی ہے - اور اگر محبت اس کے اعمال میں رچی ہوئی ہے تو وہ انعام یافتہ ہے - اس لئے جو انسان انعام یافتہ ہوگا وہ علم صحیح کا حامل ہوگا - تعقل اس کا امتیازی وصف ہوگا - اگر اس کا شعور ناقص ہے تو وہ انعام یافتہ نہیں کہلا سکتا - جیسا کہ قرآن کہتا ہے : ''جس کو حکمت سے سرفراز کیا گیا اس نے خیر کثیر پائی'' - اس لئے انعام یافتگی مشتمل ہے جسمانی صحت اور روحانی فلاح و سعادت پر - صداقت کی بصیرت انعام یافتگی کا لازمی جزو ہے -

چونکہ انسان ایک مدنی الطبع وجود ہے ، یہ محض اپنی علیحدہ فردیت میں انعام یافتہ نہیں ہوسکتا ۔ ایک نیک زندگی اپنی خیر و برکت پھیلائے گی ۔ نیکی کو مؤثر اور متحرک ہونا چاہئے ۔ اس لئے نیکی فوز و فلاح کا ایک ضروری عنصر ہے ۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے ۔ راہ کی صحت کے لئے بھی ہمیں کوئی عملی معیار استعمال کرنا چاہئے ۔ نماز، جس کی تشریح کی ہم کوشش کر رہے ہیں ، اس معیار کو استعمال کرتی ہے ۔ اگر انعام یافتگی سے مفہوم علم اور نیکی سے ہے تو ہم جانتے ہیں کہ انعام یافتہ وہ ہیں جو صحیح راہ پر گامزن ہوئے ۔ انعام یافتہ وہ ہیں جو لفظ کامیابی کے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے کامیاب ہوئے ۔ اگر ہم صراط مستقیم کو جاننا چاہتے ہیں تو اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کی زندگیوں کا مطالعہ کریں جو کامیاب ہوئے ۔ اگر کوئی انسان دولت کمانا چاہتا ہے تو وہ دولت کمانے والوں ، یا ایسے لوگوں کے طریقوں کو جنہوں نے دولت جمع کی ہے ، غور سے دیکھے گا اور ان لوگوں کو اپنا نمونہ بنائے گا ۔ اگر وہ انکی پیروی کریگا تو وہ یقیناً مالدار ہو جائے گا ۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے ، ”جنہوں نے اس دنیا کی بھلائی چاہی تو وہ انہیں دے دی جائیگی“* ۔ کیونکہ عام قانون یہ ہے کہ انسان جس چیز کی کوشش کرتا ہے وہ اسے حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن اگر دولت ہی ان کا مطمح نظر رہی ہے تو انہوں نے زندگی کے اعلیٰ اقدار سے غفلت برتی ہے اور اعلیٰ مفہوم میں اپنے ہی ہاتھوں خود کو زندگی سے محروم رکھا ہے ۔ انہوں نے سایہ کو پکڑ لیا اور اصل کو ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے ۔ حقیقی کامیابی صرف اس انسان کو حاصل ہوتی ہے جس نے اپنے علم ، محبت اور نیکی کو ترقی

* ومن یرد ثواب الدنیا نوته منها — آل عمران — ۱۴۶

دی ہو - اور اس کا ایمان اس بنیاد پر استوار ہو کہ یہ چیزیں حقیقی اور دائمی ہیں - اور وہ خالق کائنات کی ذات میں پیوست ہیں، جس کی وہ بحیثیت خدا کے تعظیم و پرستش کرتا ہے - یقیناً صرف ایسا ہی انسان خود کو مسرور اور مامون محسوس کرتا ہے، اور وہ لطف حاصل کرتا ہے جو استکمال نفس اور خوشحالی سے پیدا ہوتا ہے - قرآن زمانہ کی قسم کھاتا ہے، اور تمام تاریخ انسانیت کو بطور گواہ کے پیش کرتا ہے - ''قسم ہے زمانے کی، تمام انسان گھاٹے میں ہیں، بجز ان کے جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، اور جو ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرتے رہے''* - بائبل بھی اس صداقت کو ان پر زور الفاظ میں پیش کرتی ہے: ''یہ چیز انسان کو کیا نفع بخش سکتی ہے، اگر وہ تمام دنیا حاصل کر لے اور اپنی روح کو ضائع کر دے؟'' یہاں روح سے مراد وہ تمام فوق الطبیعی اقدار ہیں جن کا مقام ذات الٰہی میں ہے - یہ انفرادی خواہشات اور مادی حاصلات پر مبنی نہیں اور نہ یہ صرف طبیعی زندگی کی خبر گیری اور پرداخت کے مترادف ہے -

ہم انسانوں کی زندگیوں کو دیکھ کر کامیابی اور ناکامی کے معنی معلوم کر سکتے ہیں - ہم صرف ان کی تعظیم و توقیر کرتے ہیں جو اعلیٰ مفہوم میں کامیاب رہے - مثال ایک قوی الاثر معلم ہے - اس لئے ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے طاق دل میں ان زندگیوں کے نقشوں کو سجائیں جو کامیاب اور فائز المرام ہوئے - ان کے نقش قدم پر چلنا گویا صراط مستقیم پر گامزن ہونا ہے - جس

---

* و العصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصلحت - الآیہ -
—العصر—۱ - ۲ - ۳

کے لئے ہم دست بہ دعا ہوتے ہیں۔ انسان خیر و برکت کا طلب گار ہے، لیکن وہ نہیں جانتا کہ حقیقی نعمتیں کہاں ہیں۔ جیسا کہ رومیؒ نے کہا ہے کہ ہر شخص زر و طلا کا آرزو مند ہے، لیکن بہت کم ایسے ہیں جو کھرے کھوٹے میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی۔ اسی طرح جو چیز ہمیں لبھاتی اور خیر و برکت کے وعدوں سے بہلاتی ہے، ایفائے عہد نہیں کرتی۔ باطل سراغوں کی پیروی کرنے کے بعد ہمیں آخر میں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم خجستگی، ہم آہنگی اور خوشحالی کی منزل مقصود سے منحرف ہو چکے ہیں۔

باب دهم

اخلاقیات اسلام

علم اخلاق کی مختلف طریقوں سے تعریف کی جا سکتی ھے - یہ علم عادات و اطوار کی اچھائی یا برائی کا مطالعہ کرنا یا خیر و شر کی تحقیق کرنا ھے - اسی کے ذریعہ نیک و بد کا تعین ھوتا ھے - وہ کیا نصب العین ھے جس کو انسان اپنا مقصد بنا تا ھے یا جس کو اپنا مقصد بنا نا چاھئے ؟ آیا انسان کی زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد ھے یا مختلف مقاصد ھیں جن کے حصول کی پیروی کی جاتی ھے اور جو باھم ایک دوسرے سے کوئی رشتہ نہیں رکھتے ؟ چونکہ اخلاقیات مجموعی طور پر عادات و اطوار کا مطالعہ ھے اور یہ کسی خاص قسم کی طرز و روش کی تحقیق نہیں ، اس لئے بجز ایک مقصد کے اس کے کوئی خاص مقاصد نہیں جو یہ غور کرنے کے لئے بطور خود رکھتی ھے - یہ وہ برتر اور آخری مقصد ھے جس کی طرف ھماری ساری زندگیوں کو موڑا گیا ھے - اگر آخری مقصد کا تعین ھو جائے تو نصب العین کی نسبت سے ان خاص مقاصد کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ھے کہ یہ آیا ترقی میں ممد ھیں ، یا درپئے تنزل ھیں ، یا ان ہر دو سے لاپروا ھیں - بہت سے ایسے مقاصد ھیں جن کا انسان اپنی ذات کے لئے خواھش مند ھوتا ھے - ایسے مقاصد کو بنیادی خوبیوں یا حقیقی اقدار سے تعبیر کیا جاتا ھے - مثال کے طور پر علم ، حسن اور مسرت کی خواھش صرف اس لئے

نہیں کی جاتی کہ وہ دیگر مقاصد کے حصول کے ذرائع ہیں، بلکہ یہ اصلاً قابل قدر ہوتے ہیں، جن کی خوبی خود ان کی ذات میں ہوتی ہے۔ یہ اخلاقیات کا کام ہے کہ وہ اسے عام اصول مہیا کرے جن سے ان بنیادی مقاصد کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکے۔ ان خود بخود پیدا ہونے والے مفادات کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے؟ کیا یہ ان مطلوبہ مقاصد کا حصول ہے جن میں کوئی ذاتی خوبی ہے، یا کوئی بنیادی معیار، کوئی اصول، یا باہم متناسب اصولوں کا مجموعہ ہے، جس کے ذریعے ہم اپنے مفادات کی تسکین پذیری کی قدر و قیمت کا تعین کر سکیں؟

خیر اعلیٰ کی ماہیت کی بابت فلاسفہ کے نظری مباحث سے کہیں زیادہ مذہبی اعتقاد اخلاقیت کا سب سے بڑا سہارا رہا ہے۔ حکمیاتی طور پر اخلاقیات پر بحث مذہبی اعتقادات یا الٰہیاتی مفروضات سے ہٹ کر کی جاتی ہے۔ لیکن نصب العین کی اساسی نوعیت کی بابت کوئی تفصیلی بحث جس سے نیک و بد کا تعین ہو سکے، اس امر پر ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اپنے اعتقاد و ایمان کی تعریف حقیقت اولیٰ کی نسبت سے کریں، جس میں کہ ہماری زندگیاں جڑ پکڑے ہوئے ہیں اور جہاں سے کہ وہ نکلتی ہیں۔ اخلاقیات اسلام اپنا کوئی علیحدہ وجود نہیں رکھتی بلکہ وہ مذہبی اعتقاد کے اساسات سے بطور ضمنی نتائج کے پیدا ہوتی ہے۔

جس کو حکمیاتی اخلاقیات خیر اعلیٰ کی تلاش، نصب العینی مقصد، یا مقصد اولیٰ کہتی ہے، مذہب اس کو تلاش حق سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ صرف اصطلاحات کا فرق ہے۔ افلاطون اسے خیر کہتا ہے اور اسلام اسے خدا کہتا

ہے - اس لئے اساس مقاصد کی بحث میں ہم خدا ، خیر ، اور نصب العین کے مرادفات آزادی کے ساتھ استعمال کرتے رہینگے -

فلسفیانہ اخلاقیت کی طرح اسلام کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ تمام مقاصد ایک آخری مقصد میں جا کر مل جاتے ہیں - ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ اسلام کے پاس اسکا ایک سادہ جواب ہے - موجودات کی وحدت سے زندگی کی نمود ہوتی ہے ، جو خدا کی یگانگت کا ظہور ہے - مادی کائنات بھی ایک وحدت ہے ، کثرت نہیں - کائنات ، حیات اور نفس وحدت میں کثرت سے متصف ہیں - باوجود اپنی اس تمام رنگا رنگی کے موجودات کا مقصد یک رنگی ہے اور یہ فرض کیا جاتا ہے کہ تمام قوانین فطرت کسی ایک ہی قانون کے برگ و بار ہیں - اخلاقیت کو بھی کسی ایک ہی قانون وحدت و کثرت کے موافق ہونا چاہئے - انسان کی خواہشات گونا گوں ہیں ، جو اپنے پیش نظر کئی خاص مقاصد رکھ لیتی ہیں - انسان بحیثیت فرد کے ایک عضوی وحدت ہے اور بحیثیت ایک اجتماعی وجود کے ہیئت اجتماعیہ کا ایک جزو ہے - عضوی حیات اساسی مقصد کی وحدت اور یگانگت کو ظاہر کرتی ہے - یکساں روی حقیقت اور صداقت کی کسوٹی ہے - انسانی خواہشات کی کثرت بے جوڑ اور بے ترتیب حالت میں چھوڑی نہیں جا سکتی - کوئی قابو میں رکھنے والا اصول اور مقصد ہونا چاہئے - اسلام میں فطرۃ اللہ کے ذریعہ اس کمی کو پورا کیا گیا ہے -

سابقہ ابواب میں فطرۃ اللہ پر بحث کرتے ہوئے ہم تعلیمات قرآن کی اساس اس چیز کو ثابت کر آئے ہیں کہ

خدا ایک اعتدال پسند تخلیقی مشیت ہے۔ یہ نہ الٰہیاتیوں کا مطلق ہے، نہ ارسطاطالیس کا جوہر عقل اور نہ یہ نو فلاطونیت کی تعلیم کے بموجب ایک سرچشمہ ہے جس سے مخلوقات پھوٹ کر بہہ نکلتی ہیں۔ اسلام کا خدا ایک غائت اور مقصد کے تحت پیدا کرنے والی ہستی ہے۔ یہ خالص تخیل نہیں ہے بلکہ ایک برتر شعوریت ہے، جو اپنی ذات میں زندگی کے اقدار سموئے ہوئے اور ان کے تحفظ کی کفیل ہے۔ قرآن کہتا ہے: "اس کے لئے اچھے صفات ہیں"۔* اس طرح اسلامی اخلاقیات کا یہ مفروضہ ہے کہ زندگی کے بنیادی اقدار مثل محبت، علم، اور مسرت ارتقاء کے کسی خاص پہلو کے عارضی، موضوعی، اضافی، اور گمراہ کن نتائج نہیں بلکہ معروض اور بنیادی ہیں۔ ان کے کمال کا ادراک نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ایک نصب العین کی حیثیت سے ان تک رسائی پانے کا ایک دائمی سفر جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہمارے ذاتی اور اساسی اقدار، خدا یا ایک نصب العین بطور ذاتی صفات کے بتلائے گئے ہیں۔ چونکہ ان اقدار کا ایک وحدت سے ظہور ہوا ہے لہذا یہ ضرور ایک دوسرے سے متعلق ہوں گے۔ یہی ایقان تھا جس پر افلاطون نے مناظرۂ منطقی کے ذریعہ رسائی حاصل کی ہے۔ اس کے سہ گانہ اساسی اقدار، صداقت، حسن اور خوبی، اصلاً ایک ہی حقیقت کے تین رخ تھے جسے وہ خیر سے تعبیر کرتا ہے۔

ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اسلام خیریت کو خدا کی صفت گردانتے ہوئے خیر کے تصور کا کس طرح تعین کرتا ہے۔ خدا خالق ہے، اس لئے خیریت بھی تخلیقی

* فلہ الاسماء الحسنی۔ اسرائیل — ۱۰۰

ہونی چاہئے - کوئی چیز مجہول تصوری خیریت کے مثل نہیں ہو سکتی - اس لئے کہ خیر سکونی تصور نہیں بلکہ ایک متحرک قوت ہے - اس کی نسبت محض علم سے نہیں بلکہ عمل سے ہے جو صداقت کو محسوس شکل دینے کی کوشش کرتا ہے - قرآن کہتا ہے : خدا جو خالق کائنات ہے ، وہ پالنے والا ، مہربان اور احسان کرنے والا خدا ہے - محبت بحیثیت ذاتی قدر کے حقیقت اولیٰ کی فطرت سے پیدا ہوتی ہے - اخلاق اعمال کی تحریک پالنے ، پرورش کرنے ، اور ہمیشہ موجودات میں وافر و کثیر ہم آہنگیاں پیدا کرنے سے ہوتی رہنی چاہئے - خیر وہ ہے جس کا میلان توفیر و تکثیر کی طرف ہو - اور شر دوسروں کے لئے ایسا ہی تباہ کن ہے جیسا کہ خود اپنے لئے - قرآن بار بار اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ برائی کی سزا اسی جیسی برائی سے ہے - جس کے معنی اس کے نفی کے ہیں ، لیکن نیکی کا بدلہ کئی گنا زیادہ ہوتا ہے - ” من جاء بالحسنة فله عشر امثالها و من جا بالسیئة فلا یجزی الا مثلها و هم لا یظلمون ط “ (الا نعام-۱۶۰) ” یاد رکھو جو کوئی (اللہ کے حضور) نیکی لائیگا تو اس کے لئے اس کے عمل نیک سے دس گنا زیادہ ثواب ہوگا ، اور جو کوئی برائی لائیگا وہ برائی کے بدلہ سزا نہیں پائیگا مگر اتنی ہی جتنی برائی کی ہوگی - اور ایسا نہ ہوگا کہ لوگوں کے ساتھ ناانصافی کی جائے - “ یہاں سے ہم ایک بہتر تعریف اس امر کی حاصل کر سکتے ہیں کہ نیکی کس چیز کو سمجھا جائے اور بالآخر خیر کیا چیز ہے - خیر تخلیقی اور تعمیری ہے - یہ خود کو اور بقیہ زندگی کو برقرار رکھتی ہے - ایک لذت پسند (لذتیہ)

خیر کی اس طرح تعریف کرتا ہے کہ وہ چیز جس کی خواہش کی جائے اور جو اس کو لذت عطا کرے۔ لیکن یہ نہایت ناقص تعریف ہے۔ کیونکہ ایک گمراہ نفس ایسی بہت سی چیزوں کا آرزو مند ہوتا ہے جو ضرر رساں اور خود کو تباہ کرنے والی ہوتی ہیں، اور لذت بعض اوقات بہت سی ایسی چیزوں سے وابستہ ہوتی ہے جو زندگی کو تباہ اور خود لذت کے مقاصد ہی کو ختم کر دیتی ہیں۔ ہم نفسیاتی طور پر جانتے ہیں کہ لذت ہمیشہ ہمارے افعال کی محرک نہیں ہوتی۔ ایک نیکوکار لذت سے زیادہ الم میں مبتلا ہونے کے باوجود اپنے نیک مقاصد کے حصول کے درپے ہوتا ہے اور ایک بدکار بھی اپنے شہوات کا ناعاقبت اندیشانہ طریقہ پر پیچھا کرتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اسے لذت بخشتے ہیں، بلکہ وہ تحکمانہ و ناقابل ضبط تحریکات بن جاتے ہیں، جن کو بعض اوقات خود کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اسلام کی رو سے خواہشات کی تکمیل کوئی نیکی نہیں ہے۔ نیکی سے مراد اقدار حیات کی حفاظت کرنا ہے۔ لیکن زندگی محض مادی یا حیاتی نہیں ہے۔ ہم اپنے اجسام سے زیادہ کچھ اور بھی ہیں۔ اجسام ہماری روحوں کے آلات ہیں۔ انسان کی زندگی مقاصد کی وصولیابی پر مشتمل ہے، جو ہماری جسمانی ضروریات پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ہم جسمانی ضروریات میں حیوانی دنیا کے ساتھ ہیں۔ انسانیت کا آغاز جسمانی برتری کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں نیکی نہ صرف تحفظ ہے بلکہ ہماری اصلی حقیقت اور ہماری اصل ذات کی اصلاح و ترقی ہے۔

ھر برٹ اسپنسر اور دیگر ارتقائی مصنفین اخلاق کہتے ھیں کہ اخلاقی اصول موضوعی اور مافوق تجربہ نہیں ھیں ، بلکہ پشتہا پشت کے تجربہ سے حاصل کئے گئے ھیں ، جنہیں حفظ ذات اور نسلی استحکام کے کامیاب طریقوں کے مثل سمجھا گیا ھے۔ اسلام خیر کی اس تعریف سے کہ وہ تحفظی ھے ، کوئی نزاع نہیں کرتا ، مگر انسان کی بابت اس کا تصور صرف مادی عضویت نہیں ھے جو کسی نہ کسی طرح بذریعہ کشمکش و مطابقت یا تناسل و توالد کے ذریعہ اپنی بقا چاھتا ھے۔ ارتقاء پرستوں نے خیر کی نوعیت کا ٹھیک طور پر پتہ چلایا ھے۔ جیسا کہ وہ کہتے ھیں وہ بقا کی طرف میلان رکھتا ھے اور ان ھستیوں کو باقی رکھتا ھے جو اس پر عمل کرتی ھیں۔ لیکن ان کا زندگی کے متعلق تصور اور یہ تصور کہ کون سی چیز کا تحفظ کیا جائے ، نہایت محدود ھے۔ اسلام کہتا ھے کہ انسان کی روح ، روح خداوندی ھے اور اس کی تخلیق اس لئے ھوتی ھے کہ وہ خدائی صفات کو زیادہ سے زیادہ اپنے میں پیدا کرے۔ صداقت ، حسن ، محبت اور امن و خوشحالی حقیقی اقدار ھیں ، کیونکہ یہ حقیقت اولیٰ میں جاگزیں ھیں۔ ھم ان کا تصور ان کی اضافیت میں کرتے ھیں ، لیکن وہ صفات خداوندی کی طرح مطلق ھیں۔ انسان کو ان کا تحفظ کرنا چاھئے اور اخلاقیت اسی پر مشتمل ھے کہ ان کو محفوظ رکھنے کی جہد و سعی کی جائے۔

اسی طرح اسلام مذھب لذتیت کی جزوی صداقت کی بھی تائید کرتا ھے کہ لذت بھی اصلاً مطلوب ھوتی ھے۔ اس نظریہ کی تائید سے غرض یہ ھے کہ نیکی اور مسرت بالآخر ایک ھو جائیں۔ لیکن لذت کی بلا واسطہ تلاش خود اس کے

مقصد کو شکست دے دیتی ہے - مسرت ایک راست باز زندگی سے بطور ضمنی نتیجہ کے پیدا ہونی چاہئے - یہاں ہم ایک اعتراض سے دو چار ہوتے ہیں، جس کا دعویٰ ہے کہ تمام بڑے مذاہب لذت پرست ہوتے ہیں - یہ اعتراض اس حقیقت سے پیدا ہوتا ہے کہ جب مذاہب نیکی اور بدی کی جزا و سزا کا نقشہ کھینچتے ہیں تو نفسانی خواہشات کا اسلوب بیان اختیار کرتے ہیں - جنت کو غیر تکمیل شدہ خواہش کا ایک خواب تصور کیا جاتا ہے جس کی صورت مادی ہوتی ہے - اب ان بیانات پر غور کے دو طریقے ہیں - یا تو انہیں حقیقت پر محمول کیا جائے یا استعارہ سمجھا جائے - ایک بطی الفہم ذہن و دماغ ہمیشہ انہیں حقیقت پر محمول کرتا ہے - لیکن قرآن، باوجود صریح مادی تصورات کے ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ انہیں تشبیہات و تمثیلات سمجھا جائے - وہ کہتا ہے: ''جنت کی مثال، جس کا وعدہ نیکوکاروں سے کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس میں نہریں بہہ رہی ہیں، اس کے پھل اور سائے دائمی ہیں''* پھر ہمیں یہ تشبیہ ملتی ہے: ''اس باغ کی مثال جس کا وعدہ راست بازوں سے کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس میں دودھ کی نہریں ہیں، جو کبھی متغیر نہیں ہوتیں''† پھر ایک مقام پر آگاہ کیا گیا ہے کہ اس نفسانی تمثیل کو حقیقت نہ سمجھا جائے۔ ''کوئی نفس یہ جان نہیں سکتا کہ اس کی آنکھوں کی تازگی کے لئے کیا چیز چھپی ہوئی ہے - یہ اس کا صلہ ہے جو انہوں نے کمایا -''‡ آنحضرت صلعم کا خود ارشاد ہے کہ ''جس کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ کسی کان نے

* مثل الجنۃ التی وعد المتقون الخ —رعد - ۳۶

† سورہ محمد —۱۶

‡ سجدہ —۱۸ -

سنا اور نہ جس کا کسی ذہن نے تصور کیا" * ابن عباسؓ مشہور صحابی اور مفسر سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ "جنت میں بجز نام کی مشارکت کے اس زندگی جیسی غذائیں نہیں ہیں"۔

لیکن قرآن بھی نہایت لطیف و پاکیزہ تشبیہات خدا کی صفات کے بیان اور نیکی و بدی کے لئے جزا و سزا کا نقشہ کھینچنے میں استعمال کرتا ہے۔ وہی قرآن جو ایک مقام پر خدا کے لئے عرش پر متمکن ہونے کا نقشہ پیش کرتا ہے، وہی کہیں دوسری جگہ کہتا ہے کہ "خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ جو خود فروزاں اور لامکان ہے۔ نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔" † خدا کی ذاتی صفات میں سے ایک علیم و خبیر ہونا ہے، جس کے لئے بہترین مادی تمثیل نور استعمال کی گئی ہے۔ بعض فلسفیوں نے خدا کا تصور اولاً مثل نور کے کیا ہے، کیونکہ وہ اس سے بہتر مثال نہ پا سکے۔ فلاطینوس (Plotinus) کی زبردست متصوفانہ الٰہیات جس نے عیسائیوں اور مسلمانوں کے متصوفانہ فلسفہ کو متاثر کیا ہے، وہ خاص طور پر ذات مطلق کے لئے نور کی تمثیل پر مبنی ہے۔ قرآن بھی اس مثال کو استعمال کرتا ہے، لیکن وہ آگاہ کرتا ہے کہ اس کو مثل مادی نور کے نہ سمجھا جائے۔ نیکی کے زبردست انعامات میں سے ایک صلہ رویت الٰہی یا معیت ربانی بیان کیا گیا ہے۔ اس صورت میں خالق کائنات نور اور حیات ہے جو تمام اقدار وجود کو محسوس شکل دیتا ہے۔ اس لئے خاص انعام حیات خداوندی کا حصول ہے۔ اس میں انسان خدا تو نہیں بن جاتا لیکن کسی نہ کسی طرح اس کو

---

* مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔

† اللہ نور السموات و الارض مثل نورہ کمشکواۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ الزجاجۃ کانھا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ ولا غربیۃ— نور ۳۵

پا لیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے یہ اعلیٰ شعوریت نیکو کارانہ زندگی سے بطور نتیجہ کے پیدا ہوتی ہے۔ نیکو کار جو پاتے ہیں وہ مزید نور ہے اور یہی نفوس قدسیہ کی اصل آرزو ہے۔ گوئٹے کے آخری الفاظ یہ تھے: ”نور فراواں نور“۔ اس کی پوری زندگی ذہن و فن کے ذریعہ زیادہ روشنی حاصل کرنے اور زیادہ روشنی پھیلانے کی ایک مسلسل جدو جہد تھی۔ اور بوقت مرگ بھی اس نے اپنی اس تمنا کا اظہار کیا تھا۔ کیونکہ ہمیشہ اس میں ازدیاد و فراوانی ہوتی رہتی ہے۔ ”اس دن تم مومن مرد اور مومنہ عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کی روشنی ان کے آگے اور داھنے چلتی ہوگی“۔* ”اے اہل ایمان! اپنے فرائض سے باخبر رہو جو خدا نے مقرر کئے ہیں اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاؤ۔ وہ اپنی رحمت سے تمہیں دونا عطا کریگا، اور تمہارے لئے ایسی روشنی پیدا کریگا جس میں تم چل سکو گے۔ اور تمہیں بخش دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“†

اکثر یہ سوال، بے کیف لمحات میں، بعض قلوب میں پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شخص نیکی پر کیوں عمل کرے۔ مادی اور جسمانی لذات اس زندگی میں نیکی کے ضروری متلازمات نہیں ہیں۔ نیکی کی تلخ کامیوں اور بدی کی خوش وقتیوں کا منظر انسان کے پیش نظر اس وقت سے ہے جب سے کہ اس نے غور کرنا شروع کیا ہے۔ لوگ دریافت کرتے ہیں کہ نیکی کا کیا صلہ ہے۔

کوئی اس سوال کا جواب، جو شائستہ دماغوں کو بھی بھونڈا معلوم ہوتا ہے، یہ دیتا ہے کہ آخرت کی زندگی میں میزان

---

* نور ہم یسعی بین ایدیھم و بایمانھم — تحریم - ۸

† یایھا الذین آمنوا اتقوا و اٰمنوا برسولہ یوتکم کفلین من رحمتہ و یجعل لکم نوراً تمشون بہٖ و یغفر لکم — الحدید - ۲۸

درست کی جائیگی - خدا نیکی کے ساتھ خوشحالی اور بدی کے ساتھ بدحالی کا تناسب قائم کریگا - وهاں نیکوکار مزے آڑائیں گے اور بدکار ناقابل بیان مصائب و آلام کا شکار ہونگے - چونکہ تمام لوگوں کو نیکو کار بنانے کے لئے مذہب کو نصیحت کرنی پڑتی ھے اور شخصی و اجتماعی خوشحالی کے لئے برائی سے احتراز ضروری ھے ، اس لئے اس قسم کی پند و موعظت ادنیٰ سطح پر انسانیت کی اصلاح میں اپنا خاص مقام رکھتی ھے - لیکن جس طرح ذہنی ادراک کے مراتب ہوتے ھیں ، ایسے ھی اخلاقی اور روحانی حقائق کے فہم کے بھی درجات ھیں - ایسا ذہن جو ادنیٰ سطحات پر ھو اور حس کی گرفت میں محبوس ھو ، تو اس کو محسوسات ھی کی زبان میں مخاطب کرنا پڑتا ھے - لیکن جیسے جیسے ھم رفعت و بلندی حاصل کرتے ھیں ، ھمارا نیکی و بدی اور اس سے پیدا ہونے والی جزا و سزا کا تصور زیادہ سے زیادہ تعقلی رنگ اختیار کرتا جاتا ھے - اس اعلیٰ سطح پر قرآن ھمیں اخلاق حکمت سے سرفراز کرتا ھے ، اور نفسانی تشبیہات و استعاروں کا استعمال موقوف کر دیتا ھے - یہ بطور حقیقت کے خدا کا فوق تجربی تصور عطا کرتا ھے ، جو کسی چیز کے مثل نہیں - ”آنکھیں اس کو دیکھ نہیں سکتیں لیکن وہ آنکھوں کو دیکھتا ھے“ - ”وہ آسمانوں اور زمین کا نور ھے“ - کامل خوشحالی کا صلہ خداوند نور و حیات کی دید و ملاقات ھے - یہ دیکھنا ایک طرح کا ادراک ہوگا ، جو موضوع و معروض کی تقسیم سے ماوراء ھے - یہ ذات قدیم کے ساتھ گویا اتحاد ہوگا ، جس کے لئے نہ ھمارے پاس شایان ضرورت تجربہ ھے اور نہ ابواب فہم و ادراک - اکثر مقامات پر قرآن میں اس کو نیکی کا اعلیٰ ترین صلہ کہا گیا ھے - ھم آھنگی جو کائنات کی روح و مقصد ھے ، قرآن کی اصطلاح میں سلامتی سے تعبیر کی گئی ھے -

سلامتی میں متصادم افراد و عناصر اپنے وجود سے دست کش نہیں ہوتے - یہ اپنی فردیت کو برقرار رکھتے ہوئے باہم موافق ہو جاتے ہیں ، مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے مقصد کے حصول میں لگے رہتے ہیں - قدرتی حسن اور فن اسی سلامتی کے اظہارات ہیں ، جسے ہم توافق اور ہم آہنگی سے تعبیر کرتے ہیں - ذہنی ادراک بھی ایک سکون ہے ، جمالیاتی غور و فکر بھی ایک سکون ہے ، اور نیکی اور مسرت بھی سکون ہی ہیں - اس لئے جنت کو قرآن میں دار السلام کہا گیا ہے ، جہاں کے رہنے والوں کا باہمی پیام و سلام سلامتی ! سلامتی ! ہوگا - خود لفظ اسلام کے معنی سلامتی کے ہیں اور اس کے دوسرے معنی خود کو خدا کی مشیت کے سپرد کر دینے کے ہیں - یہ دونوں معنی باہم مل کر اخلاقیت اور روحانیت کا جوہر بن جاتے ہیں - انفرادی ارادہ عالمی ارادہ کے سپرد ہو جانے سے سلامتی اور ہم آہنگی حاصل ہوتی ہے ، جس سے ایک محدود ، غیر محدود کی حیات میں شریک ہو جاتا ہے -

اس سوال پر کہ زندگی کا مقصد و منشا اور نیکی کا کیا صلہ ہے ؟ اسلام کا جواب یہ ہے کہ حیات نیک کا صلہ بہتر و اعلیٰ زندگی ہے اور مسرت و خوشحالی خیر برتر کا اصلی جز ترکیبی ہے -

> من عمل صالحا من ذکر او انثی و ھو مؤمن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ ج و لنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون ط (النحل ۹۷)

> ”جس کسی نے اچھا کام کیا ، خواہ مرد ہو خواہ عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے تو (یاد رکھو) ہم ضرور اسے (دنیا میں) اچھی زندگی بسر

کرائینگے اور آخرت میں بھی ضرور اسے اجر دینگے ۔
انہوں نے جیسے جیسے اچھے کام کئے ھیں ، اس کے
مطابق ہمارا اجر بھی ہوگا“۔

یہاں ایک نکتہ مزید صراحت کا محتاج ہے ۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ھے ، جب کبھی قرآن ادنیٰ زندگی کا اعلیٰ زندگی سے مقابلہ کرتا ھے تو اعلیٰ زندگی کو آخرت کی زندگی سے تعبیر کرتا ھے اور اس کے مقابلہ میں اس دنیا کی زندگی کھیل تماشہ سے تعبیر کی جاتی ھے ۔ یہ صاف طور پر سمجھ لینا چاھئے کہ روحانیت کی عملداری میں زمان و مکان بے معنی سی چیزیں ھیں ، جن کا تعلق عالم محسوسات سے ھے ۔ اگر زمان کا وجود ھستی اور شعوریت کے تمام مراتب و درجات میں باقی رھتا ھے تو اس کی نوعیت مختلف سطحات پر جداگانہ ھوتی رھتی ھے ، جیسا کہ قرآن کہتا ھے : خدا کے نزدیک ایک دن ھزاروں سال کا ھوتا ھے ۔* اس کا حساب آفتاب کے گرد زمین کی یومیہ گردش سے نہیں ھے ۔ اسی طرح ایک سے زائد مقامات پر قرآن میں کہا گیا ھے کہ قیامت کے دن وقت کا احساس لوگوں کے نزدیک بالکل جداگانہ ھوگا ۔ دنیوی زندگی اور قیامت کے دن کا درمیانی وقفہ تقریباً کالعدم ھو جائیگا ۔ ”اور اس دن جبکہ انہیں جمع کیا جائیگا تو انہیں ایسا محسوس ھوگا کہ وہ دن کے ایک حصہ سے زیادہ نہیں ٹھہرے“۔† لا مکانی اور لا زمانی حقیقت عالم غیب ھے اور ایسے ھی قیامت کا دن بھی ۔ اس کالبد خاکی کو چھوڑ کر وجود کے نئے درجات و شعوریت میں داخل ھونا اس وقت ہمارے فہم سے بالا تر ھے ۔

* کان مقدارہ الف سنة مما تعدون—سجدہ ۔ ٦

† لم یلبثوا الا عشیة او ضحٰها—نازعات ۔ ٤٦

وللہ غیب السموت و الارض و ما امر الساعۃ الا کلمح البصر او ھو اقرب ط ان اللہ علی کل شیئی قدیر ہ (النحل - ۷۷)۔

"اور آسمانوں اور زمین کی جتنی مخفی باتیں ھیں، سب کا علم اللہ ھی کے پاس ھے - اور (آنے والے) مقررہ وقت کا معاملہ بس ایسا سمجھو جیسے آنکھ کا جھپکنا، بلکہ اس سے بھی جلد تر - بے شک اللہ کی قدرت سے کوئی بات باھر نہیں"۔

اگرچہ جسم کی تحلیل کے بعد حیات باقی رھیگی اور خودی اپنے تمام نیک و بد اثرات کے ساتھ دوسرے دائروں میں اپنا سفر جاری رکھے گی ھم ان دائروں میں قیامت کی ماھیت معلوم نہیں کر سکیں گے - لیکن قرآن سے ھمیں اس کی بابت صاف اشارات ملتے ھیں کہ ھمارے وقت کے اندازے وھاں کام نہیں دے سکتے - مادی وجود کے ختم ھوجانے سے ان میں کوئی صحت و درستگی باقی نہیں رھتی - مادی زمان صرف مادی وجود کا ایک رخ ھے -

چنانچہ ھم دیکھتے ھیں کہ مذھب کی اصطلاحی زبان میں زمان و مکان، زمین و آسمان اور دنیا و آخرت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ھیں تو ان زمانی و مکانی الفاظ کا استعمال صرف خدا کے اندازوں کے لئے ھوتا ھے - بڑے صوفیائے اسلام اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے - رومی کا قول ھے کہ "عشق (وجدانی طور پر خدا کی یافت) مکان کی پہنائی میں عروج و تسفل نہیں بلکہ مادی وجود کی حد بندیوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ھے"۔ ایسے ھی سرمد نے معراج کے سلسلہ میں مکان کی بابت کہا ھے :-

آں کس کہ سر حقیقتش باور شد
خود پہن تر از سپہر پہناور شد
ملا گوید کہ بر شد احمدؐ بفلک
سرمد گوید فلک بہ احمدؐ در شد

اسی طرح زمان کے متعلق جب قرآن یوم حساب کا لفظ استعمال کرتا ہے تو ہم کو یوم سے مراد کسی نظام شمسی کا نتیجہ نہ سمجھنا چاہئے - جب قرآن کہتا ہے کہ خدا کے پاس ایک دن کئی ہزار سال کا ہوتا ہے تو بعض مفسرین اس کی تاویل لفظ دور سے کرتے ہیں اور اسی کے مطابق تخلیق کے چھ دن چھ دور سمجھے گئے ہیں - بعض لوگ ان اوقات شماریوں کو حقیقت پر محمول نہیں کرتے بلکہ انہیں ایک استعارہ سمجھتے ہیں - اور صحیح تصور یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زمانی قلمرو سے باہر زمان کا کوئی وجود نہیں یا اس کی ماہیت بالکل جداگانہ ہے - برگسان کا پورا فلسفہ اسی فضائی زمان اور تخلیقی امتداد کے باہمی فرق پر مبنی ہے، جسے صرف روحانی طور پر وجدان کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے، جب کہ حیات وجود حقیقی کے ساتھ براہ راست ربط پیدا کر لیتی ہے -

اسلام کی رو سے نیکی اور بدی کا صلہ نقد و نسیہ دونوں پر مشتمل ہے - اس کی حقیقت پر راسخ اعتقاد کے ساتھ خود کو نصب العین کے سپرد کر دینا، باطنی مسرت اور نیکی کی زندگی ہے - ایسا آدمی اپنی حقیقت کے ساتھ وفادار ہوتا ہے اس لئے وہ قلبی سکون، حاصل کرتا ہے جو تمام مسرتوں سے بالکل مختلف، حقیقی مسرت ہے - یہ باطنی مسرت، یہ الٰہی سکینت، مادی فائدہ یا جسمانی تکلیف یا سختی کی، نقصان سے زیادہ تلافی کرتی ہے - نیکی اور بدی کے بدلہ کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ

ہر لمحہ یہ ضبط تحریر میں لائے جاتے ہیں اور اس ترازو سے وزن کر لئے جاتے ہیں جس میں ذرہ برابر غلطی کا امکان نہیں۔ انسان کی زندگی کا تعین کسی خاص گناہ سے نہیں ہوتا بلکہ گناہ و ثواب کی اس میزان سے ہوتا ہے جو اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ اگر وہ بے شمار گناہوں کا مرتکب ہوتا رہے لیکن کوئی ایسی نیکی اس سے سرزد ہوئی ہو جس کا پلہ بھاری ہو جائے تو اس کی زندگی مجموعی طور پر نیک قرار پائیگی اور وہ نامراد نہ ہوگا۔ ہم ایک سے زائد مقامات پر قرآن میں یہ دیکھتے ہیں کہ خدا گناہ کی سزا میں جلد باز نہیں۔ اگر وہ صراط مستقیم سے انحراف کی سزا دینے میں جلد باز ہوتا تو زمین پر کوئی جاندار باقی نہ بچتا اور گناہ کوئی ایسی چیز نہیں جو روح سے ناقابل استیصال طریقہ پر چمٹ جائے۔

ان الحسنات یذھبن السیئات، (ھود - ۱۱۴)

"نیکیاں برائیوں کو محو کر دیتی ہیں"۔

برائی کی یہ فطرت ہے کہ وہ جلد یا بدیر اعمال صالحہ سے محو ہو جاتی ہے، یا اپنی ذاتی تباہ کاری کے سبب برباد ہو جاتی ہے۔

و قل جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا ط (بنی اسرائیل - ۸۱)

"اور تیرا اعلان یہ ہو کہ دیکھو حق ظاہر ہو گیا اور باطل نابود ہوا اور باطل اسی لئے تھا کہ نابود ہو کر رہے۔"

انسانیت کے لئے اسلام کی زبردست خدمات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے گناہ کے غیر ضروری اور وہمی خوف سے اس کو رہائی بخشی۔ نٹشے کہتا ہے کہ گناہ یہودیوں کی اختراع ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عہد نامۂ عتیق میں خدا کو جس طرح

پیش کیا گیا ھے ، اس میں محبت سے زیادہ خوف غالب ھے اور وہ حقیقی یا خیالی گناھوں کے بدلہ میں بے رحمی کے ساتھ تمام خاندانوں اور جماعتوں کو عذاب دیتا ھے ، لیکن گناہ کا یہ تصور کہ وہ روح میں جاگزیں ھے اور آدم سے لیکر اس وقت تک جو بچہ پیدا ھوتا ھے اس میں وراثتاً منتقل ھوتا ھے ، عیسائیوں کی مخترعہ چیز ھے - یہ انسانی تصورات کی ایک عجیب ستم ظریفی ھے کہ عیسائی دینیات خدا کو محبت کے روپ میں پیش کرتی ھے اور ساتھ ھی فطری معصیت کے عقیدہ کی بھی تبلیغ کرتی ھے - قرآن اس عقیدہ کی پر زور تردید کرتا ھے - قرآن کی رو سے انسان کو فطرت الٰہی عطا ھوئی ھے اور اس کو اختیار سے نوازا گیا ھے ، جس سے وہ گمراہ بھی ھوسکتا ھے - لیکن یہ کہنا غلط ھے کہ خلقی طور پر اس کی آفرینش ایسی ھوئی ھے کہ وہ گمراہ ھو جائے - انسان کی بابت قرآن کہتا ھے کہ فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا - ''فطرت الٰہی جس پر انسان کی پیدائش ھوئی ھے''- آنحضرتؐ کی مشہور حدیث میں اس کی صراحت موجود ھے ، کہ ھر بچہ اپنی فطری صلاحیتوں پر پیدا ھوتا ھے اور اگر وہ صاف اور بے لوث رکھی جائیں تو وہ اس کو صحیح راہ پر لے جاتی ھیں - لیکن یہ اس کے ماں باپ ھیں جو اسکو یہودی ، نصرانی اور مجوسی بناتے ھیں''- یہ تمام مذاھب فطرت سے رو گردانیاں ھیں -

جدید نفسیات نے بعض ایسے مذھبی اشخاص کے تحت الشعور میں ، جو انتہا درجہ جذباتی شدت کے حامل ھوتے ھیں ، دوزخ کا ایک ھیجان انگیز تصور پیدا کر دیا ھے- ایک مسلمان جو روح اسلام سے باخبر ھے ، وہ ان المناک اوھام سے محفوظ رھتا ھے - اسلام کا خدا ایک عفو و درگذر کرنے والا خدا ھے - اس نے

انسان کی تخلیق اس طرح پر کی ہے کہ وہ برائی اور بھلائی دونوں کر سکتا ہے ۔ انسان کی زندگی میں فرق خیر و شر کے باہمی توازن سے واقع ہوتا ہے ۔ کامل بے داغ ولی اور نرے سیاہ کار ، جن میں رمق برابر نیکی نہو ، کبھی عالم وجود میں نہیں آئے ۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اگر انسان سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے تو وہ فرط قنوطیت سے دیوانہ نہ بن جائے ۔ سچی ندامت تمام گناہوں کو محو کر دیتی ہے ۔ اپنے نصب العین کو پیش نظر رکھ کر ہر وقت اپنا محاسبہ کرنا چاہئے تاکہ زندگی پر شر کا غلبہ نہ ہونے پائے ۔ قرآن کہتا ہے ، مایوسی کفر کی علامت ہے ۔ خدا کی رحمت تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۔ قرآن کی رو سے تمام گناہ اعمال صالحہ اور توبہ و انابت سے دھل جاتے ہیں ، بجز شرک کے گناہ کے، جو نصب العین کی حقیقت اور ایمان باللہ سے انکار ہے ۔ اگر کوئی انسان اخلاقی نصب العین کی حقیقت پر یقین رکھنا چھوڑ دے تو وہ بھٹک جائے گا اور اپنی اصل حقیقت کو اس وقت تک نہ پائے گا جب تک کہ وہ دوبارہ اخلاقی نصب العین پر ایمان نہ لائے ۔ یہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ بالآخر تمام روحیں بخشدی جائیں گی اور دوزخ بالکل خالی ہو جائے گی ۔ میں یہاں آنحضرتؐ کے اس اعتقاد کا اعادہ کروں گا جو آپ نے ہرقل کے سفیر کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا ۔ سفیر کا سوال یہ تھا کہ ”آپ کا قرآن کہتا ہے کہ جنت آسمانوں اور زمین کے برابر وسیع ہے ، ایسی صورت میں دوزخ کہاں ہوگی“ ؟ حضورؐ نے فرمایا کہ ”جب دن ظاہر ہوتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے“ ؟

انسان محض عقل کا بندہ نہیں ہے ۔ وہ کئی فطری مناسبتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے ، جن میں سے ہر ایک کا میلان یہ ہے

کہ اس پر غلبہ و تسلط حاصل کرے۔ جب روح کسی جبلت کے تحت ہوتی ہے اور شدید دلی خواہش بجائے عقل کے اس کی پیروی کرتی ہے تو قرآن کی زبان میں اس نفسی کیفیت کو نفس امارہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب انسان کا ضمیر یا اس کا اعلیٰ نفس اس کو ملامت کرتا ہے تو نفس کی اس حالت کو نفس لوامہ کہا جاتا ہے۔ نفس کی اعلیٰ و برتر حالت وہ ہے کہ وہ بالکل ہم آہنگ ہو کر سلامتی و امن حاصل کر لے اور یہ کیفیت نفس مطمئنہ کہی جاتی ہے۔ اسلام کا علم اخلاق از سر تا پا استکمال نفس کی تعلیم ہے اور نفس سے مراد بشمول وجدانات و احساسات انسان کی کامل ذات سے ہے۔ جس طرح انسان جسمانی طور پر کئی اجزا کی ایک عضویت ہے، جس میں ہر جزو کو ایک خاص وظیفۂ عطا کیا گیا ہے، ایسے ہی انسانی روح بھی ایک روحانی نظام ہے جس میں ہر فطری مناسبت کا ایک متعین وظیفہ ہے۔ انسان کو ان تمام محرکات سے نفع اٹھانا ہے بشرطیکہ وہ ان کو اپنی شخصی اور اجتماعی فلاح و بہبود کے تابع رکھے۔

تقابلی مطالعہ

تاریخ افکار و خیالات کی یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اخلاقیات کو ایک علم کی حیثیت سے اولاً اہل یونان نے ترقی دی۔ جیسے کہ مختلف زبانوں کا وجود اس زمانہ سے قبل بھی پایا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص ان کے اصول کی توضیح و تفہیم کے لئے ایسے قواعد و ضوابط مرتب کرے جن پر کہ زبانوں کی ترقی و تعمیر غیر شعوری طور پر ہوتی رہتی ہے، اسی طرح علم اخلاق کے معرض وجود میں آنے سے ہزاروں سال قبل انسان

کے فہم و ادراک نے خیر و شر کے درمیان فرق و امتیاز کرنا شروع کردیا تھا - جس طرح زبان انسان کی معاشرت پسندی کا قدرتی نتیجہ ہے ایسے ہی اخلاقیات بھی ہے - خیر و شر کے مابین امتیاز انسان کی باہمی ربط و تعلق سے قدرتاً پیدا ہوتا ہے - یہی سبب ہے کہ اسلام اخلاقیت اور مذہب کو فطرت کا لقب دیتا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام صرف مرتبۂ تہذیب پر انسانیت کو مخاطب کرتا ہے اور جب وہ کہتا ہے کہ ہم نے پیغمبروں کو قوموں کی طرف روانہ کیا تو وہ پیشتر سے یہ تسلیم کرتا ہے کہ بنی نوع انسان اپنے عادتی طریقوں اور اخلاقی ضابطوں کے ذریعہ ہیئت اجتماعیہ اختیار کر چکی تھی - پھر جب وہ کہتا ہے کہ دین اپنی حقیقت کے لحاظ سے ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور تمام انبیاء و اولیاء ایک ہی حلقۂ برادری میں داخل ہیں تو بے شائبۂ گمان و ریب اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کے ایک مخصوص ترقی یافتہ مرتبہ کا ذکر کر رہا ہے جس میں ایک خالق کائنات اور خیر و شر میں انصاف کرنے والے کا تخیل پیشتر سے رونما ہو چکا ہے - ہم اب بھی ایسی وحشی اور غیر مہذب قوموں کو چار دانگ عالم میں منتشر و پراگندہ پاتے ہیں جن کے الوھیت کے تصورات نہایت خام مظاہرپرستی (Animism) اور علامت پرستی (Totemism) کی قسم کے ہیں - اور جن کے اصول اخلاق صرف قبائلی رسم و رواج پر مشتمل ہوتے ہیں ، جو کسی حد تک ان کی قبائیلی تنظیم و تحفظ میں ممد و معاون ہوتے ہیں -

مذہب و اخلاق یا تو متوازی طور پر ترقی و تنزل کر رہے ہیں یا ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں - یونان میں ہم ہومر (Homer) کی شاعری میں کثرت پرستی اور فطرت پرستی

کو باہم ملا جلا پاتے ہیں ، جس میں اخلاق کا ایک دھندلا سا عکس انکے خداؤں کے کردار سے ظاہر ہوتا ہے - جب ہم یونان کے درخشاں عہد میں پہنچتے ہیں ، جبکہ اس قوم نے وجود کی ماہیت اور کائنات میں انسان کے مقام پر غور کرنا شروع کیا تھا ، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ معاشری عدل اور خیر و شر کی بابت ان کے خیالات ان کے مذہبی تصورات سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے - سقراط کے زمانہ سے کچھ ہی پہلے ہم عمل سے کہیں زیادہ اصول و نظریات میں اخلاق انتشار پاتے ہیں - ایتھنز کی شہری مملکت خاص طور پر ترقی یافتہ ، مہذب ، مرفہ الحال اور تجارت اور غلاموں کی محنت سے انتفاع کے ذریعہ مالا مال تھی - پیرکلیز (Pericles) کے زمانے سے زیادہ ہم کسی دور میں آزادی خیال و اظہار رائے نہیں پاتے ، جو اپنی مشہور تقریر میں اپنی مملکت کے تمدن پر فخر کرتا ہے ، جس میں شہریوں کو نہ صرف کاروبار حکومت میں خیالات کی آزادی تھی بلکہ وہ پبلک زندگی میں بھی آزادی خیال رکھتے تھے اور برملا ان کا اظہار کرسکتے تھے - ایک کافی عرصہ تک یہ آزادی ان کے معاشری اور سیاسی نظام کو متزلزل نہ کرسکی ، کیونکہ مذہبی معاملات میں ان کی تنظیم اصنام پرستی کی اساس پر ہوئی تھی ، اور تمام شہری جذبۂ حب الوطنی سے سرشار تھے - سقراط سے کچھ ہی قبل ہم دیکھتے ہیں کہ سوفطائی نظری طور پر اخلاقی انتشار کی تلقین کر رہے تھے - اس کا نتیجہ ممکن تھا کہ عملی انتشار کی صورت اختیار کر لیتا ، لیکن سقراط ، افلاطون اور ارسطاطالیس جیسی اختراعی قابلیت کی شخصیتیں رونماء ہوئیں جن سے اس صورت حال کا تدارک ہوا - ان مفکرین کے ذریعہ پہلی دفعہ تاریخ انسانیت میں عقل اپنی پوری لطافت اور آزادی

کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ انہوں نے فطرت کا ایک واضح تصور قائم کیا جو عقل و حکمت کا نمونہ تھا اور جو خود سرانہ ارادوں کی موج و ترنگ نہ تھا۔ اس کے ساتھ کائنات کے ایک منظم وحدت ہونے کے تصور نے جنم لیا۔ عقل جو فطرت میں خوابیدہ تھی، انسان میں آکر باشعور اور خود آگاہ ہوئی۔ انسان کا وصف امتیازی ایک باخبر عقل ہے، جس کی ماہیت وحدت و توافق ہے۔ انسانی عقل نظری، جو قوانین اشیاء کا درک کرتی ہے اور عقل عملی، جو اس کی زندگی کا انضباط کرتی ہے، یہ دونوں بنیادی طور پر ایک ہی ہیں۔ سقراط اور افلاطون کے ساتھ اس تصور نے جنم لیا کہ حقیقت اور عقل باہم مماثل ہیں اور ان دونوں کی مماثلت خیر کے ساتھ ہے، جس کو یہ تمام عقلیت اور حقیقت کا مصدر سمجھتے تھے۔ اس منزل پر یونانی ذہن خداؤں کے متعلق غور و فکر سے قاصر تھا۔ یہانتک کہ وہ ہستی مطلق کے آزادانہ ارادہ کے متعلق بھی غور نہ کرسکتا تھا اور حقیقت اولیٰ کو یہ جوہر عقل کے مماثل قرار دیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یونانیوں نے عقلی حیثیت سے اس وجہ سے ترقی کی کہ وہ خود کو مذہب کی قید و بند سے آزاد کر چکے تھے۔ ایک لحاظ سے یہ صحیح بھی ہے۔ ان کا رسمی مذہب اصنام پرستی اور چند توہمات کا مجموعہ تھا۔ جب مذہب میں فساد رونما ہوا اور اس کے پرستاروں تک نے اسے پس پشت ڈال دیا تو عوام نے بھی اس خیال کے تحت اس سے کنارہ کشی اختیار کی، کہ اگر انہیں ترقی کرنا اور صحیح طریقہ پر زندگی گذارنا ہے تو مذہب سے انحراف ضروری ہے۔ جب عقائد و رسوم بگڑنا شروع ہوئے تو مذہب کے خلاف بغاوت یا بے اعتنائی نہایت ضروری سمجھی گئی۔

جہاں تک مذہبی شعور کی ترقی کا تعلق ہے عبرانیوں اور اہل ہنود کی تاریخ نہایت اہم اور سبق آموز ہے ۔ کسی دوسری قوم سے زیادہ عبرانیوں یا اسرائیلیوں میں پیغمبر پیدا ہوئے ہیں ، جو ان کی مذہبی شعوریت پردال ہے ۔ ابتداً ان کا خدا یہودا ایک قبائلی خدا تھا ، جس کا تعلق زیادہ تر زندگی کے انقلابات سے تھا ، اور جسنے اس قوم کو اپنے مہر و قہر کے لئے چن لیا تھا ۔ ابتدائی منازل میں ان کا خدا کی بابت تصور نہایت ناقص تھا اور ایسے ہی ان کی سیاسی اخلاقیت کی حالت تھی ۔ ان کی اخلاقیت نہایت خام قبائلی قسم کی تھی ، جو ان کی تاریخ اور ان کے خدا کے اعمال و صفات سے ظاہر ہوتی ہے ۔ توحید پرستی کی ذہنی یا اخلاقی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی اگر ایک خدا کا تصور بالکل قبائلی اور تشبیہی ہو ۔ اگر کوئی قوم ایک خدا کی پرستش کو پسند کرتی ہے اور تمام دیگر خداؤں کو رد کر دیتی ہے تب بھی یہ کوئی زیادہ ترقی نہ ہوگی ۔ اگر وہ ایک خدا مقامی ، محدود ، غیر اعتدال پسند اور خود رائے ہو اور جو ایک وحشی کی طرح غصہ اور انتقام کے جذبات سے بے قابو ہو جاتا ہو ۔ عہد نامۂ عتیق کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے تصور میں سست رفتاری کے ساتھ مگر مستقلاً ترقی اسکو معقول ، عادل اور مہربان ہستی قرار دینے میں ہوتی رہی اور اس کے صفات اسرائیلیوں میں محدود ہونے کے بجائے رفتہ رفتہ ہمہ گیر ہوتے گئے ۔ قرآن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اسرائیلیوں میں پہلے موحد تھے جنہوں نے نہ صرف ایک خدا کے تصور تک رسائی حاصل کی بلکہ اس کے تصور میں بلندی و رفعت پیدا کی ۔ اس کے بعد ہم ایک بے لوث عادل خدا کا تصور پاتے ہیں ، جو صداقت اور محبت کا خدا تھا ۔ اور

ترقی کرتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ تک پہنچتے ہیں ، جہاں خدا ایک روح ، نور اور تمام کائنات کی جان بن جاتا ہے - خدا کا خلاف عقل خوف باقی نہیں رھتا اور اخلاقیت راستی اور انصاف کے ذریعہ ترقی کرتی ہوئی محبت تک مثل انتہائی تصور اور آخری محرک کے پہنچ جاتی ہے - یہاں ہم خالص توحید اور برتر اخلاق پر پہنچتے ہیں ، جو نہ صرف درست اور رسمی اخلاق کی تعلیم دیتا ہے بلکہ محرکات کی پاکیزگی پر بھی زور دے کر انسان کی اندرونی زندگی کی اصلاح کرنا چاہتا ہے - یہودیوں کی قانون کے متعلق لفظی تاکید میں محبت کے ذریعہ تکمیل و رفعت پیدا کی گئی جو ہر قانون کا ماخذ اور معیار ہونا چاہئے - یہودی جو تمام دیگر اقوام کو دشمن اور دوزخ کا ایندھن سمجھتے تھے انہیں اپنے دشمنوں سے محبت کرنے اور برائی کا بدلہ نیکی سے دینے کی تعلیم دی گئی -

اہل ہنود نے کسی قدر دوسرے خطوط پر ترقی حاصل کی- کثرت پرستی کے پہلو بہ پہلو ہم ان کے پاس کائنات کی ماہیت پر غور و فکر بھی پاتے ہیں - برھمنی مذہب نے الٰہیاتی طریقوں کو ترقی دینا شروع کیا ، جس میں مذہب و فلسفہ بالکل علیحدہ نہیں رکھے گئے تھے - کثرت پرستی سے ترقی کر کے یہ توحید سے زیادہ وحدت الوجود کی طرف آئے جس میں ذات مطلق کا تصور ، حیات و وجود اور خیر و شر سے منزہ تھا - ذات مطلق نظام اخلاق سے ماوراء تھی - انسانی اقدار اضافی اور عارضی تھے ، جنکا خدا کے پاس کوئی مقام نہ تھا اور جن سے تجاوز بالآخر ضروری تھا - زمانی و مکانی زندگی ایک مایا بن گئی اور ان کے معبود بھی اسی کا ایک جزو ہو کر رہ گئے -

ایک فوق تجربی ذات مطلق کے تصورات اخلاق کو متاثر نہیں کر سکتے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اثر برعکس ہوتا ہے۔ جیسا کہ ولیم جیمس نے کہا ہے کہ مطلقیت ایک اخلاق بےقیدی ہے۔ اہل ہنود نے خدا پرستی سے زیادہ ہمہ اوست اور وحدت وجود کے عقیدہ کو ترقی دی اور انکا اجتماعی اخلاق برھمنوں کے طبقہ واری اقتدار کے سبب تہ و بالا ہو گیا۔ منو کا دھرم شاستر ان کے مذہب، قانون اور اخلاق کا مستند ضابطہ ہے۔ اور یہ ایک ایسے علم اخلاق کی مستقل یادگار ہے جس نے ابھی عالمی اور معروضی صورت اختیار نہیں کی ہے بلکہ طبقاتی انتفاع پر مبنی ہے، اور جس پر وحی آسمانی کی مہر تصدیق ثبت ہے۔ بدھ مت میں، جو ہندو مت کی ترقی یافتہ صورت ہے، ہم اصلاح کی ایک زبردست کوشش سے دوچار ہوتے ہیں۔ بدھا یہ چاہتا تھا کہ پہلے اپنی قوم کو اور بعد ازاں تمام بنی نوع انسان کو قبائلی اخلاق سے عالمی اخلاق کی بلندی کی طرف لے آئے۔ اس نے نسبی امتیازات کی نفی کی اور ہندوؤں کے کل دیوتاؤں اور اصنامیات کا صفایا کر دیا۔ اس نے ایک تجسمی خدا کے تصور کا بھی خاتمہ کر دیا۔ لیکن کائنات کی بابت اس کا تصور ہندوؤں کے مایا اور مطلقیت کے عقیدہ سے داغدار تھا، جو ہندوؤں کے قلب و دماغ میں مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ چکا تھا۔ اس نے حضرت عیسیٰؑ کی طرح محبت اور رحم کو بحیثیت اخلاقیت کے حقیقی مآخذ کے چن لیا تھا۔ لیکن اس کی نفسیات اور عمرانیات انتہا درجہ ناقص تھیں اور یہی صورت موجودات کے متعلق اس کے نقطۂ خیال کی تھی۔ جہاں تک وجود کی ماہیت کا تعلق ہے اسکا الہام اس نتیجہ پر پہنچا کہ زندگی برائیوں سے بھری ہوئی

ہے اور تمام برائیوں کی جڑ خواہش ہے۔ وہ پسندیدہ اور ناپسندیدہ مقاصد میں فرق و امتیاز نہ کر سکا۔ اس کے نزدیک تمام مقاصد ایک دھوکہ ہیں اور ان تمام مقاصد کی خواہشات کا استیصال ہو جانا چاہئے۔ زندگی کو ختم کر دینا ہی زندگی کا مقصد ہے۔ حیات اور غم ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں، اور کسی ایک کو بلا دوسرے کے حاصل نہیں کر سکتے۔ نیکی کی کوئی مقدار بھی اس دنیا میں یا ما بعد زندگی میں فلاح و مسرت پیدا نہیں کرسکتی۔ یہ دونوں عالم خواہش کی آفرید ہیں اس لئے محض دھوکا اور فریب ہیں۔ کائنات میں ایک نظام اخلاق کارفرما ہے جو موجودات کو تناسخ کے پھیر میں الجھائے ہوئے ہے۔ روحانی روشن خیالی کا مقصد اس نظام اخلاق سے باہر قدم رکھنا ہے۔ تمام زندگی اور کل خواہشات ایک برائی ہے۔ اور ان سب سے کاملاً بلند ہو کر اس ناقابل بیان حالت مطلق پر پہنچنا چاہئے جسے نروان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں نہ کوئی حیات ہے نہ کوئی امتیازات ہیں اور نہ کوئی شخصی خصوصیات۔ یہ جملہ اقدار کی تشخیص کا تبدل نہیں بلکہ ان کی بالکلیہ نفی ہے۔ انسان کے لئے بدھ مت میں جو کچھ باقی بچتا ہے وہ جملہ اخلاقیت میں رحم اور نروان ہے جو بحیثیت مقصد زندگی کے ہے اور جس کی تعریف کرنے سے اس نے انکار کیا ہے کیونکہ بقول اسپینوزا، ہر تعریف ایک قسم کی تحدید ہوتی ہے اور نروان کے معنی تمام حدود سے آگے نکل جانا ہے۔ ہمارے پاس کوئی چیز مثبت صورت میں نہیں رہتی سوائے اس کے کہ تکالیف سے چھٹکارا حاصل کریں اور کسی صورت میں بھی ہلاک کرنے سے احتراز کریں۔ اقدار حیات میں ایمان کا یہ ایک ناقص بدل ہے اور انتہا درجہ کی غیر معقول اخلاقیات

ہیں جو حیات سے انکار اور مشاغل زندگی سے گریز کرنے والے بھکشو کو بطور نمونہ پیش کرکے اس کو سراہتی ہے -

زندگی اور اس کے اقدار کے متعلق اس طرح کا انکار انسان کو یا معاشرہ کو زیادہ عرصہ تک لبھا نہیں سکتا تھا ، اس لئے بعد میں چند وضعی مقاصد کو صحیح ثابت کیا گیا اور اسکے بعد ان کے حصول کی کوشش کی گئی - جب ان کو انسان کے مناسب حال بنایا گیا تو انہوں نے بہت سے مفید نتائج پیدا کئے ، جن کو ہم اشوک کے نظم و نسق اور قوانین کی صورت میں دیکھتے ہیں - بدھ مت اپنے بنیادی اصول سے منحرف ہو کر ہی اخلاق کو بلند کرنے والی قوت کی حیثیت سے عمل پیرا ہوسکتا ہے -

عیسائیت بھی زندگی سے نفور و گریزاں رجحانات کی طرف بہہ نکلی - بدھ مت اور عیسائیت نے رہبانیت اور جوگیت کو ترقی دی - ایک انسان جو شادی کرتا اور زندگی کے جائز مشاغل میں مصروف ہوتا وہ اس انسان سے روحانی حیثیت سے فروتر سمجھا جاتا تھا جو ان باتوں سے اجتناب کرتا تھا - دنیا کے کاروبار اور خواہشات کو نظر حقارت سے دیکھا جاتا تھا - سینٹ پال نے کہا کہ شادی کرنا آگ میں جل جانے سے بہتر ہے - جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر مذہب تمام لوگوں کو شادی کرنے سے منع کردیتا تو اس سے بطور نتیجہ کے زنا یا حرام کاری پیدا ہوتی اور اس کی سزا آگ میں جلانے سے دی جاتی تھی - اگر یہ خطرہ وہاں نہ ہوتا تو صرف تجرد روحانی حیثیت سے ایک پسندیدہ صورت ہوتی - یہی ہندو اور بدھ متی تصور بھی ہے - ایک مجرد سادھو یا بھکشو خود کو شہوانی خواہشات سے مجتنب رکھنے کے سبب زیادہ روحانی سمجھا جاتا ہے - نٹشے نے یہ

بالکل سچ کہا ہے کہ مذہب دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو زندگی کو لبیک کہتے ہیں اور دوسرے وہ جو زندگی سے گھبراتے ہیں ۔ تقشف اور تپسیا زندگی کی نفی کرنا اور اپنی روح کو بچانے کے لئے زندگی سے نفور و گریزاں ہونا ہے ۔

جس وقت اسلام منظر تاریخ پر جلوہ گر ہؤا تو اخلاقیت اور روحانیت کا یہی عالم گیر مسلمہ نظریہ تھا ۔ دنیا اور آخرت میں تفریق تھی ۔ روحانیت کا اخلاقیت اور ایسے ہی زندگی سے انقطاع ہوچکا تھا ۔ ایک مثالی انسان وہ راہب تھا جو اپنے خدا کے ساتھ عزلت گزیں تھا، کاروبار دنیا کو وہ اپنی سکت سے زیادہ پا کر راہ فرار اختیار کئے ہوئے تھا اور تنہائی میں خدا کی حمد و ثنا میں لگا ہوا تھا ۔ اسلام نے مذہب و اخلاق کو زندگی سے بیگانہ پایا تھا اور انسانیت کی ترقی و اصلاح میں اس کی زبردست خدمت مذہب کا یہ تصور ہے کہ وہ فلاح و بہبود کا ذریعہ ہے اور ایک ایسی زندگی ہے جو محبت اور انصاف کے ساتھ بسر کی جائے اور جو فطرت کے تمام تقاضوں کو عقل اور اجتماعی فلاح و بہبود کے مقرر کردہ حدود میں رہ کر پورا کرتی ہو ۔ اسلام کے نزدیک زندگی کا مقصد ایسی بہتر اور اعلیٰ زندگی ہے جو مستعدی سے اور کامل طور پر بسر کی جائے اور جو ہم آہنگی کے ساتھ نشو و ارتقاء حاصل کرے ۔

تکمیل اخلاق

اسلامی اور یونانی اخلاقیات میں اکثر امور باہم متفق اور کمتر چیزیں مختلف فیہ ہیں ۔ اسلام میں عبرانیوں کی دینی ترقی اور یونانیوں کی عقلی ترقی دونوں ایک نقطہ پر جمع ہو گئی ہیں ۔ بظاہر ترقی کے یہ دونوں طریقے باہم دگر نقیض معلوم ہوتے

ھیں - یونانیوں کے نزدیک حقیقت اولیٰ ایک خالص اور خود اندیش جوھر عقل ھے اور عبرانیوں کا خدا اولاً ایک اخلاقی ارادہ ھے - یہ کہہ سکتے ھیں کہ ایک ساکن ھے ، دوسرا متحرک ، یا ایک تصوری ھے اور دوسرا عملی - ھیگل جو فلاسفۂ زمانہ میں سے ھے ، موجودات کی بابت اپنے سارے تصور کی بنیاد کائنات اور نفس میں ایک منطقی حرکت خیال کے نظریہ پر رکھتا ھے - یہ کسی دعویٰ سے تضاد کی طرف اور تضاد سے امتزاج کی طرف رخ کرتا ھے جو ان ھر دو کے یک رخے پن سے بلند ھو کر دونوں کی دائمی قدر کو لیتا اور اپنے میں شامل کر لیتا ھے - اھل یونان نے رفتہ رفتہ کلمۂ الٰہی (Logos) کا تصور پیش کیا ، جو موجودات کی تخلیق و تنظیم کرتا ھے - ان دانشمند لوگوں میں عقل ، جو ان کی حیات و فطرت میں اصلاً موجود تھی ، خود آگاہ بن جاتی ھے - لیکن جوھر عقل جس کی دریافت انھوں نے کی تھی ، ایک ساکن حقیقت تھی اور کائنات متحرک تھی - جوھر عقل بے ارادہ اور خود اپنا آپ مقصد و منشاء - اس لئے افلاطون و ارسطو دونوں اس نتیجہ پر پہنچے کہ حقیقت اعلیٰ ایک عین یا نفس ناطقہ ھے اور اس متغیر ھونے والی دنیا کی تخلیق نفس ناطقہ کے ساتھ فریب و عدم کی آمیزش سے ھوئی ھے ، جو صرف جزئی طور پر ظہور پذیر ھے - جملہ خصوصیت و فردیت تغیر پذیر ، عارضی اور فریب دہ ھے - خدا بجز اپنی ذات پر نظر کرنے کے اور کچھ نہیں کرتا - وہ جزئیات و افراد کی پروا نہیں کرتا اور امر واقعہ یہ ھے کہ وہ ان کا علم نہیں رکھتا - فی الحقیقت یہ خدا کے لئے ناممکن ھے کہ وہ جزئیات کو جانے کیونکہ جزئیات کی تعمیر عدم کی آمیزش سے ھوئی ھے اور خدا خالص وجود ھے -

اگر ہم ہیگل کی منطقی زبان میں اس عقلیت کو ایک دعویٰ سمجھیں تو خدا کا عبرانی تصور ایک نقیض ہوگا۔ عبرانیوں کے نزدیک خدا اولاً ایک ارادہ ہے جو مصالح کے تحت کام کرتا ہے۔ اہل یونان کے نزدیک ارادہ تقریباً عقل اول کی نفی کے مماثل تھا، کیونکہ عقل کے نزدیک کوئی چیز غیر حاصل شدہ نہ تھی جس کو وہ ارادہ سے حاصل کرنا چاہتی ہو۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل بیان کر چکے ہیں، ترقی کے طویل دور میں یہوداہ کا ارادہ بالکل قبیلوی، انتہائی تشبیہی، اور حد درجہ خام تصور کیا گیا ہے۔ اپنے دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں متعدد موقعوں پر یہوداہ انتہا درجہ ظلم اور ناواجبی غصہ کا اظہار کرتا ہے اور باپ کے گناہوں کا اس کی نسل سے تین پشت تک بدلہ لیتا ہے۔ یہ ارادہ رفتہ رفتہ اخلاقی، معقولی اور عالمی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ہم حضرت عیسیٰؑ تک پہنچتے ہیں، جنہوں نے خدا کا ایک ہمہ رحمت تصور پیش کیا۔ اب رحمت عقل کی صفت نہیں رہی بلکہ یہ احساس و ارادہ کا ایک وصف قرار پائی۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عبرانی ترقی حضرت عیسیٰؑ کی صورت میں اپنے نقطۂ کمال پر پہنچ کر ایک صاحب ارادہ خدا کو پیش کرتی ہے، جو دائماً ایک سکونی حقیقت نہیں، بلکہ افعال کی خالق اور اعمال کا بدلہ دینے والی ذات ہے۔ عبرانیوں میں خواہ ہم حضرت ابراہیمؑ کو لیں یا حضرت عیسیٰؑ کو، ہم توحید پرستی کو بلند اور پاکیزہ صورت میں پاتے ہیں۔ اس راہ ترقی میں عقل اور علم پر کم توجہ کی گئی ہے اور زیادہ زور نیکی اور انصاف و محبت کے بتدریج وسیع ہونے والے خیال پر دیا گیا ہے۔

یہ دونوں نتیجے جزئی اور یک طرفہ تھے اور دنیا کو ایک ایسے تصور کی ضرورت تھی جس میں ان دونوں صداقتوں کا امتزاج ہو سکے۔ ٹھیک یہی کام تھا جسکو اسلام نے انجام دیا۔ خدا کی صورت میں اس نے ایک حقیقت اولیٰ کا تصور پیش کیا۔ جو صاحب حرکت و ارادہ عقل تھی، جسکی ماہیت ہمہ خیریت و محبت تھی اور جو بذات خود کائنات اور انسان میں ایک عامل و کارگذار وجود تھا۔ یونانی عقلیت کے نقطۂ خیال سے ایک ارادہ رکھنے والی ذات ناقابل تصور تھی۔ وہ دائماً ساکن خیالات گھڑ لیتے تھے اور اس سے بے خبر تھے کہ خود کو یا دنیا کو کس طرح حرکت میں لایا جائے۔ لیکن جدید فلسفہ اور برگسان کے تخلیقی ارتقاء میں نظریۂ عملیت کی ترقی نے تصورات کے متحرک پہلوؤں کو نمایاں حیثیت میں پیش کیا ہے۔ جیسا کہ ولیم جیمس نے کہا ہے، کہ ہر حقیقی تصور کا براہ راست یا بالواسطہ عمل سے تعلق ہوتا ہے اور جس تصور کا تعلق عمل سے نہیں وہ بے معنی ہے۔ حقیقت تبدل پذیر، تخلیقی اور متحرک ہے۔ خدا اصلاً ایک خالق ہے اور عقل ارادہ کی آفریدہ ہے۔ اسلام کے اختیار کردہ نقطۂ خیال سے یہ تصور نہایت قریب ہے۔ قرآن بار بار عالم طبیعی کو عقلاً اور سبباً ایک کل کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ کائنات کا ہر مظہر ایک معجزہ ہے جو ایک حکمت والے خالق کے وجود کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ان فی خلق السموت والارض و اختلاف الیل والنہار و الفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس و ما

انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا
و بث فیھا من کل دابۃ ص و تصریف الریح
و السحاب المسخر بین السماء و الارض لایت لقوم
یعقلون ط (البقرۃ—۱۵۹)

”بلا شبہ آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں، اور کشتی میں جو انسان کی کار برآریوں کے لئے سمندر میں چلتی ھے، اور بارش میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ھے، اور اس (کی آبپاشی) سے زمین کو مرنے کے بعد پھر زندہ کر دیتا ھے، اور اس بات میں کہ ھر قسم کے جانور زمین کی وسعت میں پھیلا دئے ھیں، اور ھواؤں کے (مختلف رخ) پھرنے میں، اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان (اپنی مقررہ جگہ کے اندر) مسخر ھیں، ان لوگوں کے لئے جو عقل و بینش رکھنے والے ھیں (اللہ کی ھستی و یگانگی اور اس کے قوانین رحمت کی) بڑی ھی نشانیاں ھیں“۔

قرآن اپنے آپ کو خطبہ خوانیوں اور حمد طرازیوں کی کتاب نہیں کہتا بلکہ وہ خود کو کتاب حکمت کہتا ھے۔ جہاں کہیں وہ کوئی اصول پیش کرتا ھے تو اس کے وجوہ و اسباب بتلاتا ھے اور ھر نصیحت ان الفاظ پر ختم ھوتی ھے: ”اور تم غور کیوں نہیں کرتے“۔ اھل علم کی بابت یہ کہا گیا ھے کہ یہ وہ لوگ ھیں جو برائی سے بچتے ھیں۔ پھر حکمت کے متعلق کہا گیا ھے کہ وہ خدا کے زبردست انعامات میں سے ھے۔

و من یؤتی الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا۔

”جس نے حکمت پائی وہ خیر کثیر سے سرفراز ھوا“۔

سنریھم آیاتنا فی الافاق و فی انفسھم افلا تبصرون ۔

"کائنات اور خود تمہارے وجود میں نشانیاں ھیں ، کیوں تم غور نہیں کرتے "۔

یہ عقل ، انصاف ، اور خوبی تمام ایک ھی ذات میں ھیں اور ان کو قرآن بار بار خدا پر ایمان اور اعمال کی ھدایت کے لئے بطور اساس کے پیش کرتا ھے ۔ یہ گویا یونانیت اور عبرانیت کا ایک امتزاج ھے ، جہاں عقل ایک تخلیقی رجحان بن جاتی ھے ۔

قرآن میں مسلمانوں کو امت وسطیٰ کہا گیا ھے ۔ یہ خطاب نہایت معنی خیز ھے ۔ اسلام سے قبل بہت بڑی بڑی قومیں گذر چکی تھیں جنہوں نے عظیم صداقتوں کا سراغ لگایا تھا ، لیکن وہ اپنی یک رخی ترقی کے سبب انتہا پسندی اختیار کر چکی تھیں ۔ اھل ھنود نے حقیقت اولیٰ کے تصور کو ایک فوق تجربی وحدت وجود اور مطلقیت تک ترقی دی تھی ، لیکن حیات سے بیگانہ ھو گئے تھے ۔ یہ ایک جزئی صداقت تھی ۔ یقیناً خدا وجود کی تمام تبدیلیوں ، اضافوں اور خصوصیتوں سے منزہ ھے ۔ وہ ان تمام سے ماوراء ھے جن کی بابت ھم ممکنہ طور پر خیال و قیاس کر سکتے ھیں ۔ وہ وراء الوراء ھے ۔ لیکن قرآن کہتا ھے کہ وہ ھر قریب سے زیادہ قریب تر بھی ھے ۔ فوق تجربی مطلقیت میں روح انسانی ، بحیثیت تمام نفوس کی حقیقت ذات کے ، خدا کے مماثل قرار دی گئی تھی ، لیکن اس سے ایک فرد کو اپنی فردیت خدا کی ذات میں محو کر دینی پڑی تھی ۔ صحیح یک رنگی میں کوئی انتفاء و انضمام نہیں ، کیونکہ کوئی فرد اپنا حقیقی وجود نہیں رکھتا ۔ اس طرح خدا کی ماورائیت اور انسان کی بالقدہ الوھیت دونوں نے حیات کی نفی کا پہلو اختیار

کیا۔ جس کا نتیجہ توکل، تقشف اور ایسے عقیدہ کی صورت میں ظاہر ہوا جس میں ایک شخص خدا کو صرف اسی شکل میں پا سکتا تھا کہ وہ زندگی کے تمام علاقوں سے بے تعلق ہو کر تنہائی میں اس سے لو لگائے۔ یہ تمام صداقتوں کی مبالغہ آمیزی اور انتہا پسندی تھی۔ اسلام نے ان تمام تصورات کی سچائیوں کو لے کر کامل ہم آہنگی سے زندگی کے دیگر پہلوؤں کے ساتھ ہم آمیز کیا۔ اسلام کو ہم ان تمام صداقتوں کے ساتھ راہ اعتدال پر گامزن دیکھتے ہیں۔ قرآن کا یہ ایک بار بار دھرایا جانے والا دعویٰ ہے کہ مہذب انسانیت کے تمام بڑے مذاہب اصلاً ایک ہی صداقت کے حامل تھے، مگر بعد میں وہ گم کردہ راہ ہو گئے۔ تاریخی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ گمراہی کس طرح وقوع پذیر ہوئی تھی۔ جزئی صداقتوں میں اس حد تک غلو کیا گیا کہ انہوں نے زندگی کو مالا مال کرنے کی بجائے تباہ حال کر دیا۔

بعض ایسے مذاہب ہیں جن میں ہم خدا اور کائنات میں کامل مماثلت پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر رواقیت، جو رومی سلطنت میں صدیوں تک پورے عروج پر رہی۔ مثلاً مارکس آریلیس (Marcus Aurilius) جیسے پاکیزہ انسانوں کے دلکش بیانات میں ہم کائنات کو خدا کے مماثل پاتے ہیں۔ یہ کامل تداخل و حلول کا عقیدہ تھا۔ کائنات کی حیثیت خدا کے جسم کی سی تھی اور خدا کائنات کی روح سمجھا جاتا تھا۔ یہ بھی صداقت کی طرف ایک قدم تھا، لیکن اس میں خدا کے تصور کی توہین اور ایک طرح پر تحدید ہوتی تھی۔ اسلام کہتا ہے کہ خالق اپنی مخلوق میں موجود ہے، لیکن وہ ان سے ماوراء بھی ہے۔ جیسے کہ ایک مصور اپنی فنی تخلیقات سے منزہ ہوتا ہے۔ اگرچہ

کہ ہر فنی تخلیق اس کے الہام و خواہش کی صورت پذیری ہوتی ہے ۔ امت وسطیٰ کو حقیقت اولیٰ پر ، جسے اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے ، ظاہراً و باطناً ایمان کا حکم دیا گیا ہے ۔ یہ عقل کل بھی ہے اور ارادہ بھی ۔ ارادہ کا برتر ظہور محبت ، رحمت یا فضل ہے ، جس کا اظہار تقاضۂ تخلیق سے ہوتا ہے اور جو نہ صرف تخلیق کرتا ہے بلکہ خلقت کو حکمت کے ساتھ حکم دیتا ہے تاکہ ان کی پرورش و پرداخت اور ترقی ہو سکے ۔ موت و فنا بھی اسی تخلیقی عمل کی عارضی کیفیات ہیں ۔

ہم بائبل اور قرآن میں ایک نہایت دلکش اور معنی خیز فقرہ پاتے ہیں ۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ''بدکار لوگ وہ ہیں جو اس چیز کو قطع کرتے ہیں جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے''*۔ اس فقرہ کی بائبل کے علماء اور مفسرین قرآن دونوں نے نہایت تنگ نظری سے تشریح کی ہے اور اس کی دقیق معنویت سے دونوں نے صرف نظر کیا ہے ۔ بائبل کے علماء نے اس کی تشریح امتناع طلاق سے کی ۔ نکاح ایک مقدس عہد و پیمان ہے ، جس کے ذریعے خدا نے زن و شوہر کو باہم جوڑا ہے اور اسکو توڑنا ایک گناہ ہے ۔ اسی طرح علمائے اہل اسلام نے بھی محض قانونی الفاظ میں اس کی تشریح کی ہے ۔ میرے نزدیک تو تمام سچے مذاہب اور حقیقی اخلاقیت کی روح اس میں شامل ہے اور اس کا اطلاق تمام معاشری ، سیاسی اور معاشی تعلقات پر ہو سکتا ہے ۔ تمام کائنات ایک ہے کیونکہ اس کا خالق ایک ہے ۔ ہر ایک چیز کسی دوسری چیز سے قریباً یا بعیداً جڑی ہوئی ہے ۔ ایک زمانہ تھا جبکہ کائنات ادنیٰ و اعلیٰ اور خدا کی برگزیدہ اور رد کردہ اقسام میں تقسیم کی گئی تھی ۔ متقدمین آسمانوں کو خداؤں

* و یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل — بقرہ — ۲۷ ۔

سے آباد سمجھتے تھے اور ستاروں کی ، مثل خداؤں کے ، پرستش کی جاتی تھی - تحت قمری دنیا انقلاب و فنا کی دنیا تھی ، دنیا کو اس لئے بنظر حقارت دیکھا جاتا کہ آسمان کو پوجا جا سکے - اسلام نے اس تقسیم کی بنیاد پر ایک ضرب شدید لگائی اور بآن واحد اور واشگاف انداز میں یہ بتلایا کہ تمام مظاہر فطرت ، جن کا نزول آسمان سے زمین پر ہوتا ہے ، خدا کی قدرت و فضل اور اس کے معتدل نظام کو ظاہر کرتے ہیں - جو قانون سیاروں کو اپنے مدارات پر باقاعدہ سیر و گردش کا پابند رکھتا ہے ، وہی ایک برگ کاہ کی روئیدگی بھی کرتا ہے - یہ دونوں مظاہر یکساں طور پر الوہی اور معجزانہ ہیں - جو ان مظاہر کو سمجھتے ہیں انہیں ایک ہمہ خیر اور اعتدال پسند خالق پر ایمان لانے کے لئے کسی اور معجزہ کی ضرورت نہیں ہے - کیونکہ جو لوگ اپنے یقین و ایمان کےلئے عجائب آفرینیوں کے طلبگار ہیں وہ ان کے باوجود بھی ایمان نہیں لائینگے اور انہیں فریب خیال اور سحر آفرینیوں سے تعبیر کرینگے - اسلام نے کائنات کے ان تصورات کو دوبارہ جوڑا جنہیں انسان نے علیحدہ کر دیا تھا مگر جو ایک حقیقت اولیٰ ، خدا کی ذات میں متحد تھے -

اس کے بعد ہم فطرت پرستوں سے دوچار ہوتے ہیں جو صرف فطرت پر ایمان رکھتے ہیں - اور موضوعی خدا پرست بھی ہیں جن کا ایک ایسے خدا پر ایمان ہے جو کائنات سے لاپروا ہے ، بلکہ اس سے بیزار بھی ہے - چنانچہ ہم قرون وسطیٰ میں ایسے رہبانوں کو پاتے ہیں جو تمام کائنات کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور اپنے جسموں کو اور جو چیزیں ان سے متعلق تھیں ، انکو شیطان کا حصہ سمجھتے تھے - اسی طرح ہندوستان میں ہم کو

ھندو جوگیت ملتی ھے جو تمام فطری تقاضوں کو نظر حقارت سے دیکھتی تھی ۔ خدا اور کائنات بالکلیہ ایک دوسرے سے علیحدہ کر دئے گئے تھے ۔ یہ اسلام ھی تھا جس نے دوبارہ کائنات کو عظمت و تقدس کا درجہ عطا کیا اور اس کو بطور کھلی شہادت اور عقلی و تخلیقی محبت کے پیش کیا ۔

خارجی کائنات کو دو ٹکڑوں ، آسمان و زمین ، میں جدا کردیا گیا تھا ۔ ایک عالم نور تھا ، دوسرا عالم ظلمت ۔ ایک یزداں کی حکمرانی تھی ، دوسری اھرمن کی عملداری ۔ اسی طرح انسان کی فطرت بھی دو حصوں ، روح و جسم ، نفس و مادہ ، اور عقل و جبلت میں منقسم تھی ۔ تمام تقشف اور ترک دنیا کی جڑ یہی افتراق و انقطاع تھا ۔ انسان رحمان و شیطان کا نقطۂ اتصال سمجھا جاتا تھا ۔ اس کا جسم اور اس کی جبلتیں شیطان کا مظہر تھیں ۔ جسم اور تمام طبیعی خواھشات کو پوری طرح مغلوب کرنا لازمی تھا ۔ نفس و جسم کی ایک عضوی وحدت ، جسے انسان کہا جاتا ھے ، اس کی اس طرح قطع و برید نے اس کے دونوں حصوں کو مردہ کر دیا تھا ۔ اسلام نے اس لحاظ سے بھی انسان کو نجات دلائی کہ اس نے اس کی ان جبلتوں کی تقدیس کی اور ان کے کاموں پر چند پابندیاں عاید کر دیں ۔ لیکن ان کو پوری طرح دبایا نہیں گیا بلکہ ان کو ضبط و قابو میں لایا گیا ۔ تمام متقشفانہ اعمال جو جسم کو ضرر یا تکلیف پہنچاتے تھے یا جو غیر ضروری اذیت کا موجب ھوتے تھے ، انہیں ممنوع قرار دیا گیا ۔ قرآن نے ان مرتاض عیسائیوں کی توصیف کی جو خدا کے عشق میں سرشار تھے اور دنیا پر رجوع الی اللہ کو ترجیح دیتے تھے ۔ لیکن ساتھ ھی وہ یہ بھی کہتا ھے کہ یہ لوگ غلط راستوں پر چل پڑے ، اور زھد و پرھیزگاری کی ماھیت کو نہ سمجھ سکے ، جو دراصل

سادہ زندگی بسر کرنا اور زندگی کے معمولی کاموں میں مصروف ہونا ہے۔ قرآن میں اخلاقی احکام کو حدود اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جبلتوں کو حد اور قابو میں رکھ کر شخصی اور معاشری خوشحالی کے لئے استعمال کرنا ضروری ہے۔ جبلتیں ایک متحرک زندگی کی تشکیل کرتی ہیں اور روحانیت کا راستہ یہ ہے کہ ان قوتوں کو صحیح راہ پر لگایا جائے۔ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ خدا نے کوئی چیز بے کار پیدا نہیں کی۔ ہمارے وجدانات اور جذبات خاص مقاصد کی پابجائی کے لئے عطا ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایک مقررہ وظیفہ ہے۔ انسان ایک ناقابل تقسیم کل ہے۔ اس کا جسم ایک عضوی وحدت ہے، اسی طرح اس کا نفس بھی۔ اور نفس و جسم باہم مل کر ایک اعلیٰ وحدت کی تشکیل کرتے ہیں۔ انسان اگر عقل کو وجدان سے، یا جسم کو روح سے جدا کرے تو وہ غلطی کا ارتکاب کرتا ہے۔ روح و جسم کا باہمی تعامل ایک امر واقعہ ہے، خواہ یہ ہماری عقل نظری کے لئے کتنا ہی ناقابل فہم ہو۔ ہمارے جسم کا ہر عمل ہمارے نفس کے اعمال پر اثر ڈالتا اور تبدیلی پیدا کرتا ہے اور ہر عارضی خیال یا احساس ہماری پوری عضویت میں ایک ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ خواہ ہم اس سے باخبر ہوں یا نہ ہوں۔ اسلام بار بار قلب سلیم اور جسم سلیم کی حکمت پر عمل کرنے کی تلقین کرتا ہے، جس کو گمراہ مذہبیت نے اس حد تک بھلا دیا تھا کہ قرون وسطیٰ میں رہبان غسل کو گناہ سمجھتے اور جونووں کو خدا کے عطا کردہ موتی خیال کرتے تھے، جن کو جسم اور کپڑوں میں پرورش پانے اور پھیلنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ کتنے رہبان اور راہبات اسکی وجہ سے ٹائفس (Typhus) کا شکار ہوئے۔ سخت

بالوں کے کرتے زیر جامہ کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے تا کہ جسم کو تکلیف پہنچے اور روح اپنی غذا حاصل کرسکے۔ اہل ہنود کے جوگیانہ اعمال اس سے بھی بدتر تھے۔ انسانیت کے لئے اسلام کی زبردست خدمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اس قسم کی روحانیت کا بھانڈا پھوڑا اور جسم و لباس کو پوری طرح صاف رکھنا فرض گردانا، جس کے بغیر عبادت کا نذرانہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی زندگی جسمانی ہونے سے زیادہ کچھ اور بھی ہے، لیکن جسم روح کا ایک آلہ ہے۔ کسی جسمانی بنیاد پر ہی انسانی اور الٰہی اقدار کی بالائی عمارت کا کھڑا کرنا ضروری ہے۔ تمام جبلتیں اپنے وظائف اور ساتھ ہی اپنے حقوق رکھتی ہیں۔ ان سب کو اپنے حدود میں رہ کر کار گذار ہونا چاہئے تا کہ کسی دوسرے کے حق میں دست اندازی نہ ہونے پائے۔ جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ تجاوز ہے نہ کہ جبلتوں کے وظائف و اعمال۔ اخلاقیت بجز ان کے صحیح عمل کے اور کچھ نہیں۔ اگر ان کا گلا گھونٹ دیا جائے تو نیکی کا کوئی وجود نہیں رہتا۔

اسلام ایک کامل مذہب تکمیل ہے۔ تاریخ میں ہم پہلی مرتبہ من حیث الکل انسان کی ترقی کے عقیدہ کو دیکھتے ہیں، جو خود اپنے آپ سے، معاشرہ سے اور کائنات سے ہم آہنگ و ہم رنگ ہے۔ اور یہ تمام سالمیت ایک خالق کے اعتقاد پر مبنی ہے، جو جملہ موجودات کی وحدت ہے۔ موجودات میں درجہ بندی ہے، لیکن تمام درجات غایت اور عضویت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسانیت کی وحدت کا عقیدہ بار بار قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔

یا یھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس

واحدة ط (النساء - ۱)

''اے افراد نسل انسانی ! اپنے پروردگار (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو - وہ پروردگار جس نے تمہیں اکیلی جان سے پیدا کیا -''

یہ انسانیت کی وحدت و اتحاد کا عقیدہ ہے - انسانیت کی قبائل و اقوام میں تقسیم آپس کی پہچان اور شناخت کے لئے ہے - تاریخ میں پہلی مرتبہ قبائیلیت اور قومیت کی معاندانہ تقسیم برخاست کر دی گئی اورکل مہذب انسانیت کو دعوت دی گئی کہ وہ ایک مشترک مقصد پر ایمان لائیں اور اس کے لئے زندہ رھیں - نسل یا قوم یا رسم و رواج کے ذیلی اختلافات کی تفریق کئے بغیر نجات و سعادت کو تمام نیک انسانوں تک وسعت دی گئی - وہ لوگ جو ایک خدا پر ایمان لائے اور نیکو کارانہ زندگی گذاری ، وہ ایک ملت کی حیثیت رکھتے ھیں ، اور انہیں جزئیات میں اختلاف کے سبب آپس میں لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں - یہ کم از کم مشترک اساس ہے جو مہذب انسانیت کو دی گئی - اسلام نے محض خالی خولی مواعظ کہال کی طرح ان کی تلقین نہیں کی بلکہ اس پر عمل کرکے دکھلایا اور ایک نئے معاشری نظام کی داغ بیل ڈالی - اس نے عرب اور غیر عرب ، یہود اور غیر یہود ، حبشیوں اور تمام قوموں کے مظلوم و بے کس انسانوں کو مساوی حقوق عطا کئے -

عقل و جبلت میں موافقت پیدا کرکے پہلے انفرادی حیثیت سے انسان کی تکمیل کی گئی ، بعد ازاں اس معاشرہ سے اس کا توافق کیا گیا جس میں کہ وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے - اور آخر میں تمام معاشری جماعتیں ایک مثالی خدا کی وحدت اور اخلاقیت پر ایمان کے ذریعہ باھم متحد کردی گئیں -

تاریخ کے آخری دور میں مسلمانوں نے تنگ نظر تقلید پرستی کو نشو و نما دی ، جس نے بین قومی اخوت کا دروازہ صرف ان لوگوں کے لئے کھلا چھوڑا جو اسلام کی برادری میں داخل ہوئے تھے - اور دیگر مذاھب کے پیروؤں کی طرف دوستی کا ھاتھ بڑھانا بتدریج موقوف کر دیا گیا - اسلام صرف شرک کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھتا ھے ، جس سے انسان اور خدا کی توھین ھوتی ھے - اور جو انسانیت کو کئی متخالف معبودوں کی پرستش کے ذریعہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ھے - شرک محض کوئی ما بعد الطبیعی اعتقاد نہیں ھے ، جس کا اختیار بحیثیت تصوری مفروضہ کے ضرر رساں نہ ھو - جو اس کو اختیار کرتے ھیں یہ ان کی زندگیوں میں ایک گھاؤ ڈالدیتا ھے - یہ انہیں توھم پرست بناتا ، ان کے اخلاق کو پست تر کرتا ، اور ان کے شخصی و اجتماعی اتحاد و خوشحالی کی راہ میں حائل ھوتا ھے - خیالی خداؤں اور فطری طاقتوں کو پوجنے والے مشرکین ، جن کے معبود از روئے قرآن ان کی خواھشات کے آفریدہ وھم و گمان ھوتے ھیں ، انسانیت سے کمتر درجہ پر سمجھے جاتے ھیں - لیکن پھر بھی یہ سکون سے زندگی بسر کر سکتے ھیں ، اگر یہ دوسروں کو امن کے ساتھ رھنے دیں - دیگر تمام لوگوں کو جو ایک خدا پر اور سب کے لئے ایک اخلاقیت پر ایمان رکھتے ھیں ، صلح و آشتی کے ساتھ انسان کے مشترک مقاصد کے لئے کام کرنے کی دعوت دی گئی ھے -

ان الذین امنو و الذین ھادوا و لنصرٰی و الصابئین
من امن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحا فلھم اجرھم
عند ربھم ج ولاخوف علیھم ولا ھم یحزنون (البقرہ - ۵۹)

جو لوگ (پیغمبر اسلامؐ پر) ایمان لا چکے ھیں ، وہ ھوں یا وہ لوگ ھوں جو یہودی ھیں ، یا نصاریٰ یا صابی ھوں ، لیکن

جو کوئی بھی خدا پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے اعمال بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائیگا، اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی''۔

موجودہ دور میں بہت سے مذاہب ایسے رونما ہوئے ہیں جو مذہب انسانیت ہونے کے دعویدار ہیں، جن کے ذریعہ وہ بلالحاظ قومیت اور رسمی اختلافات کے زمین پر بسنے والے تمام نیک انسانوں کو باہم متحد کر سکتے ہیں۔ گذشتہ صدی میں فرانسیسی فلسفی آگسٹ کونت (August Comte) نے ایک ایسے ہی مذہب کی تلقین کی جہاں خدا کی بجائے، جس کو عقل و فطرت نے معزول کر دیا تھا، انسانیت کی پرستش کی جاتی تھی۔ جن لوگوں نے اخلاق اور تہذیبی حیثیت سے انسان کی ترقی میں فائدہ پہنچایا تھا وہ اولیائے انسانیت کہلائے جاتے تھے۔ کیتھولک مذہب کی تقلید میں اس نے ان بزرگوں کی ایک تقویم تیار کی تھی جس میں مختلف ایام کو مختلف بزرگان انسانیت کی یاد و تذکیر کے لئے مختص کیا گیا تھا۔ اس کے عقیدہ میں لا الٰہی انسانیت کافی تھی پھر ایسے خدا کی کیوں فکر کی جائے جس کا کوئی وجود نہیں؟ ایک قلیل مدت کے لئے اس نے چند معتقدین بھی فراہم کر لئے لیکن اس کے بعد یہ مذہب فنا ہوگیا، کیونکہ یہ انسان کے راسخ وجدان کو لبھا نہ سکا۔ اس قسم کے بہت سے دوسرے مذہبوں کی طرح یہ تحریک بھی بے جان ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ہم بہائیت سے دو چار ہوتے ہیں جس نے اسلام کے اصول میں بجز ایک نئے پیغمبر کے، جو خدا کی یگانگت اور تمام مذاہب کے اتحاد ہی کی تعلیم دیتا تھا، کوئی اضافہ نہیں کیا۔ ایک نئی وحی

منزل کی طرح اس کی پذیرائی کی گئی ، حالانکہ کوئی نئی بات اس میں نہیں تھی - اسلام لوازم وحی کی بابت یہ تعلیم دیتا ہے کہ اس میں کوئی نئی چیز نہیں ہو سکتی - خدا کی وحدت کی حقیقی صداقت اور انسانوں کے ساتھ محبت اور انصاف کی تعلیم تمام بڑے مذاہب اور پیغمبروں نے دی تھی - جب کبھی قرآن دین کے اصل اجزاء کی بابت گفتگو کرتا ہے تو کہتا ہے کہ تم ان کو تمام مذاہب کی کتابوں میں پاؤ گے - تمام دنیا میں ایک خدا پر ایمان فاسد ہو چکا تھا ، خالص خدا پرستی تقریباً مفقود ہوچکی تھی ، اور ہر کہیں یہ اعتقاد فرسودہ ہو چکا تھا - اسلام نے اس زنگ کو اس عقیدہ سے دور کیا تاکہ وہ دوبارہ اپنی اصلی درخشانی کے ساتھ تاباں ہوسکے - یہ بطور خود انسانیت کی ایک زبردست خدمت ہے - ''خدا ایک ہے ، وہ بے نیاز ہے ، نہ اس نے کسی کو جنا ، اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا - نہ اس کے جیسا یا اس کے برابر کوئی دوسرا ہے'' * - نہ وہ کسی وجود میں اور نہ ہی جملہ کائنات میں حلول کئے ہوئے ہے - وہ تمام قیود و حدود سے ماوراء ہے ، جن کو ہم اس کی طرف منسوب کرتے ہیں - وہ غیر مرئی ذات ہے - لیکن تمام حیات ، قوت اور اقدار کا دائمی سرچشمہ بھی وہی ہے -

خدا کی ہستی اگرچہ کہ ہر چیز سے کاملاً منزہ ہے ، لیکن قدرت اور علم کے لحاظ سے کل کائنات اور انسان کی روح کا احاطہ کئے ہوئے ہے - یہ تینوں ایک سالم کل کی تشکیل کرتے ہیں - یہ جامعیت کی تعلیم اسلام کی خدمت کو اولیت کا درجہ دیتی ہے - اسلام سے قبل عقل کے پرستار

---

* قل ہو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد - ولم یکن لہ کفوا احد -

موجود تھے جو اس کو بطور حقیقت اولیٰ کے مانتے تھے۔ رواقیوں کی طرح کائنات کو خدا کے مماثل قرار دینے والے بھی موجود تھے۔ نوفلاطونیوں اور ویدانتیوں کی طرح خالص تنزیہہ کی تبلیغ کرنے والے بھی انسانیت کے ایک بڑے حصہ پر متصرف تھے۔ یہودیوں نے خدا کے تصور کو بحیثیت اخلاق قادر مطلق کے ترقی دی تھی۔ اخلاقی اصول بھی اسلام نے ایجاد نہیں کئے تھے۔ اخلاق ہمیشہ مہذب انسانیت کے ساتھ متلازم رہے ہیں۔ جس کی تصدیق اصطلاح معروف سے ہوتی ہے، جس کو قرآن نیکی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس کے معنی مشہور اور نمایاں کے ہیں۔ جب انسان کی روح بے لوث ہوتی ہے، تو نیکی اس کے نزدیک سب سے نمایاں چیز ہوتی ہے۔ فلاسفہ اور انبیاء نے اس کو ایجاد نہیں کیا ہے۔ جب اسلام منظر عام پر آیا تو صداقت کے یہ تمام پہلو فاسد یا مجرد ہو چکے تھے اور حیات اپنی مجموعیت کھو چکی تھی۔ لیکن صرف ایک کامل ہی مفید و صحت بخش ہوتا ہے۔ انسان نے ان چیزوں کو جدا کر دیا تھا جن کو خدا نے جوڑا تھا۔ اسلام کی اصل خدمت یہی ہے کہ اس نے علیحدہ کردہ اجزاء کو پھر سے جوڑ دیا۔ اسلام کوئی انتخابیت نہیں تھا جو صرف فرداً فرداً ترقی یافتہ اور تبلیغ شدہ صداقتوں کو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رکھ دیتا۔ یہ ایک عضوی وحدت اور تخلیقی امتزاج تھا۔ جب تم صرف ان اجزاء پر نظر ڈالو گے، جن کو اسلام نے متحد کیا ہے، تو تمہیں کوئی چیز نئی معلوم نہ ہوگی۔ ہر چیز کی بابت یہ جائز طور پر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی دوسروں نے بھی جداگانہ تبلیغ کی تھی اور اسے روبہ عمل لایا گیا تھا۔ لیکن جب تم ان

اجزاء کو ملا کر ایک سالم صورت دو گے تو اسلام کی جدت طرازی، تخلیقی امتزاج اور عمل ارتقاء میں ایک زبردست پیش قدمی کی صورت میں رونما ہوگی۔

اب میں اجتماعی زندگی کے دوسرے رخ کو پیش کروں گا، جس میں ایک ایسا زبردست رخنہ رونما ہؤا جو اجتماعی زندگی کے لئے مضرت رساں تھا۔ تمام مذاہب نے مذہبی پیشوائیت کو ترقی دی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی بابت یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ مذہب کے اسرار و رموز سے واقف ہیں، اور رسم و رواج کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی انہیں تعلیم دی گئی ہے۔ یہ ایک علیحدہ جماعت تھی جس کی تعظیم و توقیر اور پرستش کی جاتی تھی۔ کوئی مذہبی رسم بلا ان کی شرکت کے تکمیل نہیں پاتی تھی اور یہ خدا اور انسان کے درمیان واسطہ بنے ہوئے تھے۔ ان عقائد کی رو سے خدا تک بلا واسطہ رسائی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ یہ درمیانی واسطے اور شفاعت کرنے والے عوام پر بڑا اثر رکھتے تھے اور ان کو مرعوب کئے ہوئے تھے۔ مذہب اس استحصالی جماعت کا ایک اجارہ بن چکا تھا۔ بھکشو، سادھو، جوگی، برہمن اور کیتھولک پادری روحانیت کے اجارہ دار تھے۔ جنت اور دوزخ کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں تھیں، کیونکہ فوق الفطرت تک صرف ان ہی کو رسائی حاصل تھی۔ مذہب کو عوام کی روزمرہ کی زندگی سے چھین کر پروہتوں اور قسیموں کی جماعت کے حوالہ کر دیا گیا تھا۔ زندگی سے مذہب کی علیحدگی نے معاشرہ کو مصنوعی طور پر علحدہ کئے ہوئے حصوں میں منقسم کر دیا تھا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر دیندار اور دنیادار ہر طبقہ تباہ حال تھا۔ معاشرہ ایک عضویت کی حیثیت رکھتا ہے جس کے مختلف اعضاء

کو خدا نے باہم مربوط رکھا ہے۔ لیکن جب معاشرہ طبقات میں بٹ جاتا ہے تو جسم اپنی صحت کھو دیتا ہے۔ اور آخر میں اس کا ہر عضو فنا ہو جاتا ہے۔

اسلام نے مذہبی پیشوائیت کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ ہر شخص کے لئے خدا کا پیغام موجود تھا، تاکہ وہ اس کو تلاوت کرے، دھرائے، سنے اور اس پر عمل کرے۔ خدا کا فرمان ہے کہ ''میں تمہاری پکار کا جواب دیتا ہوں''*۔ ''میں تمہاری رگ گردن سے بھی قریب تر ہوں''†۔ نہ تو کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت ہے اور نہ کسی قسم کے منتر دانوں کی حاجت۔ تمہیں صرف تعظیم و عبودیت کی وضع اختیار کرنا، اور اپنی روح کو کاملاً خدا کے سپرد کر کے صدق دل سے راہ راست پر چلنے کی دعا کرنی ہے۔ یہی باتیں ہیں جنکا اسلام انسان سے تقاضا کرتا ہے۔ یہاں مذہبی استادان فن کی کہاں گنجائش ہے، جنکی بطور طبقۂ اعلیٰ کے ناز برداری کیجائے؟ جماعتی عبادات میں جو تم میں سب سے بہتر اور قابل ہو وہ امامت کرے۔ نسل کے لحاظ سے یہ کام ایک حبشی بھی کر سکتا ہے، اور عمر کے لحاظ سے ایک بچہ بھی اس کام کو انجام دے سکتا ہے۔ اسلام کے پیش نظر اس وقت جو دنیا تھی اس میں غیر طبقاتی جماعت کا تصور تک نہ تھا۔ جب کبھی دیگر علاقوں سے سفراء اور ملنے والے اسلامی معاشرہ کو، جسے آنحضرتؐ نے پیدا کیا تھا، دیکھنے کے لئے آتے تھے تو جو چیز سب سے زیادہ انہیں متحیر اور متاثر کرتی تھی وہ یہی غیر طبقاتی حیثیت تھی۔ ایک رومی سفیر نے جو آنحضرتؐ کے زمانہ میں آیا تھا، اپنے وطن کو واپس

---

* اجیب دعوۃ الداع — بقرہ ۔ ۱۸۶
† و نحن اقرب الیہ من حبل الورید — ق ۔ ۱۶

لوٹ کر جو اطلاع اس نے مسلمانوں کے متعلق دی وہ یہ تھی کہ سب سے عجیب چیز ان میں یہ ہے کہ یہ راتوں میں رہبانوں کی طرح عبادت کرتے ہیں اور دن میں سپاہی اور شہسوار بن جاتے ہیں۔ وہ ایسے انسانوں کا تصور نہیں کر سکتا تھا جو قابل عمل طریقہ پر ان دو فرائض کو جمع کر سکتے ہوں۔ اس طرح ہر پیشہ کی قدر و منزلت قائم کی گئی اور ذات پات کی تقسیم، جو اعلیٰ و ادنیٰ کاموں پر مبنی تھی، اٹھا دی گئی۔ آنحضرت ؐ کے پہلے جانشین حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو خلیفہ ہونے کے بعد حضرت عمر رضؓ نے دیکھا کہ اپنے کندھوں پر کپڑے کا گٹھا اٹھائے ہوئے جا رہے ہیں۔ کیونکہ اسی تجارت پر آپ کی گذر بسر تھی۔ حضرت عمر رضؓ نے کہا کہ آپ ایک ساتھ اس قسم کی تجارت اور ایک عظیم سلطنت کا نظم و نسق نہیں کر سکتے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضؓ نے فرمایا کہ انہیں اپنے خاندان کی پرورش کرنی پڑتی ہے۔ حضرت عمر رضؓ نے کہا کہ وہ بیت المال سے اپنے لئے کچھ وظیفہ قبول فرمائیں۔ آپ نے اس شرط پر رضامندی ظاہر فرمائی کہ وہ صرف اتنا ہو جو غذا اور لباس کی معمولی ضروریات کے لئے کافی ہو سکے۔ اسلام میں متعدد ایسی عظیم المرتبت شخصیتیں، فاضلین اور عالمان دین کی ہیں، جنہوں نے ایسے معمولی پیشے اختیار کئے جن کو حقیر و ذلیل قرار دے کر ایک یونانی، رومی، یا ہندو اپنے لئے کسرشان سمجھے گا۔ تمام پیشے ہر ایک کے لئے کھلے ہوئے تھے، اور کوئی پیشہ عیب نہ تھا۔ اجتماعی وحدت و مساوات کو اس طرح دوبارہ قائم کرنا گویا ان کاموں کا از سر نو اتحاد تھا جن کو خدا نے جوڑا تھا، لیکن اسلام سے قبل انسان نے جدا کر رکھا تھا۔

قرآن کہتا ہے کہ انسان ان کو نہ توڑے جن کو خدا نے جوڑا تھا۔* اور ہم اس اصول کی مزید تفہیم کے لئے معاشری زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بحث کریں گے۔ خدا نے دو جنسوں کی زندگی کو عمل پیدائش میں تعامل اور ہر ایک بچہ کی پرورش و پرداخت کے لئے باہم متحد کیا تھا۔ معزز ترین اور شریف ترین انسان عورتوں ہی کے بطن سے پیدا ہوئے اور خواہ وہ حضرت عیسیٰؑ ہوں یا حضرت محمدؐ عورت ہی سب کی ماں ہے۔ آنحضرتؐ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو دیکھا جو آپ کی موجودگی کے سبب کسی قدر خوف زدہ ہو رہا تھا۔ آپ نے فوراً ارشاد فرمایا کہ "اطمینان رکھو، میں بھی ایک عورت ہی کا بچہ ہوں"۔ اسلام سے قبل تمام دنیا میں عورت اپنی آزادانہ حیثیت کھو چکی تھی، وہ دیگر اشیاء اور مویشیوں کی طرح از روئے قانون اثاث البیت سمجھی جاتی تھی۔ عورت اپنے حق میں کوئی جائیداد نہیں رکھ سکتی تھی۔ وراثت میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ ابوی نظام میں، جو متمدن دنیا کے بیشتر حصہ میں رائج تھا، ایک غیر شادی شدہ لڑکی قانوناً اپنے باپ کے کامل اختیار میں ہوتی تھی۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے اختیار میں چلی جاتی تھی، اور شوہر کے مرنے کے بعد اس کا محافظ و نگران اس کا بیٹا ہوتا تھا۔ کسی عمر، مرتبہ، اور حالت میں اس کو یہ حق نہ تھا کہ وہ اپنی زندگی آزادانہ طریقہ پر گذار سکے یا کوئی جائیداد اپنے نام پر رکھ سکے۔ وہ کسی کے نکاح میں یا زیر تصرف بلا رضا و خواہش کے دے دی جاتی تھی۔ اسلامی قانون پہلا قانونی ضابطہ تھا جس نے عورت کو شہری حقوق

* و یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل

عطا کئے تھے ۔ اس کو اپنے نام پر جائیداد رکھنے کا حق دیا
تھا ، اور یہ حق بھی ملا تھا کہ وہ اپنے شوہر کا انتخاب
کر سکے ۔ نیز ایسے شوہر سے جو اخلاقی ، معاشی اور جسمانی
لحاظ سے نا اہل ثابت ہو علیحدگی کا حق بھی اسلام نے اسے
عطا کیا تھا ۔ نکاح کو ایک معاہدہ کی صورت دی گئی تھی ،
جس میں دونوں جماعتیں قانونی شرائط داخل کر سکتی تھیں ،
جن کی عدم تعمیل پر عقد نکاح کالعدم ہو جاتا تھا اور جانبین
دوسری شادی کے لئے آزاد ہوتے تھے ۔ اسلام کے نکتہ چین
کہتے ہیں کہ تعدد ازدواج اور طلاق کی آسانی نے عورت
کے حق میں سخت نا انصافی کی ہے ۔ اس مخالفانہ نکتہ چینی
کا سبب کچھ تو قرآنی احکام سے ناواقفیت اور اس اجازت کا
ان افراد کی طرف سے غلط استعمال تھا جن پر زوال پذیر اسلامی
حکومت نہ کوئی طاقت رکھتی تھی اور نہ ان پر کوئی قابو
رکھنے کی خواہش مند تھی ۔ کسی قانون کو اس کے بے جا
استعمال کے سبب ، خواہ وہ عام طور پر ہو یا مخصوص صورتوں
میں ، بدنام کرنا تقاضائے انصاف نہیں ۔ کثیر الازدواجی ہمیشہ
اسلامی معاشرہ میں ایک استثنائی صورت رکھتی ہے ۔ میرے
خیال میں یہ دعویٰ یقین کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی
تاریخ کے کسی دور میں بھی تعدد ازدواج پر عمل ایک یا دو
فیصد سے زیادہ نہیں رہا ۔ اس کا سبب تمام معاشروں میں عورت
اور مرد کا مساوی تناسب ہے ۔ کثیر الازدواجی کسی سوسائٹی
کا عام طریق نہیں بن سکتا ۔ اگرچہ ناجائز جنسی تعلقات کا
مختلف درجوں میں امکان ہوتا ہے ۔ چنانچہ ہم وحشی اقوام میں
بھی اس کو پاتے ہیں اور ان کا روز افزوں رواج مغرب کے
بعض انتہائی تہذیب یافتہ علاقوں میں بھی پایا جاتا ہے ۔ جہاں

عورت اور بچوں کے ساتھ نا انصافی کا اندیشہ ہو وہاں اسلام تعدد ازدواج کی ممانعت کرتا ہے۔ اگر نا انصافی ثابت ہو جائے تو دوسری بیوی رکھنے کی اجازت کو عدالت روک سکتی ہے۔ اگر دوسری عورت کے ساتھ نکاح کے قوی وجوہ موجود ہوں، یعنی بے اولاد کو اولاد کی خواہش ہو، یا پہلی بیوی کی صحت انتہائی درجہ خراب ہو تو اس کی صرف یہی دو متبادل صورتیں ہو سکتی ہیں کہ پہلی بیوی کو بالکل چھوڑ دیا جائے اور اس کی زندگی کو بلا کسی خطا کے تباہ و برباد کر دیا جائے یا اس کو مناسب طریقہ پر بحیثیت بیوی کے دوسری بیوی کے ساتھ پوری خبر گیری سے رکھا جائے۔ مطلقہ عورت اکثر حالتوں میں اخلاقی اور معاشی حیثیت سے تباہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ برنارڈشا نے کسی جگہ کہا ہے کہ عقل مند عورت نصف شوہری تعلقات کو بے شوہری پر ترجیح دیگی۔ اگر پہلی بیوی کے ساتھ نا انصافی کی جائے اور اہم معاملات میں اس کے خلاف امتیازی برتاؤ کیا جائے تو عدالت میں وہ اپنے حقوق منوا سکتی ہے۔ اگر اسلامی عدالت ہو تو وہ اس ظلم و نا انصافی کی داد رسی حاصل کر سکتی ہے۔ کثیرالازدواجی کی استثنائی اجازت کے لئے انصاف ایک ناگزیر شرط ہے، جس کے بغیر یہ ناجائز ہے۔ قرآن کثیر الازدواجی کے خلاف آگاہ کرتا ہے کہ اس میں انتہا درجہ نا انصافی کا احتمال ہے۔

نکاح و طلاق کا وہ قانون جس کو اسلام نے پیش کیا، اپنے معاصر مذہب یا قوم کے کسی قانون سے اس خصوص میں بے انتہا آگے بڑھا ہوا تھا۔ ہندوؤں اور عیسائیوں میں طلاق کی اجازت نہیں ہے، جس کے سبب بے شمار گھریلو رنجشیں اور

افسوس ناک معاشری نتائج رونما ہوتے ہیں - جب عیسائیوں نے بھی آخر کار طلاق کی ضرورت محسوس کی تو اس کے حصول کے جو شرائط عاید کئے گئے وہ اس قدر مضحکہ خیز تھے کہ اس کے فوائد کذب بیانی ، خفیہ سازش اور وکیل کی فیس سے گرانبار ہو جاتے اور اس کے سبب جو مصارف اور خفت اٹھانی پڑتی تھی وہ ایک عام شہری کے لئے ناقابل برداشت تھی - آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ جائز چیزوں میں اللہ کے نزدیک مبغوض ترین فعل طلاق ہے* - اس لئے اگر ممکن ہوسکے تو اس سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے - دوستوں اور رشتہ داروں کو درمیان میں لا کر صلح و صفائی کرنی چاہئے - وہ آدمی جو طلاق کا ارادہ رکھتا ہے اس کو اپنے فیصلہ پر غور کرنے کے لئے کافی وقت ملنا چاہئے - معینہ وقفوں سے اپنے فیصلہ پر بالتکرار اظہارات کے بعد اس کا یہ فیصلہ موثق ہوتا اور آخری صورت اختیار کر سکتا ہے - جب وہ آخری فیصلہ کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس کو کسی وکیل ، عدالت یا جھوٹے الزامات تراشنے کی ، جس سے خود اس کی نیکنامی یا بیوی کی عزت پر حرف آتا ہو ، کوئی حاجت نہیں رہتی - گھر کے جھگڑے بازار میں چکانے نہیں پڑتے - عورت کو بھی خلع کا اختیار ہے ، اگر وہ ثابت کر دے کہ اس کا شوہر اپنے فرائض ادا کرنے سے قاصر ہے - اگر باہمی رضامندی سے وہ خلع حاصل نہ کر سکے تو ایسی صورت میں عدالت اس کی دستگیری کے لئے دخل دیتی ہے - چونکہ وہ کمزور اور معاشی حیثیت سے دست نگر ہوتی ہے ، اس لئے عدالت کو اس کی مدد کرنی چاہئے - اگر وہ اپنے ساتھ ناانصافی

* ابغض المباحات عند اللہ و طلاق

ثابت کر دے تو ایسی صورت میں عدالت اس کی مدد کریگی۔ آنحضرتؐ نے ایک عورت کی طرف سے طلاق کی درخواست کو طبیعت کی انتہائی نامناسبت کی بنیاد پر بھی منظور فرمایا تھا ۔ اسلام کی تقریباً چودہ صدیاں گذرنے کے بعد بھی مغرب کے بعض زبردست مفکرین اس حق کے حصول کے لئے ہنوز بحث و تمحیص میں ہی مصروف ہیں ۔

تمام متمدن اقوام ایک صدی سے زیادہ مدت سے اس امر کے لئے کوشاں ہیں کہ قوانین نکاح و طلاق کو اسلامی قانون کے قریب قریب لائیں اور غیر اسلامی اقوام کی خواتین جائداد کی تملیک اور وراثت کے حقوق حاصل کرنے کے لئے سخت جدوجہد کر رہی ہیں ۔ حال حال تک انگریزی قانون نے زوجہ کے اپنے نام پر جائداد رکھنے کے حق کو تسلیم نہیں کیا تھا ۔ انگریزی قانون میں زن و شوہر دونوں ایک ہی شخصیت سمجھے جاتے تھے ، اور وہ ایک شخصیت شوہر ہی ہوتا تھا ۔ لڑکی اپنے باپ کے گھر میں رہنے تک از روئے قانون ملازمہ کی حیثیت رکھتی تھی اور جب اسکو اغوا کر لیا جاتا یا فریب دے کر بھگا لیا جاتا تو باپ ورغلانے والے کے خلاف یہ نالش کرتا تھا کہ اس نے لڑکی کی خدمات سے اسے محروم کر دیا ۔ ہندو مجموعۂ قوانین کی نظر ثانی بھی اسلامی قانون کے لگ بھگ لانے کے لئے کی جا رہی ہے ۔ ہندو تقلید پرستی اور قدامت پرستی اپنے مصلحین پر طعنہ زن ہے کہ وہ اپنے مجوزہ قوانین نکاح و طلاق اور لڑکیوں کو حق وراثت عطا کرنے میں ہندو سوسائٹی کو اسلامی بنانا چاہتے ہیں جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا ہے ، قرآن اور بائبل کی ایک دلپذیر آیت ہے کہ جس کو خدا نے جوڑا تھا اس کو توڑا نہ جائے ۔ عیسائیوں

کی طرف سے اس کی یہ غلط تشریح کی جاتی ہے کہ اس جملہ سے تمام حالتوں میں طلاق کی ممانعت کی گئی ہے۔ اسلام میں صرف ایک شادی شدہ جوڑا جو صلح و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اور ان فرائض کو بخوبی انجام دیتا ہے جن کا یہ مکلف ہے، تو وہ خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا محبت، اتفاق اور اتحاد ہے۔ جہاں ناقابل اصلاح اختلاف ہوتا ہے وہاں خدا کی رحمت نہیں ہوتی، اس لئے ایسی ناسازگار شادیوں میں جدائی خدا کے جوڑے ہوئے رشتہ کو توڑنا نہیں ہے۔ یہی نقطۂ نظر تھا جس کو اسلام نے اختیار کیا اور یہ ایک نہایت معقول نقطۂ خیال ہے۔ متاہل زندگی کی بنیاد فرض اور محبت پر استوار ہونی چاہئے۔ اگر محبت نہیں ہے، یا کسی وقت تھی لیکن اب باقی نہیں رہی، اور اگر موجودہ صورت حال یا کسی ایک یا دونوں کی طرز و روش، فرائض کی انجام دہی میں حائل یا بہتر رفاقت میں مزاحم ہے تو انفرادی اور اجتماعی خوشحالی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے جوڑے میں خود اس کے مفاد کی خاطر اور عام طور پر سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لئے علیحدگی کر دی جائے۔

اسلام کے معنی امن کے ہیں، اور ایک مسلمان کا گھر دارالامن ہونا چاہئے۔ کوئی عنصر جو اس سکون میں دخل انداز ہو تو اس کا اخراج ضروری ہے۔ یہ عدم تشدد کے حامی حضرت عیسیٰؑ کا قرار دادہ آئین ہے کہ "اگر تیری داہنی آنکھ تجھے اذیت پہنچا رہی ہو تو اسے نکال باہر کر"۔ قانون طلاق پر غور کرتے وقت عیسائی اس مقولہ پر کیوں عمل پیرا نہیں ہوئے؟ حضرت عیسیٰؑ بھی امن کے خواستگار تھے، اس لئے انہوں نے یہ اصول پیش کیا تھا۔ جہاں دوا اور غذا نفع

بخش نہیں ہوتی ، وہاں انسان عمل جراحی کی طرف رجوع کرتا ہے ۔ ہیئت اجتماعیہ کے دکھ بیماری میں عمل جراحی کو کیوں ممنوع قرار دیا جائے؟ معاشرہ پرامن اور فرض شناس خاندانوں پر مشتمل ہونا چاہئے ۔ جب فرض کی ادائیگی اور خوشحالی ناممکن ہو جائے تو خاندانی وحدت کو آئینی اور پر امن طریقہ پر ٹوٹ جانا چاہئے تا کہ اس کے اراکین نئی دوستیوں میں امن و سکون تلاش کر سکیں اور نئے حلقوں میں موافقت و اتحاد کے دیگر ذرائع آزمائیں ۔

ہم نے آیت زیر بحث کی یہ اجمالاً تفسیر کی ہے کہ نیکی خدا کے قائم کئے ہوئے رشتوں کو توڑنے پر مشتمل نہیں ہے اور یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح اسلام ہر موقع پر مسالمت کا خواہاں ہے ۔ خدا اور کائنات ، جسم و روح ، عقل و وجدان ، قانون و محبت سب اسلام کے ذریعے متحد کر دئے گئے ۔ انکی ایک دوسرے سے علیحدگی نے مذہب و معاشرہ کو ہر جگہ تباہ کر دیا تھا اور یہ ان کی باہمی مسالمت ہی تھی جو ان کی انفرادی اور اجتماعی صحت بحال کر سکتی تھی ۔ اسلام کا دفعتاً نصف متمدن دنیا پر چھا جانا ، ہر جگہ انسان کی تہذیب و شائستگی کو نئے سانچے میں ڈھالنا اور صدیوں تک علم و ثقافت میں قیادت کرنا ، تاریخ کی ایک بوالعجبی معلوم ہوتی ہے ۔ اس اعجاز کا راز اسلام کا تخلیقی امتزاج اور صداقت کے اجزائے ترکیبی کی ہم آمیزی تھی جو ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر اپنی قدر و قوت کھو چکے تھے ۔

سیرت

ایک انسان کے متعلق سب سے اہم چیز اس کا نظریۂ زندگی ہوتا ہے ، جس کو اجمالی طور پر اس کا فلسفہ کہہ سکتے

ھیں ۔ اس مفھوم میں ایک گڈریا بھی اپنا ایک فلسفہ رکھتا ھے ۔ نظریات اعمال پر منتج ھوتے ھیں ۔ اگر انسان عادتاً کسی طریقہ پر عمل پیرا ھو تو اس سے اس کی سیرت کی تشکیل ھوتی ھے ۔ اس لئے یہ کہہ سکتے ھیں کہ کسی شخص کے لئے نہایت اھم چیز اس کی سیرت ھوتی ھے ۔ سیرت ایک مکمل نظام ھے جو ایک خاص قسم کے ارادی افعال سے ترکیب پاتی ھے ۔ یہ کسی دنیائے آرزو کا مسلسل غلبہ ھوتا ھے ۔ حیات انسانی میں کسی خاص موقع پر اچھے یا برے مقصد کا اتفاقی تسلط اس کی سیرت کی تشکیل نہیں کرتا ۔ سیرت کا استحکام کسی مسلسل غالب نظریہ سے ھوتا ھے ، جس کی نمود خاص رنگ کے مستقل اعمال میں ھوتی ھے ۔ سیرت کردار کی بنیاد ھوتی ھے ، اور کردار بالعموم حالات کی حد بندیوں میں سیرت کا اظہار ھوتا ھے ۔ پھر بھی انسان کی سیرت میں ایسی بہت سی چیزیں ھوسکتی ھیں جن کا اظہار صریحی افعال میں کم یا بالکل نہیں ھوتا ۔ سیرت بالآخر انسان کی فطرت بن جاتی ھے ۔ اس کا کچھ حصہ اس کی اصل فطرت ھوتی ھے اور کچھ حصہ ایسی فطرت ھوتی ھے جس کی پرورش عادات سے ھوئی ھو ۔ بالآخر یہ عادات ھی ھیں جو انسان کی سیرت کی تشکیل کرتی ھیں ۔ کسی نے کیا خوب کہا ھے کہ ''جیسا عمل کروگے ویسی عادت پڑے گی ، جیسی عادت رکھو گے ویسی سیرت بنے گی ۔ اور جیسی سیرت ھوگی ویسی قسمت پاؤ گے ''۔ آخر میں جا کر سیرت انسان کی قسمت بن جاتی ھے ، جس سے بچنا اس کے لئے مشکل یا ناممکن ھو جاتا ھے ۔ حالات اس کے عمل کے لئے مناسب اوقات ھوتے ھیں ۔ سیرت اور حالات میں کچھ عرصہ کے لئے تعامل ھوتا ھے ، اور ایک دوسرے کو بدلتا ھے ۔ لیکن سیرت کے ایک مرتبہ

مضبوطی سے جم جانے کے بعد حالات ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ھیں اور انسان اپنی قسمت کو زندگی کی تمام حالتوں میں ساتھ لے چلتا ھے۔ اس کے بعد حالات کا کوئی تغیر اس کی سیرت کی خامی کو درست نہیں کر سکتا۔ تغیر و تبدل کے زبردست فلسفی ھیریکلیٹس (Heraclitus) نے بھی سیرت کو مثل قسمت کے بتلایا ھے۔ اس نوبت پر سیرت ظاھر و باطن، اور حرکت و سکون کا آئینہ اور زندگی کا ایک کارفرما عنصر بن جاتی ھے۔

تہذیبوں اور مذھبوں کو اس قسم کی سیرت سے جانچا جانا چاھئے جس کی تعمیر کا یہ موجب ھوتے ھیں۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ھے، اور کسی تہذیب کا ثمرہ اس کے مردوں اور عورتوں کی سیرت ھوتی ھے۔ کسی تہذیب کا اندازہ ان اعلیٰ سیرتوں سے کیا جا سکتا ھے جن کو کہ وہ پیدا کرتی ھے۔ اس کی جانچ اس کے مجرموں، خطا کاروں یا گم کردہ راھوں سے نہیں کی جا سکتی۔ پھر کسی تہذیب کا اندازہ اس کے عام رجحان کے ذریعہ اس اوسط سیرت سے کر سکتے ھیں جو وہ پیدا کرتی ھے۔

ھمیں اس سیرت کے تصور کی تشریح کرنی چاھئے جس کو اسلام اپنے پرستاروں کے سامنے پیش کرتا ھے۔ ھم یہاں اس امر کا اعادہ کرینگے کہ اسلامی اخلاق خالص دنیوی اخلاق نہیں ھے۔ اسلام کی رو سے اخلاقیت خدا کی ذات اور اس پر ایمان سے وابستہ ھے۔ اس لئے قرآن جب کہیں ایک مثالی انسان کا ذکر کرتا ھے تو اسے ایک ایسے مہربان وجود حقیقی پر ایمان لانے والا بتلاتا ھے جو تمام اقدار حیات کو پیدا کرتا اور قائم رکھتا ھے۔ قرآن اس عقیدہ کو بنیادی اور ھمہ وافی

سمجھتا ہے ، جس سے کل علم اور کل نیکی بطور ضمنی نتائج کے پیدا ہوتی ہے۔ فلسفیانہ طور پر غور کیا جائے تو خدا پر ایمان حقیقت میں نظام اخلاق اور اخلاقی اقدار کی واقعیت پر ایمان لانا ہے۔ محض دنیوی اخلاقیت کا وجود حقیقی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک حرارت خانہ کا پودا یا گملے کا بوٹا ہے۔ ہکسلے (Huxley) نے اپنی رومانی تقاریر میں دنیوی اخلاقیت پر بحث کی ہے ، جو انسانی زندگی کی آنی و فانی پیداوار ہے اور جس کا مقابلہ لاپروا یا مخالف اخلاق کائنات سے بھی ہے۔ وہ ہمیں ظالم اور غارت گر اقدار کائنات کے مقابلہ میں نیکوکار اور دلیر رہنے کے لئے کہتا ہے۔ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو یہ جان کر بھی کہ نیکی اور بدی دونوں ناکامی کا منہ دیکھیں گے ، نیکوکار بننے کی ہمت کر سکیں گے؟ اسلامی اخلاقیات اس اعتقاد پر مبنی ہے کہ تمام حقیقی اقدار صداقت ، حسن ، خوبی اور مسرت ، عین ذات کی حقیقتیں ہیں نہ کہ مظہر اقتباسات۔ خدا نظام اخلاق کا کفیل ہے ، اور ہم سے کہا گیا ہے کہ دائرۂ تخلیق میں ہم اس کے ساتھ ہم کار رہیں۔

علم اور سیرت کے باہمی تعلق کی بابت فلسفۂ اخلاق میں بڑی معرکہ آراء بحث ہوتی رہی ہے۔ فلسفۂ اخلاق کے معلم اول سقراط نے یہ تبلیغ کی کہ علم خیر ہے اور شر جہالت۔ جو کوئی علم صحیح رکھتا ہے وہ ضرور اچھے کام کرتا ہے۔ بدکار فی الحقیقت جاہل لوگ ہوتے ہیں ، جو شر کو غلطی سے خیر جان کر اس کے حصول کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ وہ اس کو خیر سمجھتے ہیں۔ کوئی شخص برائی کو برائی سمجھ کر نہیں کرتا ، وہ کسی نہ کسی طرح اس کو مثل خیر کے دیکھتا ہے۔ بعد میں ارسطو نے اس نظریہ پر تنقید کی اور کہا کہ خیر ،

علم اور عادت کا مجموعہ ہے ، تنہا علم میں اتنی قدرت نہیں کہ وہ آدمی کو نیکوکار بنا سکے -

اسلام کے مسلمہ اصول کے مطابق علم یا ایمان کے مختلف درجات ہیں- سقراط اور افلاطون نے علم و عقیدہ میں فرق و امتیاز کیا ہے ، لیکن میرے خیال میں اسلام کے ترتیب دادہ مدارج زیادہ حکمیاتی اور حقیقی ہیں - ایمان کی درجاتی ترتیب علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین سے کی گئی ہے - یہ یقین کے تین مختلف درجات ہیں - علم الیقین منطقی نتائج سے حاصل ہوتا ہے اور تمام ماہرین نفسیات اس امر پر متفق ہیں کہ کسی عمل کے لئے موثر محرک ہونے کے لئے یہ نہایت کمزور اور غیر یقینی ہے - کسی لمحہ بھی کوئی مخالف قوی استدلال اس کو جڑ بنیاد سے متزلزل کر سکتا ہے - محض ذہنی قیاسات ، بحیثیت محرک افعال ، ہم سب کو شیکسپیر کے ہملٹ کی طرح بنا دیں گے ، اور ہمارے تمام افعال کے اصل محرکات پر مایوسی کا پردہ ڈال کر فیصلہ کے نازک موقعوں پر ہمیں بے دست پا کر دیں گے - عقل و ایمان کے متعلق مولانا روم نے کہا ہے :

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

انسان کے زیادہ تر عقلی معتقدات اسی نوعیت کے ہیں اور جس یقین کو وہ پیدا کرتے ہیں وہ انتہائی کمزور ہوتا ہے - محض تصوری علم کے متعلق قرآن کہتا ہے وما لھم بہ من علم ط ان یتبعون الا الظن و ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً ہ * ''اور انہیں حقیقت کے متعلق کچھ علم نہیں

* النجم — ۳۰ —

ہے ۔وہ محض ظن و قیاس کی پیروی کر رہے ہیں اور بلاشبہ حق کے متعلق ظن و تخمین کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتے "۔

اس لئے بطور ایک اساس کے سیرت کی تشکیل اور ایک مستحکم و غالب دنیائے آرزو کی تخلیق کے لئے محض قیاس اور تصوری علم کم ہی کارآمد ہوتا ہے۔ یقین کا دوسرا بلند تر درجہ عین الیقین کا ہے۔ ہم خارجی کائنات اور دوسروں کی زندگیوں میں چند واقعات کو دیکھتے ہیں اور ان سے خیر و شر کی بابت چند اعتقادات گڑھ لیتے ہیں ۔ اگر ہمارا شعوری تجربہ کافی وسیع ہو تو ہم ایسے واقعات سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں جن کا ہم سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا۔ یہ چیز محض عقلی تصور کے مقابلہ میں عمل کے لئے کسی قدر بہتر رہنما اور محرک بن سکتی ہے ۔ لیکن یقین کا ایک اعلیٰ اور آخری درجہ اور بھی ہے جسے حصول و یافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم اپنی زندگیوں میں متعدد مرتبہ دیکھ چکے ہیں کہ صداقت ، جس کی بابت ہم زندگی بھر سنتے اور جس کو ہم دوسروں کی زندگیوں میں دیکھتے رہتے ہیں ، جب خود ہماری زندگی میں اس کا تجربہ ہوتا ہے تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ ہم کو اس کی حقیقت کا القاء و الہام ہؤا ہے۔ اس قسم کے یقین کا رنگ اور انداز نمایاں ہوتا ہے ، اور ہم حقیقت کو اس کے پورے کمال میں نہ صرف خارجاً بلکہ اپنے وجود کے بطن البطون میں دیکھتے ہیں۔ یہ علم کا کمال ہے جہاں وہ زندگی اور عمل کے مماثل ہو جاتا ہے ۔ اس لئے انسان کی سیرت کی اساس فی الحقیقت علم کی یہی آخری صورت ہے ، جس کو ہم نظریۂ زندگی یا فلسفۂ حیات کہہ سکتے ہیں۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ ہر سیرت کسی شدید دلی جذبہ کے تابع ہوتی ہے ، جو تمام

دیگر خواہشات کو اپنا محکوم بنائے رکھتا ہے ۔ ہم اس تشریح کو تھوڑا سا آگے بڑھا کر یہ دریافت کرسکتے ہیں کہ کیا سبب ہے کہ مختلف اشخاص مختلف شدید دلی خواہشات کو ترقی دیتے ہیں ۔ در حقیقت یہ ایک طرح سے اقدار کا سوال ہے ۔ جو شخص کسی چیز کی قدر دوسری تمام چیزوں سے بڑھ کر کرتا ہے ، وہ اس کے لئے اپنے اندر ایک خواہش پیدا کرلیتا ہے ، جو زندگی کے ہر پہلو کو اپنے تابع کرلیتی ہے ۔ قدر کے اندازے، حقیقت کی نوعیت اور جن پر وہ مشتمل ہے اس کی بابت اعتقاد کے اندازے ہیں ، جو کوشش اور حصول کے قابل ہے ۔ ایک بخیل زر کی محبت کو اس مقصد سے ترقی نہیں دیتا کہ وہ ضروریات اور تعیشات زندگی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے ، بلکہ وہ زر کو زر ہی کی خاطر چاہتا ہے ۔ اس کے نزدیک یہی اس کی حقیقی قدر ہوتی ہے ۔ وہ اپنے سے مافوق کسی دوسری چیز کا ذریعہ نہیں ہوتی ۔ یہ زندگی کا نہایت گمراہ کن تصور ہے ، لیکن شدید دلی خواہش بن کر یہ راسخ عقیدہ بن جاتا ہے ۔ بعض اوقات نہایت لاپروائی سے اس کا اظہار کیا جاتا ہے کہ معتقدات کی کوئی حیثیت نہیں ، جو کچھ اہمیت ہے وہ اعمال ہی کی ہے ۔ مگر یہ نفسیاتی طور پر غلط ہے ۔ انسان جیسا کہ اس کی بناوٹ ہے ، محض وقتی تحریکات پر عمل نہیں کرتا ، بلکہ اس کے طریق و روش کے پس پردہ اس کا تصور حیات ہوتا ہے ، جس کو معین طریقہ پر الفاظ میں بیان تو نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن وہ بعینہ موجود رہتا اور شعوری اور غیر شعوری طور پر مثل قوی داعیہ کے زندگی کو حرکت دینے والی قوت کی طرح کار فرما ہوتا ہے اور اس کے تعلقات کا تعین دیگر اشخاص اور اس کے ماحول سے کرتا ہے ۔

اس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اسلام انسانی زندگی میں نہایت اہم عنصر ہونے کے سبب ایک بنیادی اعتقاد پر اصرار کرتا ہے ، انسان کا یہی بنیادی اعتقاد ہے جو بالآخر اس کی سیرت کو متعین کرتا ہے ۔ اسلام جس قسم کی سیرت کو ترقی دینا چاہتا ہے آخر میں اس کا انحصار بنیادی اعتقاد پر ہوتا ہے ، جس کو وہ نہایت حقیقی اور انتہا درجہ قابل قدر سمجھتا ہے ۔ اس کا بنیادی اعتقاد یہ ہے کہ خدا یا حقیقت اولیٰ ایک ہے ۔ یہ اعتدال پسند اور ذی شعور تخلیقی ارادہ ہے ۔ یہ ایک غیر محدود علم اور ایک غیر محدود قوت ہے ۔ جیسا کہ ہم نے متعدد قرآنی آیات سے توثیق کی ہے ، اس حقیقت کی غالب صفت محبت و خوبی ہے ۔ خدا اخلاقی نظام کا ضامن اور تمام اقدار کا محافظ ہے ۔ اس کے پاس ہر چیز کے غیر محدود خزانے ہیں ۔ کوئی چیز اس کے غیر محدود علم اور قدرت سے باہر نہیں ، لیکن وہ معینہ مقدار اور مقررہ تجویز کے مطابق تخلیق کرتا ہے اور ان کو وہ من مانے طور پر نہیں بدلتا ۔ زندگی جس طرح دیکھی ، سمجھی اور معلوم کی گئی ہے ، وہ ایک عظیم غیب کا جز ہے ۔ لیکن یہ غیب شہود کی تردید نہیں کرتا بلکہ اس کا ایک ترتیبی سلسلہ ہے ۔ خدا تمام وحدتوں کی وحدت اور تمام موافقتوں کی موافقت ہے ۔ ”اس کے لئے اعلیٰ صفات ہیں“۔* اسکا مفہوم یہ ہے کہ وہ تمام حقیقی اور دائمی اقدار کا فوق تجربی سر چشمہ ہے ۔ تمام کائنات اس کی مخلوق ہے ، اس لئے وہ مختلف درجات میں اسکے صفات کی صورت پذیری ہے ۔ ایک طرح پر تمام کائنات ایک ہے ، اور دوسرے طریقہ پر تمام انسانیت ایک ہے ۔ انسان کو ذی شعور ہستی کے فرض منصبی کے طور پر تمام کائنات کے

---

* له الاسماء الحسنیٰ ۔

مطالعه کا بالعموم اور فطرت انسانی کے مطالعه کا بالخصوص شوق دلایا گیا ہے - کیونکه اس کا مطالعه جتنا گہرا ہو گا وہ اس کے نظم و ترتیب ، معقولیت اور مقاصد کی مطابقت پذیری پراتنا ہی یقین لائے گا -

اس مطالعه اور اس ایمان سے نیکی کا ایک خاص تصور پیدا ہو گا - کائنات میں ہر چیز اپنا فرض پورا کررہی ہے اور جیسا که قرآن کہتا ہے ، ''خوشی یا ناخوشی سے'' اس کو اطاعت کرنی پڑتی ہے - کائنات میں بلحاظ ماہیت کوئی شر نہیں ہے - چنانچه قرآن کہتا ہے ، ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئاً و ہو حسیر - ''تم اسی طرح یکے بعد دیگرے دیکھتے رہو ، تمہاری نگاہ اٹھیگی اور عاجز و درمانده ہو کر واپس آجائے گی ، لیکن کوئی نقص نه نکال سکے گی ''- یه سائنس کا بنیادی اعتقاد ہے که ہر جگه علاقۂ علت و معلول کا ظہور ہے ، اور بد نظمی کا کہیں وجود نہیں - ایسے ہی اسلام کہتا ہے که ہر جگه نظام رحمت کی کارفرمائی ہے - و رحمتی وسعت کلّ شی - ''اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کا احاطه کئے ہوئے ہے ''- جہاں کہیں اعتدال پسند محبت ہوگی وہاں بد نظمی نہیں ہو سکتی - کائینات کی بعض چیزوں میں ہماری کوتاہ نظری یا تشبیہی نگاہ سے دیکھنے کے سبب شر اور برائی معلوم ہوتی ہے ، ورنه خدا کے کائناتی علم اور قدرت کے لحاظ سے شر بالکل نہیں ہے - حقیقی شر کہیں نہیں ہے - البته اخلاقی برائی کا وجود یقیناً ہے جو انسان کے اختیار و اراده کا نتیجه ہے - اختیار دو دھاری ہتھیار ہے - انسان اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے خدا کی صفت اختیار سے نوازا گیا ہے ، جو اس کے لئے دو متبادل راہیں

کھولتا ہے۔ یا تو وہ مشیت الٰہی سے ہم ساز ہو کر دیگر
مخلوقات سے بلند ہو جائے یا اس سے روگردانی کرکے اسفل سافلین
میں پہنچ جائے۔ اسلام کی رو سے کوئی سیرت ابدی حقائق کے ساتھ
توافق کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جو زندگی اعلیٰ نصب العین
کے موافق بسر کی جاتی ہے وہ نہایت معتدل سیرۃ پیدا کرتی ہے۔
اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے نیکی جو ایمان سے پیدا ہوتی ہے
خوشحالی کی یقینی ضامن ہے۔ اس کا اندازہ لذت پرستانہ طریقہ
سے علم الاحصاء (Calculus) کے ذریعہ جسمانی لذت و الم یا
مادی نفع و نقصان سے اس مختصر زندگی میں نہیں لگایا جا سکتا۔
خود یہاں مادی سطح پر بھی انسان جسم کے علاوہ کچھ اور
بھی ہے۔ اور انسان کی کامیابی اور ناکامی کا اندازہ صرف ادنیٰ
سطح کی اصطلاح میں نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کامیاب ہونا
چاہتا ہے، لیکن اس کی کامیابی کے نصب العین اکثر محض
اوہام و ظنون ہوتے ہیں۔

قرآن یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر مرتبۂ وجود کے فروغ و
ترقی کا قانون مختلف ہوتا ہے۔ جو شخص دنیوی فائدوں کے
پیچھے لگا رہتا ہے اور اپنے تن من سے اس کے حصول کے
لئے وقف ہو جاتا ہے تو وہ یقیناً نفع دنیوی حاصل کر لیگا۔
اس دنیا کے قوانین کے مطابق وہ اسے عطا کئے جائینگے۔
لیکن ایسا آدمی دائمی اقدار سے محروم رہیگا۔ نصب العین کے
نقطۂ نظر سے ایسا آدمی بری طرح ناکام ٹھہرتا ہے۔ قرآن
کی ایک دلپذیر مختصر سورۃ اس حالت کا نقشہ نہایت مؤثر
انداز میں پیش کرتی ہے، و العصر ان الانسان لفی خسر
الا الذین امنوا و عملوا الصالحات و تواصوا بالحق
و تواصوا بالصبر ۝۔ ”قسم ہے اس دور تغیرات و عصر

انقلاب کی (کل تاریخ انسانیت کی) فی الحقیقت انسان کی زندگی سراسر ناکامی ہے، بجز اس کے جو ایمان لایا اور نیکوکار رہا اور باہمدگر صبر و استقلال اور صداقت کی تلقین کرتا رہا''۔

ہم نے مختصراً اس امر کی توضیح کی ہے کہ اسلام کے نزدیک ایمان کا کیا مفہوم ہے، جس کو زندگی کی اساس بننا چاہئے۔ یہ حقیقت کی وحدت پر ایمان لانا ہے، جو مشتمل ہے طبیعی اور ماورائے طبیعی موجودات پر۔ لہٰذا یہ ایک ایمان ہے انسانیت کی وحدت اور یگانگت پر، جس کا قرآن یہ کہہ کر اعلان کرتا ہے کہ کل انسانیت کی ایک وجود یا روح سے تخلیق ہوئی ہے اور من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ؕ و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً ؕ (المائدہ -۳۵) ''جس کسی نے سوائے اس حالت کے کہ قصاص لینا ہو یا ملک میں لوٹ مار مچانے والوں کو سزا دینی ہو، کسی جان کو قتل کر ڈالا تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا۔ اور جس کسی نے کسی کی زندگی بچا لی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی''۔ اس اعتقاد کے ضمنی نتیجہ کے طور پر ایک فرد انسان کی ہیئت اجتماعیہ کے جزو لا ینفک کی طرح وجود رکھتا ہے اور ایک حصہ کا نقصان گویا کل کا نقصان ہے۔ اسلام کی رو سے جس کسی نے اس تصور حیات کو ترقی دی اس نے بنیادی صداقت پا لی۔ اور جسقدر زیادہ مضبوطی کے ساتھ وہ اسکو حاصل کرلیگا اتنے ہی زیادہ یقین کے ساتھ وہ اپنی سیرت و کردار کا تعین کرے گا۔ اس لئے جملہ انانیت باطل اور خود کو تباہ کرنے والی ہے۔ یہ معاشرہ کے لئے موجب ہلاکت ہوگی، اور ایک خود پسند خود بھی اس سے تباہی و بربادی

میں گھر جائیگا۔

ہم کو پھر اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہئے جو بڑے فلاسفۂ یونان کے درمیان شدت کے ساتھ زیر بحث رہا اور جو ہر زمانہ میں شروع سے آخر تک پیچیدہ مسائل پیدا کرتا رہا۔ کیا ایمان یا علم سیرت کے تعین کے لئے کافی ہے؟ کیا ہم ایسے اشخاص کو نہیں جانتے جو ایمان رکھتے ہیں اور پھر بھی گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ روح ارادہ کرتی ہے لیکن جسم کمزور ہوتا ہے۔ ایک صاحب ایمان شخص کی زندگی بھی خلاف ورزی و انابت کے درمیان اکثر جھولتی رہتی ہے۔ ہم اس سے قبل ایمان کے درجات کی قرآنی الفاظ میں تشریح کر چکے ہیں۔ یہاں اس کو پیش کرنے کا مقصد قرآن کے اس امتیازی عقیدہ سے ہے کہ ایمان اعمال نیک سے جانچا جاتا ہے اور ان ہی سے تقویت پاتا ہے۔ اسلام کی رو سے ایمان کوئی ایسی چیز نہیں جو یا تو موجود ہو یا بالکل وجود نہ رکھتی ہو۔ اس کی قوت مختلف اشخاص میں مختلف ہوتی ہے۔ ایمان کی اعلیٰ قسم حقیقت و صداقت کا براہ راست ادراک ہے جس کو استکمال نفس کے کمال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جس میں ایک فرد نصب العین کو بالکلیہ اپنا لیتا اور محسوس کرتا ہے۔ یہ وہ نادر تحفہ ہے جو خدا کی طرف سے چند کو عنایت ہوتا ہے۔ یہ رویت حق جو کل فردیت کو جذب کر لیتی ہے اور جس میں ایک مطلق کلیتاً ایک مقید کو اپنے میں سمو لیتا ہے۔ یہ بعض انبیاء اور اولیاء کی تو مستقل حالت ہوسکتی ہے، مگر ایک عام انسان اس سے نہایت کمتر درجہ پر رہتا ہے۔ ہم میں سے بہت سوں کے لئے رویت حق برق کی چمک جیسی ہوتی ہےجو بہت جلد ہمیں دوبارہ تاریکی میں چھوڑ دیتی ہے۔ جسطرح قرآن عام بنی نوع انسان کو

مخاطب کرتا ھے ، وہ جانتا ھے کہ جب تک اچھے عمل سے ایمان کی تقویت نہ ھو وہ کسی قدر کمزور ھوتا ھے۔ جب سقراط نے کہا کہ علم نیکی ھے ، یا جب آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ خدا پر راسخ اور صادق ایمان نجات کے لئے کافی ھے ، تو ظاھر ھے کہ یہ حضرات علم یا ایمان کا نہایت غائر اور اعلیٰ سطح پر ذکر کر رھے تھے۔ اگر ایسا علم و یقین موجود ھے تو انسان کی روح قطعاً تمام انقلابات زندگی میں محفوظ رھے گی۔

قرآن ایمان کا ذکر عمل نیک کے بغیر بہت کم کرتا ھے۔ روح اسلام کو صاف طور پر سمجھنے کے لئے اس کی معنویت کو اجاگر کرنے کی ضرورت ھے۔ اب سوال یہ ھے کہ بیشتر اشخاص اپنا ایمان کہاں سے حاصل کرتے ھیں۔ لوگ زیادہ تر اپنے والدین اور معاشری گرد و پیش سے متاثر ھوتے ھیں۔ وہ چند چیزوں پر اعتقاد رکھتے ھیں کیونکہ جن لوگوں پر انہیں کامل عقیدہ ھے وہ ان چیزوں کے برحق ھونے کا یقین رکھتے ھیں۔ یہی وہ صداقت ھے جس کا آنحضرتؐ کی مشہور حدیث میں وضاحت کے ساتھ اعلان کیا گیا ھے کہ " ھر بچہ اپنی سادہ فطرت انسانی کے ساتھ پیدا ھوتا ھے۔ یہ اس کے ماں باپ ھیں جو اسے یہودی ، نصرانی ، اور مجوسی بناتے ھیں "۔* ایسا ایمان جس کا خارجی طور پر بڑے جوش و خروش سے اظہار کیا جاتا ھے ایک استوار نظریۂ حیات کی تخلیق یا سیرت کے لئے بنیاد کا کام دینے میں فی الحقیقت نہایت سطحی اور غیر یقینی اساس ثابت ھوتا ھے۔ ایسے اعتقادات بعض اوقات جماعتی تعصبات کی شکل میں بڑی تباھی مچاتے ، اور باھمی آویزشوں کے بد ترین ذرائع ثابت ھوتے ھیں۔ یہ کوئی

* کل مولود یولد علی الفطرة الخ —

زندگی کا تجربہ نہیں ہوتا جو ان ایقانات کو پیدا کرتا ہے ۔ ایک انسان کا ایسا ایمان جو محض معاشری حیثیت سے قبول کیا گیا ہو اس کا مرتبہ قرآن کے نزدیک نہایت کمزور ہے ۔ جب عرب پر اسلام کو سیاسی حیثیت سے غلبہ حاصل ہوا اور یہ دیکھا گیا کہ آنحضرتؐ پر راسخ ایمان لانے والوں نے اقتدار حاصل کر کے اپنے حقوق کو محفوظ کر لیا ہے تو جزیرہ نمائے عرب کے چہار اطراف سے لوگوں کا ہجوم شروع ہؤا تاکہ اس فتح مند مملکت میں شامل ہوں ۔ یہ لوگ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ یقین دلانے لگے کہ وہ بھی ایمان لا چکے ہیں ۔ آنحضرتؐ کو قرآن ان لوگوں سے یہ ارشاد فرمانے کے لئے کہتا ہے کہ یہ اسقدر جلد مومن نہیں بن سکتے ۔ ان کے لئے یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ اسلام کی برادری میں داخل ہو چکے ہیں اور اس کے قوانین کے اتباع کا اقرار کر چکے ہیں ۔ اب رہا اپنے حقیقی مفہوم میں ایمان کا معاملہ تو یہ بتدریج فکر صحیح اور درست زندگی سے حاصل ہوتا ہے ۔ جیسا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ ”علم سیکھنے سے حاصل ہوتا ہے ۔ اور تعلیم صداقت کا ایک عمل ہے ، کوئی فوری الہام و القاء نہیں ہے“ ۔

ایک مختصر سی جماعت ایسے اشخاص کی ہے جو حیات اور کائینات پر غور کرنے اور منطقی طریق سے چند نتائج پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ آزاد خیالی کا دعویٰ تو بہت سے لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے مگر یہ نہایت ہی کم یاب شئے ہے ۔ ایک انسان کا اصلی مزاج اس کو ایک میلان عطا کرتا ہے ۔ اس کے بعد وہ غیر شعوری طور پر اپنے مطالعہ اور سوسائٹی سے تعصبات اخذ کرتا ہے ۔ انسان اکثر اپنے آپ کو

یہ فریب دے لیتا ہے کہ وہ زندگی پر بلا کسی اثر اور میلان خاطر کے آزادانہ غور کر رہا ہے، لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ خود اس کے عادات یا دماغی اوہام، یا قومی امنگیں، آرزو مندیاں، اور چند شدید دلی خواہشات حقیقت تک راست رسائی میں کس قدر حارج ہو رہے ہیں۔ اگر وہ ایسے ناواجبی عوامل سے ایمان حاصل کرتا ہے تو اسلام کے نزدیک اس کی قدر کم ہے۔ انسان کی تربیت ایسی ہونی چاہئے کہ وہ اشیاء پر جیسی کہ وہ ہیں غور کرنا سیکھے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی اجمالی دعاؤں میں سے ایک یہ بھی ہے، ارنا الاشیاء کماھی ''خدایا اشیاء جیسی کہ وہ ہیں مجھے دکھلا''۔ انسان کے لئے یہ کسی قدر دشوار ہے کہ وہ اشیاء کا علم جیسی کہ وہ ہیں حاصل کرے، اس لئے اعتقادات، جن کی بابت یہ فرض کیا جاتا ہے کہ آزادانہ طریقہ پر حاصل کئے گئے ہیں مگر جو فی الحقیقت ناواجبی تحریکات کے ثمرات ہوتے ہیں، مذہب کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

اگر بالفرض کوئی انسان جو دماغی اوہام اور تعصبات سے پاک ہو اور حقیقتاً آزاد خیال ہو، اپنی عقل کے ذریعہ حیات کی ماہیت کی بابت چند نتائج پر پہونچ جائے، اور اگر اتفاق سے وہ نتائج صحیح بھی ہو جائیں تو کیا ایسی استنباطی اور استدلالی رسائی سیرت کی تشکیل میں محکم و یقینی اساس ہوسکتی ہے؟ کیا ایسا علم لازماً ایک مفکر کی زندگی کی سرگرمیوں میں صورت پذیر ہو سکتا ہے؟ اس خصوص میں اسلام سقراط کے مقابلہ میں ارسطاطالیس کی تائید کرتا ہے۔ اگر سقراط کا مطلب یہ ہے کہ نیکی اور علم مماثل ہیں اور جو کوئی نیکی کا علم رکھتا ہے وہ لازماً نیکو کار ہو گا، تو اس کی نفسیات ناقص ہے۔ چنانچہ ارسطو نے اس کی تصحیح کی اور یہ دعویٰ کیا کہ نیکی کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے محض عقلی ادراک ناکافی

ہے - نیکی کے کمال کے لئے یقیناً فہم درست کی ضرورت ہے - علم انسان کا فطری حق ہے ، اور کسی انسان کی فلاح کمال کو نہیں پہنچتی جب تک کہ اس کے پیچھے علم صحیح نہ ہو - لیکن انسان کا نفس محض عقل نہیں ہے - زندگی مادی اساس بھی رکھتی ہے - ہم وجدانات رکھتے ہیں ، جنہیں سنوارنا ، تربیت دینا اور اعلیٰ مقاصد کے تابع رکھنا پڑتا ہے - یہ ایک حقیقت ہے کہ اعمال کی مزاولت عادات کی تخم ریزی کرتی ہے ، اور عادات فطرت اصلیہ کی طرح طاقتور ہو کر انسان کی سیرت کی تکمیل کرتے ہیں جو اس کی اٹل قسمت بن جاتی ہے - ایسی صورت میں نیکی ہمارے مقصد زندگی کی بابت صحیح اعتقادات پر مبنی ایک عادتی فعل ہو گی - نیکی علم اور عادت کا مجموعہ ہے -

اسلام نے اس خصوص میں ارسطو کی تائید اپنے لوازم ایمان کے انضباط اور ہمیشہ نیک عمل کو ایمان کے ساتھ ملانے کے لئے کی ہے ، تاکہ اس کی آزمائش اورتقویت ہوتی رہے - ایمان پیہم غور و فکر اور ایسے ہی اعتقادات کو ہمیشہ اعمال کی صورت میں بدلتے رہنے سے ہے ، اسی طرح ایک یقین سے دوسرے یقین اور ایک قوت سے دوسری قوت کی طرف ترقی کرتے رہنے سے تعبیر ہے - حضرت عائشہؓ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ وہ کون سے نیک اعمال تھے جن کو آنحضرتؐ زیادہ پسند فرماتے تھے - آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''وہ اعمال جن پر انسان مداومت رکھتا ہے''- * قرآن کی تعلیم ہے کہ کسی انسان کے ایمان پر اعتماد نہ کیا جائے جب تک کہ وہ اعمال سے آزمایا نہ گیا ہو ، اور اپنے ایقانات کی سچائی ثابت نہ کر چکا ہو - محض چند عقائد اور مذہبی رسوم پر ایمان لانا اس کو اپنے نفس طبعی کی گرفت سے آزادی نہیں بخشیگا - نجات محض کسی اذعانی اصول کے اقرار کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی -

---

* و ان احب الاعمال الی اللہ مادام و ان قل — صحاح ستہ

باب یازدھم

امن اور جنگ

اسلام کو ایک صلح کل مذھب کی حیثیت سے اپنی حفاظت و قیام کے لئے لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں ، اس لئے مخالفوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ اس مذھب کی بنا طاقت و قوت ھے اور اسکی اشاعت تلوار سے ھوئی ھے - لیکن جس کسی نے کارلائیل کی طرح اسلام کے عروج کا عارفانہ مطالعہ کیا ھے ، یا گبن اور اس کے بعد متعدد لوگوں کی طرح بغیر فرقہ واری ، تنگ نظری کے دیکھا ھے ، وہ نہایت آسانی کے ساتھ اس الزام کی تردید کر سکتا ھے - اسلام ایک ایسے پیغمبر کی طرف سے پیش کیا گیا تھا جو معاشری ،اقتصادی اور سیاسی حیثیت سے کوئی دنیوی طاقت نہ رکھتا تھا ، قبل اس کے کہ آپ اپنی اور اپنے مٹھی بھر متبعین کی مدافعت میں قدیم قبائلی بربریت کے خلاف طاقت کا جواب طاقت سے دیں ، دس سال سے زائد عرصہ تک آپکو اور آپ کے متبعین کو ھر ممکن طریقہ سے اذیت پہنچائی گئی - آپ نے اور آپ کے متبعین نے اپنے مخالفین کے مقابلہ میں بے نظیر صبر و استقامت کا ثبوت دیا - حالانکہ وہ تمام دنیوی فوائد اور حصول روزی سے محروم کردئے گئے تھے اور انکو اپنا گھر بار چھوڑ کر جلا وطن ھونا پڑا تھا - تاریخ میں کوئی تحریک ایسی نہیں جو اس سے زیادہ جذبۂ ایثار و قربانی پیش کر سکتی ھو - جب ان کو قوت حاصل ھو گئی اور وہ خود کو جوابی حملہ کے لئے کافی طاقتور خیال کرتے تھے تب بھی آنحضرتؐ نے ایسے وقت کے انتظار میں

انہیں عرصۂ دراز تک روکے رکھا جب کہ وہ ممکنہ حد تک کم خونریزی کے ساتھ اپنے مقصد میں کامرانی حاصل کرسکیں ۔ وہ نہ صرف اپنے دین کے قیام کےلئے کوشاں تھے بلکہ عام مذہبی آزادی کے بھی خواہاں تھے ، تاکہ ہر شخص اپنے معتقدات کی پیروی کر سکے ، بشرطیکہ وہ ایک پرامن اجتماعی نظام کے اقل ترین حقوق و فرائض میں تفرقہ انداز نہ ہوتا ہو ۔ اگر آنحضرتؐ اپنے اصول و عقائد کی تبلیغ فوجی طاقت سے فرماتے اور عوام کے آگے تبدیل مذہب یا تلوار کی دو متبادل صورتیں پیش کرتے تو ایسی صورت میں کوئی اس بات کے کہنے میں حق بجانب ہوسکتا تھا کہ یہ ایک مذہب تھا جس کی اشاعت سنگین کی نوک پر ہوئی ۔ لیکن ایک ایسا مذہب جسکا بنیادی اصول لا اکراہ فی الدین ہو ۔ جو صریح نص قرآنی ہے ، وہ کس طرح لوگوں کو بزور شمشیر ایمان لانے پر مجبور کر سکتا ہے ۔ یہاں ایک سادہ سوال کیا جاتا ہے کہ یہ شمشیر باز خود کہاں سے آگئے تھے ؟ اگر بزور شمشیر مذہب بدلا گیا ، تو خود ان لوگوں کا مذہب کس چیز نے بدلا جو تلوار چلا رہے تھے ؟ آنحضرت کے خلاف زبردست طاقت استعمال کی گئی جبکہ آپ بجز حق و یقین کی قوت کے اور کچھ نہ رکھتے تھے ، لیکن آپ کو ستانے والے یکے بعد دیگرے آپ کی روحانی قوت سے مطیع و منقاد ہوتے گئے ۔ اسلام قبول کرنیکے بعد یہ سابق ستم پیشہ اور جدید الایمان خود دوسروں کے مظالم سہتے رہے ۔ یہ لوگ کیسے کیسے مظالم کا تختۂ مشق بنتے رہے ، اس ناگوار منظر کی نقش آرائی یہاں غیر ضروری ہے ۔ دس سال سے زیادہ عرصہ تک اسلام انتہائی حد تک عدم تشدد پر کاربند رہا ۔ تدریجاً اور مستقلاً اہل ایمان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ، لیکن ان پر ظلم و ستم جاری رہا اور انہیں جلا وطن

ہونا پڑا۔ یہاں تک کہ ایک ایسا زمانہ آیا کہ ان کے سامنے صرف دو ہی صورتیں رہ گئیں ، یا تو مذہبی آزادی کے لئے شمشیر بکف ہو جائیں یا نیست و نابود ہو جائیں۔ پھر اگر اسلام نے اپنے وجود کی بقا کے لئے جنگ آزمائی کی تو اس پر الزام کون دھر سکتا ہے۔

انسانی زندگی میں جنگ کا مقام سمجھنے کے لئے ساری مشکل اس واقعہ سے رونما ہوتی ہے کہ اسلام سے قبل جو مذاہب مثل بدھ مت اور عیسائیت کے متمدن انسانیت کے زیادہ حصہ پر پھیلے ہوئے تھے وہ کم از کم نظری حیثیت سے کسی مقصد یا سبب کے تحت جنگ آزمائی اور خونریزی کی ممانعت کرتے تھے۔ نہ صرف انسانی زندگی کو تلف کرنا گناہ تھا بلکہ موذی جانور ، جراثیم اور زہریلے حشرات تک کو مارنا مہا پاپ سمجھا جاتا تھا۔ تمام اخلاقیت اور روحانیت کا انتہائی مقصد امن اور عدم تشدد تھا۔ مگر بدھ مت ، جین مت اور عیسائیت نے اس کا مقصد غلط سمجھا۔ بدھ مت کے اھمسا کا اصول ناقابل عمل ہے۔ ہر زندگی کا آذوقہ کسی دوسری زندگی سے سربراہ کیا جا رہا ہے یا اعلیٰ کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ ادنیٰ کی زندگی پر بسر کرے۔ جیسا کہ رومی نے کہا ہے ”جملہ عالم آکل و ماکول داں“۔ بدھ مت کا مقصود سلب خواہشات کے ذریعہ حیات کی نفی کرنا تھا ، جس میں توالد و تناسل کی خواہش بھی شامل تھی۔ اھمسا پر سختی سے عمل کرنے سے نہ صرف انسانی زندگی بلکہ کل موجودات فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ ہندوستان میں بعض فرقے ایسے ہیں جن کے پیرو اپنے منہ کو کپڑے سے ڈھانکے رہتے ہیں تا کہ کوئی ظاہر و پوشیدہ کیڑا یا جرثومہ داخل نہ ہوجائے۔ یہ بیچارے اس کا علم نہیں رکھتے

کہ غیر شعوری طور پر یہ دن رات میں کتنے جانداروں کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ یہ جراثیم، جوں، کیڑے مکوڑے، سانپ، مچھر، اور دیگر تمام موذی جانوروں کو مارنا پاپ سمجھتے ہیں۔ بدھ مت اور جین مت کے اھمسا کے اصول کے موافق زندگی بسر کرنے کی یہ ایک کوشش ہے۔ لیکن یہ فریب خوردہ مخلوق اس کا احساس نہیں کرتی کہ نباتات بھی زندگی رکھتے ہیں۔ حیوانات کے کھانے سے پرہیز کر کے پھل اور سبزی پر گذارہ کرنے سے یہ ایک فروتر زینہ پر اتر کر ایک ذی حیات ہی کو کھاتے ہیں۔ ان اصول پر چل کر انسان کسی معقول اجتماعی نظام کو پا نہیں سکتا بلکہ وہ خود زندہ تک نہیں رہ سکتا۔

اس کے بعد ہم عیسائیت اور عہد نامۂ جدید کے دور میں پہنچتے ہیں۔ قرون اولیٰ کے عیسائی اس امر پر پکا یقین رکھتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ہر حالت میں جنگ کی ممانعت فرمائی ہے۔ حق اور ناحق لڑائی اور جارحانہ و مدافعانہ جنگ میں کوئی فرق و امتیاز نہ تھا۔ ہر قسم کی لڑائی اس نئے نظام میں ممنوع تھی۔ یہ یقین کیا جاتا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے ہر قسم کے انتقام کی ممانعت کی ہے۔ برائی کا مقابلہ نہ کیا جائے، برائی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے۔ ایک سچے عیسائی کے لئے صحیح طریقہ خاموش اور پر سکون شہادت تھی، اور ظالم کے انتقام کو خدا کے سپرد کرنا تھا۔ تمام حالات میں برائی کو بزور فرو کرنے پر امتناع حضرت عیسیٰؑ کے مفہوم کی غلط تشریح ہے۔ اصلاح انسانیت میں محبت اور عدم تشدد بڑے کام کی چیز ہے، اور حضرت عیسیٰؑ نے بجا طور پر انکی تاکید کی تھی۔ لیکن یہ وہی حضرت عیسیٰؑ تھے جنھوں نے کسی عبادت گہ

کے صحن میں سود خواروں کے خلاف کوڑے کا استعمال کیا تھا۔ اگر یہ کچھ اور زندہ رہتے اور صورت حال ابتر ہو جاتی تو ان کے درہ کی جگہ ممکن ہے تلوار لے لیتی۔ یہ سب کچھ ہونے پر بھی آپ ہی تھے جن کا ارشاد تھا کہ میں امن نہیں تلوار لایا ہوں۔ ممکن ہے کہ آپ نے یہ لفظ استعارةً استعمال فرمایا ہو، لیکن اگر آپ اپنے اور اپنے مذہب کے تحفظ کے لئے موت و زیست کی پیکار پر مجبور کیا جاتا تو یہ استعارے کی تلوار ممکن ہے کہ حقیقی شمشیر آہنی بن جاتی۔ کسی کو کیا معلوم کہ کیا ہوتا۔ آپ کے یقین واثق کو جانچنے یا آپ کے اصول کے حقیقی مضمرات کی پردہ کشائی کے لئے کوئی تاریخی صورت حال آپ کی زندگی میں رونما نہیں ہوئی۔ بعد ازاں جب عیسائیت دنیوی اقتدار کو سنبھالنے کے قابل ہوئی تو تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اس نے تلوار کا کس قدر استعمال کیا۔ اور اسکا استعمال حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے حق بجانب اور ان اساقفۂ اعظم کے فتووں سے جائز قرار دیا گیا، جو خود محبت و صداقت کے وارث سمجھے جاتے تھے اور گمان کیا جاتا تھا کہ جائز جنگوں اور مذہبی تعذیب کے قیام کے لئے انہیں حضرت عیسیٰؑ اور روح القدس کی طرف سے فیضان ہوتا ہے۔ اب بھی عیسائیوں کے چند فرقے اور بعض عیسائی افراد ایسے ہیں جو تمام جنگوں کو ناجائز سمجھتے اور ان میں شرکت سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں ان میں سے بعض قید کر دئے گئے تھے۔ یہ اپنے آپ کو ''معذوران شرعی'' کہتے ہیں۔

اسلام نے ایک اعتدال پسند اصول جنگ کی تبلیغ کی ہے۔ اور

اس پر عمل کرکے بھی دکھلایا - زمانۂ ما بعد میں بہت سی لڑائیاں جو مسلمان حکمرانوں نے مختلف تاریخی دوروں میں لڑیں، وہ اسلامی جنگیں نہیں تھیں - صرف وہی لڑائیاں اسلامی ھیں جن میں آنحضرتؐ اور آپ کے فوری بعد صحابہ مصروف پیکار ہوئے تا کہ اسلام محفوظ و مصؤن ھو اور مذھبی تعذیب و عقوبت کا قلع قمع ھو جائے - انسانی زندگی کا احترام اسلام کے بنیادی اصول میں سے ایک ھے، اور جنگ کی اجازت صرف انسانی زندگی کی جائز حفاظت اور حقیقی اقدار کے لئے ھے - انسانی زندگی کی حفاظت و احترام کے احکام سے قرآن معمور ھے - انسان کی زندگی کے احترام کی تعلیم میں انسان کے اجتماعی اتحاد کو بھی پیش نظر رکھا گیا ھے - من اجل ذالک ج کتبنا علی بنی اسرائیل انہ من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ط و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا ط (المائدہ - ۳۲) - " اسی بنا پر ھم نے بنی اسرائیل کے لئے یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی کی جان لے بغیر اس کے کہ اسے کسی جان کا بدلہ لینا ھو یا اس نے زمین میں کوئی فساد کیا ھو تو گویا اس نے سارے انسانوں کی جان لی - اور جو اس جان کو بچالے اس نے گویا سارے انسانوں کی جان بچالی - عرب نومولود لڑکیوں کو قتل کر ڈالتے تھے، کیونکہ یہ انھیں معاشری اور معاشی بوجھ سمجھتے تھے - اسلام نے اس رواج کا سختی سے خاتمہ کیا اور کل دنیائے اسلام سے اس رسم کا استیصال کر دیا اور یہ شرمناک جرم پھر دوبارہ متمدن دنیا میں اپنا سر نہ اٹھا سکا - جہاں دو آدمی بطور مبارزہ کے ایک دوسرے سے کسی بیہودہ جذبہ کے تحت برسر پیکار ھوں تو آنحضرتؐ کا ارشاد ھے کہ قاتل و مقتول دونوں جہنم واصل ھونگے - آنحضرتؐ

نے جب کبھی کبیرہ گناہوں کو شمار فرمایا تو اس فہرست میں ہمیشہ قتل موجود رہا۔ '' عظیم ترین گناہ یہ ہیں خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنا، قتل، والدین کی نافرمانی، اور جھوٹ بولنا۔'' (انس بن مالکؓ)۔ ''ایک مومن حدود ایمان میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ وہ کسی کا ناحق و ناروا خون نہیں بہاتا۔'' (ابن عمرؓ)۔

یہ خیال رہے کہ جہاں کہیں اسلام قتل کی ممانعت کرتا ہے، وہ ہمیشہ اس کو قتل ناحق سے مشروط کرتا ہے۔ '' تو قتل نہ کر'' یہ کوئی مطلق حکم نہیں ہے۔ زندگی میں بعض ایسے موقع آتے ہیں جبکہ قتل فرض اولین بن جاتا ہے۔ جہاں کہیں بدکار کو قتل کرنے کی اجازت دی گئی ہے وہاں فتنہ کا لفظ قرآن میں اکثر مستعمل ہوا ہے، اور کہا گیا ہے کہ '' الفتنۃ اشد من القتل ''۔ فتنہ کا ترجمہ کسی ایک انگریزی لفظ سے کرنا مشکل ہے۔ اس کے مفہوم میں امتحان، تحریص، کسی کو مشکلات میں پھانسنا، عقوبت، معاشری ظلم و زیادتی، کسی کو ناجائز اطاعت پر مجبور کرنا اور بجبر راہ راست پر چلنے سے روکنا، صداقت سے انحراف اور باطل کاموں کے لئے غلط رہنمائی کرنا شامل ہیں۔ اکثر یہ لفظ قرآن میں فساد کے ساتھ آیا ہے، جس کے معنی خرابی، تشتت و افتراق اور معاشری بد نظمی اور نا انصافی کے ہیں۔ اسلام میں قتل کی اجازت صرف فتنہ و فساد اور ظلم و زیادتی کو روکنے اور ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے ہے کہ بجائے خوف و دہشت کے قانون کی حکومت قائم ہو جائے۔ آنحضرتؐ کے غزوات ان لوگوں کے خلاف تھے جو بنی نوع انسان کو ضمیر کی آزادی سے محروم کئے ہوئے تھے۔ جو کوئی ان کی عبادات

اور طریقوں کا ساتھ نہیں دیتا تھا وہ ستایا جاتا، جلا وطن کیا جاتا یا قتل کر دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ خود کو دولت مند بنانے کی غرض سے مفتوح کے مال و دولت کے حصول کے لئے جنگ کریں۔ تمام فقہا اس پر متفق ہیں کہ محض توسیع ملک یا معاشی فائدوں کے لئے جنگ کرنا نا جائز ہے۔ اور نہ اس کے لئے جنگ جائز ہے کہ دوسروں کو بجبر مسلمان کیا جائے۔ فاروق اعظمؓ کے پاس ایک عیسائی غلام تھا۔ کبھی کبھی آپ اس کے سامنے اسلام کی خوبی و صداقت پیش فرماتے اور مسلمان ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ ہر وقت وہ غلام قبول اسلام سے انکار کرتا تھا۔ اس کے انکار پر حضرت عمرؓ یہ جواب ارشاد فرماتے کہ "جیسی تمہاری مرضی کیونکہ اسلام میں جبر نہیں ہے"۔ کیا حضرت عمرؓ جیسا شخص ان اقوام و ملل سے، جو عرب کے داھنے بائیں آباد تھیں انہیں بزور شمشیر مسلمان بنانے کے لئے جنگ کر سکتا تھا جبکہ وہ خود اپنے غلام کے مقابلہ میں بے بس ہو چکا تھا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

انسانیت کے روحانی رہنما کی حیثیت سے گوتم بدھ اور حضرت عیسیٰؑ کی مثال سامنے رکھ کر ان کے بعض معتقدین اور دیگر اشخاص ہر قسم کی جنگ کی ممانعت اور روحانیت کو ایک سمجھنے لگے۔ بعض عیسائی مصنفین کا یہ خیال ہے کہ آنحضرتؐ جبتک مکہ میں مصائب جھیلتے او تبلیغ فرماتے رہے ایک بہترین نبی تھے، لیکن جب آپ نے جنگ کو اختیار فرمایا اور ایک مملکت کی بنا ڈالی تو آپ ایک سیاست دان اور مقنن بن گئے۔ اس لئے آپ ایک پیغمبر نہیں رہے۔ یہ نبوت کا ایک نہایت ناقص تصور ہے کہ نبی اس وقت تک نبی رہتا ہے

جبتک کہ وہ محبت ، انصاف اور خیر خواہی کی بابت محض زبانی جمع خرچ کرتا رہتا ہے لیکن جس لمحہ وہ حقائق سے دو چار ہوتا ہے اور حالات کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنا شروع کرتا ہے تو وہ موجودات کی ادنیٰ سطح پر آ جاتا ہے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اعلیٰ تصورات کی تعلیم کس قدر آسان ہے اور انہیں انفرادی ، اجتماعی اور سیاسی آویزشوں میں رو بہ عمل لانا کس قدر دشوار ہے۔ جبتک کہ نظریات زندگی کے معاشری اور سیاسی تلخیوں اور سختیوں کے معیار پر نہ جانچے جائیں وہ فضاء میں معلق رہتے ہیں اور محض پند نامۂ کمال و خوبی اور نا قابل حصول رویائے صالحہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مصنف آنحضرتؐ کو تاریخ انسانیت کا زبردست پیغمبر کہتا ہے۔ جن کو عالم انسانیت کے آگے قابل عمل نظریات پیش کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔ جو اپنی حیات طیبہ میں اس حد تک انہیں رو بہ عمل لائے کہ باطمینان تمام یہ فرما سکے کہ "میں نے اپنے کام کی تکمیل کر دی"۔ جب آپ نے مذہبی تعصبات کا خاتمہ کر دیا اور مذہب کو ہر طرح آزادی دلا دی تو اپنی تلوار نیام میں رکھ لی۔ "لڑو ، یہانتک کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہے۔ جس کسی نے خدا کے امن میں آنا قبول کیا ، خواہ اس کا مذہب کچھ ہی ہو ، وہ تمہاری حفاظت میں ہے۔ اس کی جان و مال اور آبرو کی ایسی ہی حفاظت کرو جیسی کہ خود تم اپنی کرتے ہو"۔

اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کوئی مذہب اور تہذیب انسانی معاشرہ سے جنگ کو خارج کرنے کے قابل کبھی نہ ہو سکی۔ عیسائیت یا بدھ مت یا ہندوؤں کے ویدانتی قسم کے ادیان کو اپنے عقائد کی ایسی

تشریح کرنی پڑی جو حقیقت کے موافق ہو سکیں۔ عیسائی اقوام نے دوسری انسانی جماعتوں سے زیادہ خود آپس میں اور غیر عیسائیوں کے مقابلہ میں جنگ و جدال کیا ہے، اور مذہبی عقوبت اور تعصب کے لحاظ سے کوئی مذہب عیسائیت کا ریکارڈ توڑ نہیں سکتا۔ یہ تنگ نظری اور بد نہادی کی انتہا ہے کہ عیسائی مصنفین اسلام کے خلاف اس تہمت کی مسلسل اشاعت کر رہے ہیں کہ یہ ایک مذہب شمشیر ہے اور مسلمانوں کے متشدد غول اور جتھے باقی دنیا کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے قرآن در بغل اور شمشیر بکف چھوڑ دیے گئے ہیں۔ اس قسم کا الزام یا تو تاریخ سے لاعلمی یا بغض و عناد کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔ اسلام کے عروج و ترقی کی تاریخ اپنے بچاؤ کے لئے اسکی جدو جہد اور عام انسانی حقوق اور تہذیبوں کا تحفظ، ان سب کی غلط تشریح اس نوعیت سے کی گئی ہے کہ اسلام اپنے مخصوص عقائد کی نشر و اشاعت کے لئے قوت کا استعمال کرتا رہا ہے۔ ابتدا میں اسلام نے معاهدات امن کی ان قبائل کو پیشکش کی جو اسلام کو برضا و رغبت قبول کرنا نہیں چاہتے تھے۔ قرآن عہد ناموں اور صلحناموں کی پابندی پر شدت سے زور دیتا ہے۔ لیکن جب عرب قبائل نے بار بار عہد ناموں کی خلاف ورزی کی اور اسلام کے عین دور عنفوان میں اس کو تباہ کرنے کے لئے باهمی اتحاد قائم کرنے کی کوششیں کیں تو اسلام کے سامنے صرف دو ہی صورتیں رہ گئیں تھیں، یا تو انھیں کچل دے یا خود کچلا جائے۔ جو لوگ اسلام میں برضا و رغبت داخل ہوتے تھے وہ ایک ایسی برادری میں شرکت کرتے تھے جو بلا لحاظ نسل و قومیت ہر شہری کو کامل حریت، اخوت، اور مساوات عطا کرتی

تھی - ادنیٰ سے ادنیٰ تر کے بھی ویسے ھی حقوق تھے جو اعلیٰ سے اعلیٰ تر کو حاصل تھے - بعض لوگوں نے اسلام کو ایک مذھب نہیں بلکہ ایک اجتماعی سیاسی تحریک سمجھا ھے - اگر ایسا ھو بھی تو کوئی تاریخ کے طالب علم سے یہ پوچھ سکتا ھے کہ وہ نوع انسانی کے سارے اخبار و آثار کو کھنگال کر کسی ایسی تحریک کا پتہ چلائے جس نے عمرانی اور طبقاتی امتیازات کو بالکلیہ برخاست کر دیا ھو ، اور جو دوسری اقوام کو غلامی کا نہیں بلکہ کامل مساوات کا تحفہ دیتی ھو - حضرت بلال رض حبشی نژاد تھے لیکن ان کی عزت و توقیر صنادید قریش سے زیادہ کی جاتی تھی ، اس کا سبب انُ کی سیرۃ اور جان نثاریاں تھیں - کوئی شخص یہ کہہ سکتا ھے کہ یہ اھل ایمان کی تو بے شک ایک برادری تھی - لیکن ان کے متعلق کیا طرز عمل تھا جو دائرۂ اسلام سے باھر تھے - اس کا جواب یہ ھے کہ اسلام ان کے مذھب اور طریق زندگی کی کامل حفاظت کرتا تھا - وھی قانون کی حکومت ان پر بھی سایہ گستر تھی - بلکہ ایک طرح پر تو وہ خود مسلمانوں سے بھی زیادہ بہتر حیثیت رکھتے تھے کہ ان فرائض کے بغیر جو مسلمانوں پر عائد تھے ، حکومت کی پوری سر پرستیاں انہیں حاصل تھیں - ایک ھلکے ٹیکس کے عوض حکومت پر ان کے جان و مال اور عزت کی حفاظت کی ذمہ داریاں عاید تھیں - مسلمانوں کو اپنی زائد دولت پر ایک گرانبار محصول ادا کرنا پڑتا تھا ، لیکن غیر مسلم اس سے مستثنیٰ تھے - جو ھلکا ٹیکس غیر مسلموں پر عائد تھا اس سے بھی نادار ، بے روزگار ، بوڑھے ، معذور ، عورت اور بچے مستثنیٰ تھے اور جب کبھی کوئی غیر مسلم اس بات کو ثابت کر دیتا کہ وہ اس محصول کی استطاعت نہیں رکھتا تو

اس معمولی محصول سے بھی وہ بری کر دیا جاتا تھا ۔ اسلام کو ایک مذہبی استعماریت سے متہم کیا گیا ہے، لیکن تاریخ کے کسی دور میں بھی کیا استعماریت کا کوئی ایسا نمونہ ہے جس نے حکمرانوں کو محکوموں سے زیادہ بار اٹھانے پر مجبور کیا ہو ؟ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ایسے واقعات گذرے ہیں جہاں غیر مسلم قبائل نے اپنی حفاظت کے لئے ٹیکس ادا کیا تھا اور مسلمانوں نے جب اپنے آپ کو دشمنوں سے ان کی حفاظت کرنے سے قاصر پایا تو یہ رقم انہیں واپس کر دی ۔ یہ ٹیکس جسے جزیہ کہا جاتا ہے، غلطی سے ایک ایسا امتیازی محصول سمجھا گیا ہے جو مملکت کے باشندگان کے درمیان ایک غیر منصفانہ فرق و امتیاز قائم کرتا تھا ۔ یہ الزام پھر وہی اسلام کے نظام سیاست سے نا واقفیت پر مبنی ہے ۔ اگر اس نے کسی قسم کا فرق و امتیاز کیا ہے تو وہ خود مسلمان محافظین کے خلاف ہے، جو زیادہ محصول ادا کرنے پر مجبور تھے اور جو مملکت کے لئے لڑنے کی خدمت بھی اپنے ذمہ رکھتے تھے ۔ غیر مسلموں کے لئے کوئی لازمی فوجی خدمت نہ تھی ۔ ایسے غیر مسلم جو فوجی خدمت انجام دیتے تھے وہ جزیہ سے مستثنیٰ تھے ۔

جب قرآن کسی راست بازانہ جنگ کی ضرورت کی تعلیم دیتا ہے تو خود اسلام سے قبل دیگر مذاہب کے تحفظ کا اظہار کرتا ہے ۔ جنگ کا جائز سبب محض ملت اسلام کی حفاظت ہی نہیں بلکہ زمین پر امن قائم کرنا اس کا پہلا اور اولین فرض ہے ۔ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوت ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ط (الحج ـ ۴۰) ”اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا رہتا تو کسی قوم کی

عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی - خانقا ہیں ، گرجے ، عبادت گاہیں ، مسجدیں ، جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، سب کبھی کے ڈھائے جاچکے ہوتے -،، جس ترتیب کے ساتھ عبادت گاہوں کی حفاظت کا ذکر کیا گیا ہے وہ قابل لحاظ ہے ، اور اسلام کا مقتضاء اور اس کے فلسفۂ جنگ کا اندازہ کرنے میں بڑی وقعت رکھتا ہے - مسجد کا ذکر پہلے نہیں سب سے آخر میں ہوا ہے - جب کبھی وحشیوں کے غول یا مذہبی متشددین دیگر قوموں پرتاخت کریں تو تمام مذہبی آزادی کے شیدائی لڑنے کے لئے تیار ہو جائیں تاکہ عبادت اور ضمیر کی آزادی کا حق ، جس سے کئی دیگر شہری حقوق پیدا ہوتے ہیں ، محفوظ و مصؤن رہیں - اسلام میں کسی قوم کی عبادت گاہ کی بے حرمتی کرنے یا اس کو ڈھانے کی سخت ممانعت ہے ، اور یہ تاکید ہے کہ کسی مذہب کے پیشوا قتل یا کسی طریقہ سے بھی پریشان نہ کئے جائیں - اگر کسی مسلمان حملہ آور نے اس حکم کی خلاف ورزی کی ہے تو اس قصور کو اسلام کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا - کسی قوم کی کوتاہیاں ، جو مذہب کا زبانی اقرار کرتی ہو ، اس کے مذہب کو مورد الزام قرار نہیں دے سکتیں - انکی کمزوریاں ان کے عدم ایمان کا ثمرہ ہوتی ہیں نہ کہ ان کے ایمان کا براہ راست نتیجہ - کئی مقامات پر قرآن نوع انسانی کے لئے امن قائم کرنے کی غرض سے جنگ کی ضرورت کا حکم دیتا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی وقت ظلم و ناانصافی کی قوتیں کسی جگہ اپنا سر اٹھائیں اور امن عالم کے لئے خطرہ بن جائیں تو یہ فرض ہوجاتا ہے کہ اس جارحانہ کارروائی کے خلاف

لڑا جائے۔ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض ولکن اللہ ذو فضل علی العلمین ط (البقرہ-۲۵۲) ''اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعہ دوسرے گروہ کو راہ سے ہٹاتا رہتا تو دنیا خراب ہو جاتی لیکن اللہ دنیا کے لئے فضل و رحمت رکھنے والا ھے۔'' شروع سے آخر تک جو نبرد آزمائیاں انسان کے دور تاریخ میں ہوتی رھی ھیں ان کی ابتداء مختلف محرکات سے ہوئی ھے۔ قبائل میں باھمدگر جنگ و پیکار معاشی فائدوں، یا جذبات غضب و انتقام کی بر انگیختگی، یا فاضل توانائی کے مصرف کے لئے کسی راہ کی تلاش، یا بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ اور ذرائع معشیت میں عدم توازن کے سبب ہوا کرتی تھی۔ لیکن ابتداء ھی سے معاشی فوائد، یا جسے اشتمالی معاشیات پیدائش و تقسیم دولت سے تعبیر کرتی ھے، کبھی انسانی آویزشوں کے تنہا محرکات نہیں رھے۔ کسی قبیلہ کے رکن کی اھانت، یا قتل، یا اس کے معبود کی توھین کسی جنگ یا خانہ جنگی کے آغاز کے لئے کافی تھی، جو ایک پوری صدی تک جاری رھتی تھی۔ اسلام سے قبل عرب کی قبائلی تاریخ ان مثالوں سے بھری پڑی ھے۔ اس کے بعد ھم وحشی جرگوں کی تاخت و تاراج دیکھتے ھیں، جنہیں ان متمدن باشندوں کے فوائد فتوح سے ترغیب و تحریص ہوتی تھی، جو شہری زندگی کی آسائشوں، یا اخلاقی تنزل، یا معاشری تظلم کے سبب ناکارہ ہوچکے تھے۔ مذھبی تعصب اور تشدد کے باعث بھی ہولناک اور ھلاکت آفریں جنگیں لڑی گئیں، جن کی نہایت شرمناک مثال صلیبی لڑائیاں ھیں، جنہوں نے پورے یورپ کو تہ و بالا کر دیا۔ اور مسلمان علاقوں سے زیادہ، جنہیں وہ کچلنا اور مطیع کرنا

چاہتے تھے ، ان علاقوں میں بد نظمی و انتشار پیدا کیا جہاں یہ پہنچے اور جہاں سے یہ گذرے ۔ پھر ہم شاہی خانوادوں کے لامتناہی محاربات توسیع سلطنت یا اپنے خاندانی سلسلہ کے تحفظ کے لئے دیکھتے ہیں ، جس میں پوری قوم سیاسی اقتدار کی بازی میں داؤ پر لگا دی جاتی تھی اور نشۂ اقتدار سے چور چند حکمرانوں کی ہوس کشورکشائی کے باعث لاکھوں انسان تباہ اور لاتعداد گھرانے برباد ہوجاتے تھے ۔

صنعتی سرمایہ داری کے عروج کے بعد سے تاریخ میں جنگ کے نئے محرکات داخل ہوئے ۔ کمزور قومیں جو اپنے آپ کو صنعتی لحاظ سے منظم نہیں کر سکی تھیں اور جو پیدائش دولت اور زیادہ تباہ کن طاقتور آلات کے ایجاد و اختراع میں پیچھے رہ گئی تھیں ، وہ ارزاں اشیائے خام کی فراہمی اور سامان مصنوعہ کی فروخت کے لئے محکوم بنالی گئیں ۔ صنعتی مغرب نے اپنے نفع کی خاطر تمام دنیا کو غلام بنانے کا منصوبہ باندھا ۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو نسلی ، لسانی ، اور علاقائی قومیت کو ابھارا اور جذبۂ وطنیت کو سرمایہ داری کے مفاد کے لئے کام میں لایا گیا ۔ صنعتی سرمایہ داری اور قومیت نے خود اپنے نظام میں اپنی تباہی کے اجزاء فراہم کئے ۔ اور اب ہم ایک ایسی انسانیت پاتے ہیں جو معاشی تصورات کی اساس پر بٹ چکی ہے ، جو مدافعانہ اور جارحانہ اقدام کے لئے اخلاقی اور مذہبی جذبات کی تائید حاصل کر رہی ہے اور جس کے سبب دنیا ایک اور عالم آشوب خوں ریزی کے کنارہ آ لگی ہے ۔

اگر مذہب کا تعلق زندگی اور انسانی اقدار کے تحفظ و پرداخت سے ہے تو ہمیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اسلام اس صورت حال میں کیا رہنمائی کرتا ہے ۔ ہم اس سے قبل اسلام

کے فلسفۂ جنگ کا ایک ھلکا سا خاکہ پیش کر چکے ھیں۔ اسلام جنگ کی اجازت دیتا ھے اور بطور فرض کے معاشری نظام قائم کرنے اور بدامنی کے ماخذوں کو ختم کر دینے کا حکم دیتا ھے ۔ اسلام طبقات و جماعات کا قائل نہیں جس سے انسانیت متخالف گروھوں میں منقسم ھو جاتی ھے ، نہ وہ اس قومیت کی حمایت کرتا ھے جس کو مغرب نے ترقی دی ھے ۔ جماعتوں اور قوموں کا وجود ھے ، اور وہ باقی رھیں گی ۔ قرآن لسان و الوان کی بوقلمونی کو خدا کی رحمتوں میں سے سمجھتا ھے ، لیکن انسانیت اصلاً ایک ھے ۔ ''اے افراد نسل انسانی! تم ایک وجود سے پیدا کئے گئے ھو اور تمہارا خدا صرف ایک ھے''* ۔ ''ان ابتدائی اصول پر جمع ھو جاؤ ، جو تمام انسانیت میں مشترک ھیں''† ۔ اس لئے اسلام نسلیت اور قومیت کے خلاف صف آراء ھوتا ھے ، کوئی جنگ جس کی بناء قومی تفوق و برتری ھوگی وہ سند جواز حاصل نہ کرسکے گی ۔

بعض لوگ یہ خیال کرتے ھیں کہ اسلام نے صرف دفاعی جنگوں کی اجازت دی ھے ۔ اگر اس کا یہ مطلب ھے کہ تم اس وقت تک انتظار کرو جبتک کہ واقعتاً تم پر حملہ نہ کیا جائے ، تو یہ اسلامی حقیقی اصولوں کی غلط تعبیر ھے ۔ قرآن کہتا ھے کہ جنگ انسان کے اصلی حقوق کی مدافعت میں اختیار کی جائے۔ ''لڑو ! یہانتک کہ ظلم و زیادتی کا خاتمہ ھو جائے اور مذھبی آزادی کا قیام عمل میں آجائے''‡ ۔ اگر تم یہ دیکھ رھے ھو کہ دشمن تمہیں تباہ کرنے کے لئے تیاریوں میں

* یایھاالناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ
† تعالوا الی کلمتہ سواء بیننا و بینکم
‡ وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ — بقرہ ۔ ۱۹۴

مصروف ہے تو قبل اس کے کہ وہ تمہارے لئے قوی ثابت ہو، اسے کچل دینا چاہئے۔ اسلام اپنے متبعین کو حکم دیتا ہے کہ وہ اعدائے انسانیت کے خلاف قوت آزمائی کیلئے کمربستہ رہیں۔ مگر تمام کوششیں اس امر پر مبذول ہونی چاہئیں کہ مختلف قوموں میں باہم امن و امان برقرار رہے۔ جنگ اس وقت تک ناگزیر ہے جبتک کہ انسانیت متحارب گروہوں میں منقسم اور ایک دوسرے کو دبوچنے کے لئے تیار ہے۔ اس صورت حال میں ہر وقت یورش کا احتمال رہیگا۔

اتحاد اقوام کے اصول کو بھی قرآن نے پیش کیا ہے۔ تمام قوموں کو پر امن طریقہ پر مثل اعضائے جسم کے زندگی بسر کرنی چاہئے۔ ہر شخص کو اپنے طریقہ پر زندگی گزارنے کا موقع ملنا چاہئے اور کوئی قوم خواہ اخلاقی اور ذہنی حیثیت سے کتنی ہی فوقیت رکھتی ہو اس کو یہ اختیار نہیں کہ اپنا طریق زندگی دوسری قوم پر بجبر عائد کرے۔ دنیائے قدیم میں مذہب تمام زندگی پر حاوی تھا اور جب قرآن اس اصول کا اعلان کرتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں کوئی جبر نہونا چاہئے تو یہ اس مسلک کے مرادف ہے کہ افراد اور اقوام اپنے طریق پر چلنے کے لئے آزاد چھوڑ دئے جائیں، بشرطیکہ وہ کسی اجتماعی انتشار اور اذیت رسانی کا موجب نہ بنیں۔ یہ تمام انسانی جماعتوں کے لئے ایک منشور آزادی ہے جو شاہ جان کے منشور اعظم سے زیادہ جامع یا منشور اوقیانوس، جس پر سامراجیوں تک نے دستخط کی ہے، سے زیادہ وسیع اور حاوی ہے۔ اسلام کی رو سے ہر متمدن قوم کو، بطور صلح و امن کے اصول کے، یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ جہاں کہیں بے بس اور

کمزور پر ظلم و زیادتی ہو ، مخلص اور راستباز جماعتیں ظالم کو کچلنے کے لئے کھڑی ہو جائیں۔ اسلام میں خدا کی راہ میں لڑنے کا مطلب حق و انصاف کے لئے لڑنا ہے۔ اس کا مطلب کسی مذہبی عقیدہ کی تبلیغ و اشاعت کے لئے لڑنا نہیں ہے۔ بے شمار مقامات پر قرآن کہتا ہے کہ تمہیں ظلم اور حقوق کی پامالی کے خلاف لڑنا چاہئے اور یہ مقابلہ اس وقت تک جاری رہنا چاہئے جبتک کہ ظلم و زیادتی موقوف نہو جائے اور لوگ اپنی پسند کے مطابق اعتقاد رکھنے اور عمل کرنے میں آزاد نہو جائیں۔ و ما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ و المستضعفین من الرجال و النساء و الولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلہاج و اجعل لنا من لدنک ولیاج و اجعل لنا من الدنک نصیراً ٥ (النساء-٧٥)

"اور (مسلمانو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے؟ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو (ظالموں کے ظلم و تشدد سے عاجز آکر) فریاد کر رہے ہیں "کہ خدایا ! ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ لی ہے ، نجات دلا۔ اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے ، اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مددگاری کے لئے کھڑا کردے"۔ اس آیت سے اس امر کی صاف وضاحت ہوتی ہے کہ خدا کی راہ میں لڑنے کا کیا مطلب ہے۔ یہ کسی دینیاتی رمز یا کسی مابعد الطبیعی عقیدہ کے لئے جنگ آزمائی نہیں ہے۔ انسانی اعمال کا مقصود اصلی رضائے الٰہی ہے اور اللہ معاشری عدل کا حکم دیتا ہے۔ اسلام صرف باہمی عدل و اعتدال کے لئے لڑنے کا حکم دیتا ہے ، کسی دوسرے مقصد کے لئے جنگ کرنا غیر اسلامی متصور ہوگا۔

باب دوازدھم

اسلامی مملکت کے اساسی تصورات

بہت سے فلسفیانہ اور مذھبی مثالیت پسندوں نے ایک مثالی مملکت کی تشکیل پر بحث کی ھے اور کہیں کہیں بعض عملی تخیل پرستوں نے کم و بیش کامیابی کے ساتھ اسکو حقیقت کا جامہ پہنانے کی بھی کوشش کی ھے - خیالی دنیا کی سیر ھمیشہ ایک خوشگوار ذھنی ورزش رھی ھے - افلاطون سے لیکر ایچ - جی ولز تک ھم ایسے مثالی خاکوں کے تسلسل سے گزرتے ھیں جن میں فرد و جماعت کے لئے حق و انصاف کے حصول اور زیادہ سے زیادہ ھمہ جہتی تہذیبی ترقی کے لئے فرصت و مواقع فراھم کئے گئے ھیں - ان کوششوں میں سب سے زیادہ اھم یونان کی شہری مملکت تھی جس کا مکمل خاکہ سقراط اور افلاطون کا ترتیب دادہ تھا - لیکن خود انہیں بھی اس میں شک تھا کہ آیا یہ قابل عمل بھی ھوگا یا نہیں - اور جیسا کہ آخر میں سقراط نے اقرار کیا اس مملکت کا نمونہ تو صرف آسمانوں میں ھی رھا اور تمام تصورات اور نصب العینوں کی مانند عملی دنیا میں صرف ناقص طور پر ھی اس کی نقل کی جا سکتی ھے - اگرچہ کہ افلاطون نے اس خصوص میں بحث کی ھے کہ یہ ممکنات سے ھے اور محض وھم و گمان نہیں - چنانچہ اس نے اپنی ''جمہوریت'' میں کہا ھے کہ ''ھم ناممکن چیزوں کے متعلق گفتگو نہیں کرتے، تاھم اس کا اقرار کرتے ھیں کہ یہ چیزیں دشوار ھیں مگر یہ

محض خواب و خیال نہیں ھیں۔ اگر سلطان فلسفی ہوتے یا فلسفی سلطان ہوتے تو یہ واقعیت کا رنگ اختیار کرلیتیں''۔ مگر ممکن العمل ہونے کا یہ خیال افلاطون کے رنگ طبیعت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، کیونکہ وہ دوسری جگہ کہتا ہے کہ ''ہمارے شہر کی بنیاد الفاظ پر ہے، کیونکہ میرا خیال ہے زمین پر اس کا کہیں وجود نہیں''۔ دوسری جگہ کہتا ہے کہ ''اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ آیا اس کا وجود ہے یا کبھی اس کا وجود بھی ہوگا''۔

جب افلاطون سلطان فلاسفہ یا فلسفی سلاطین کو دیکھنے کی خواہش کرتا ہے تو اس کے ان دو لفظوں کے مفہوم کو جیسا کہ اس نے اپنے مکالمات میں پیش کیا ہے، اگر پوری طرح ذہن نشین نہ کیا جائے تو اس کے سمجھنے میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔ مختلف تہذیبوں نے اپنے مثالی انسان کے لئے مختلف الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ہندو انہیں اوتار یا رشی کہتے ہیں، رواقئین انہیں حکماء سے موسوم کرتے ہیں، اسرائیلی انہیں انبیاء کا لقب دیتے ہیں اور اہل یونان خاصکر سقراط و افلاطون انہیں فلاسفہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ افلاطون کے انسان کامل میں تمام تہذیبی اقدار کاملاً متشکل ہیں۔ یہ محض منطقی قیاسی اور خیال پرست نہیں ہے بلکہ اپنے نصب العین کو حقیقت کا رنگ دینے والا ہے، جس کو وہ صاف طور پر دیکھتا ہے اور اسکو شخصی زندگی اور اجتماعی تنظیم میں رو بہ عمل لے آتا ہے۔ اس لئے جب افلاطون سلاطین کے متعلق گفتکو کرتا ہے تو اس کا مطلب مطلق العنان حکمرانوں سے نہیں ہوتا، جو قوت کو اپنے شخصی حوصلوں کی تکمیل میں استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ یہ اعتدال پسند حکمران ہیں جو اپنے آزادانہ اختیار

کے ساتھ انصاف کے نصب العین کو حاصل کرتے ہیں ۔ یہ لوگ اعلیٰ ذہانت کے انسان ، میدان عمل کے شہسوار اور بے داغ کردار کے حامل ہوتے ہیں ۔

یہ بات اب تاریخی حقیقت کا درجہ حاصل کر چکی ہے کہ بجز پیغمبر اسلامؐ کے دنیا کے زبردست روحانی رہنماؤں میں سے کسی نے بھی ایک مثالی مملکت کے حصول کی کوشش نہیں کی ۔ آپ ہی وہ فلسفی سلطان تھے جس کا خواب افلاطون نے دیکھا تھا ۔ آپ انصاف کا بلند معیار رکھنے والے انسان تھے اور ساتھ ہی ایسے کردار اور اقتدار کے حامل تھے کہ ان معیاروں کو رو بہ عمل لاسکیں اور اپنی زندگی ہی میں ان کی ممکنہ تکمیل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں ، نیز ان چیزوں کو اپنے جانشینوں اور آنے والے زمانوں کے لئے چھوڑ دیں تاکہ وہ ان کو رفتہ رفتہ حالات کے تقاضوں کے ساتھ آگے بڑھائیں ۔ افلاطون نے صرف ایسی شہری مملکت کا خواب دیکھا جس کی تین چوتھائی آبادی ایسے غلاموں پر مشتمل تھی جنہیں واقعتاً کوئی شہری حقوق حاصل نہیں تھے ۔ اس نے یونان کی دیگر شہری مملکتوں کو کسی نہ کسی طرح متحد کرنے کا ذہنی نقشہ تو قائم کیا تھا ، لیکن باقی تمام دنیا اس کے نزدیک جاہل و وحشی تھی اور کسی فکر و تردد کے قابل نہ تھی اور اس کے لئے یہی مناسب تھا کہ اسکو اپنے وحشیانہ طریقوں پر چھوڑ دیا جائے۔ یعنی غیر یونانی دنیا اس کی تصوریت میں شامل نہیں تھی ۔

آنحضرتؐ اور افلاطون کی مثالی مملکت میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ آنحضرتؐ ایک عملی ، معیار پسند تھے ۔ جہانتک

انسان کی عملی زندگی کا تعلق ہے ۔ آپ ناقابل حصول مطمحائے نظر کے قائل نہ تھے ۔ آپ کے نزدیک تصوری اور ممکن العمل دونوں ایک نقطہ کی طرف مائل تھے ۔ آپ کا خیال تھا کہ انسانیت کے رو برو ایسے نصب العینوں کو پیش کرنا لاحاصل ہے جن کو کہ وہ اپنی فطرت اور کوتاہیوں کے سبب واقعی زندگی میں تشکیل دینے کے ناقابل تھی ۔ آپ اس تعلیم پر یقین رکھتے تھے کہ خدا انسانوں پر انکی استعداد سے زیادہ ذمہ داری عائد نہیں کرتا ، اور وہ انسان کے ایسے فطری تقاضوں سے واقف ہے جن سے کسی صورت میں مفر نہیں*۔ دوسرا بڑا فرق آنحضرتؐ اور افلاطون میں یہ تھا کہ آنحضرتؐ کے پیش نظر پوری انسانیت بحیثیت ایک عضویت کے تھی ، جس میں ایک ذات واحد بصورت کثرت جلوہ گر تھی ۔ قرآن پوری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے نہ کہ صرف کسی ایک شہر کے باشندوں کو ۔ آنحضرتؐ مکہ اور مدینہ کی شہری مملکتوں کے کامیاب قیام پر مطمئن نہیں تھے ، اور نہ آپ اس پر مطمئن ہوگئے کہ جزیرہ نمائے عرب آپ کے زیر فرمان آچکا تھا ۔ چنانچہ آپ نے جوں ہی اپنے وطن میں خود کو محفوظ پایا تو اطراف کی سلطنتوں کے حکمرانوں کے نام دعوت نامے جاری فرمائے ، جن میں اپنی اطاعت یا عرب کے اقتدار کو تسلیم کرنے کا مطالبہ نہ تھا ، بلکہ اس نصب العین کو ماننے کی دعوت دی گئی تھی جو مختلف نسلوں اور مذہبوں کو باہم متحد کرتا تھا ۔ وہ نصب العین تمام حقیقتوں کی وحدت تھی جسے خدا کہا جاتا ہے اور جو عام ہمدردی اور انصاف کے اعلیٰ ترین نصب العینوں کو اپنی ذات میں مجتمع رکھتا تھا ۔ یہ دعوت سب کے لئے ایک نصب العین کی پرستش کے لئے تھی تاکہ مذاہب اور اقوام کے اختلافات

* لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا

سے قطع نظر کر کے باھمی حق و انصاف پر عمل پیرا ھو سکیں۔ یہ اس دعوت کے مماثل تھی جو عیسائیوں اور یہودیوں کو دی گئی تھی کہ وہ ایسی چیز پر متحد ھو جائیں جو ان کے درمیان مشترک اساس ھو سکتی تھی ، اور جو اس کے سوا کچھ اور نہ تھی کہ ایک خدا کی پرستش کو حقیقت کا رنگ دیا جائے جس سے تمام باھمی حق و انصاف بطور ضمنی نتائج کے پیدا ھوتے ھیں۔ اسلام نیکی کو تمام انسانیت کا مشترک ورثہ تصور کرتا ھے اور قرآن نیکی کے لئے معروف کا لفظ استعمال کرتا ھے ، جس کے معنی ایسے اوصاف کے ھیں جو عام شہرت رکھتے ھوں۔ قرآن کی تعلیم ھے کہ تمام انسانیت بھلائی کی آرزو مند ھے ، لیکن اس کے متعلق مبہم اور بعض اوقات غلط تصورات رکھتی ھے۔

اسلام کے نزدیک روحانیت دو پہلو رکھتی ھے۔ ایک طرف تو یہ انسان کا اپنے معبود سے ایک شخصی ربط و تعلق ھے ، لیکن دوسری طرف انسانیت اور معاشرہ کے ساتھ یہ اجتماعی حقوق اور فرائض کو بھی ظاھر کرتی ھے۔ وہ انسان کامل طور پر روحانی نہیں ھوگا جو معاشرہ سے علیحدگی اختیار کر کے صرف اپنی شخصی نجات کا متلاشی رھتا ھے۔ اجتماعی رشتے اس کی شخصیت کے تار و پود ھوتے ھیں۔ مذھب کے معنی کسی مٹھ یا غار میں بیٹھ کر مالا جپنا یا دھونی رمانا نہیں ھیں۔ بلکہ یہ ایسی باعمل معاشری زندگی کا نام ھے جو نصب العین کی مطابقت میں بسر کی جاتی ھے۔ اسی لئے اسلام ترک دنیا اور متصوفانہ توکل کو بے اعتبار ٹھہراتا ھے۔ اس کی فرض نمازیں تمام کی تمام اولاً جماعتی عبادات ھیں۔ اگرچہ کہ عبادت

گزار کو یہ ترغیب بھی دی گئی ہے کہ وہ بعض اوقات ، خصوصاً رات کی خاموشی میں، عزلت میں بھی خدا کی عبادت کرے۔ لیکن یہ روح کا استحکام و استغراق بھی زندگی کے عملی کاروبار میں نیک اعمال کی صورت میں ظاہر ہونا چاہئے ۔

اسلام شاذ و نادر ہی فرد کے ساتھ بحیثیت فرد کے بحث کرتا ہے ۔ وہ ہمیشہ اس کو ایک خاندان یا قوم کے رکن کی حیثیت سے دیکھتا ہے جو جائز محنت سے اپنی روزی حاصل کرتا ہے ۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ ''الکاسب حبیب اللہ ۔'' محنت مزدوری کرنے والا اللہ کا دوست ہوتا ہے ۔ حالیہ اشتراکیت اور اشتمالیت کے حامی برسر عام محنت کی عزت و توقیر اور اس اصول کا اعلان کر رہے ہیں کہ جو کوئی محنت نہ کرے وہ روٹی نہ کھائے ۔ لیکن آنحضرتؐ نے خود مزدوروں کی طرح کام کر کے محنت کی عظمت و شان جریدۂ عالم پر تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ قبل ثبت فرمادی ۔ یہ آپ ہی تو ہیں کہ جن کا ارشاد ہے کہ پسینہ سوکھنے سے قبل مزدور کو اس کی اجرت حوالہ کردو ، اور وہ شخص جو زمین کو کاشت کرتا ہے وہی زمین پر بہتر حق رکھتا ہے* ۔ آپ نے مزدوروں ، کسانوں اور گلہ بانوں کی مملکت کی داغ بیل ڈالی ، لیکن اس میں متدین تاجروں اور طالبان علم کو بھی محنت کرنے والوں میں شامل فرمایا ۔ جس چیز کی آپ نے حوصلہ افزائی نہیں فرمائی وہ طفیلیت اور بغیر کمائی ہوئی آمدنی پر گزر بسر کرنا تھا ۔ آپ دنیا میں پہلے اشتراکیت پسند معاشی ہیں جنہوں نے سرمایہ پر محصول عائد کیا اور

* ومن احی ارضا مخصی لہ (مرسل)

کلانیت کے قانون کو برخاست فرما دیا ، جس کی رو سے مولود اکبر پوری جائیداد کا بلا شریک و سہیم وارث ہوتا تھا اور اس کے چھوٹے بھائی ، بہن اور دیگر رشتہ دار محروم رہتے تھے -

اسلام کو ایک ایسی دینی حکومت کے قیام کا الزام دیا جاتا ہے جو سیاسیات ، قانون سازی اور معاشیات میں دخل در معقولات کرتی تھی - چونکہ حضرت عیسیٰ[ؑ] نے تہذیب کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ، اور امور مملکت میں دخل اندازی کے آپ خلاف تھے ، اس لئے یہ خیال کیا جا . لگا کہ ایک باخدا انسان کو سیاسیات اور معاشیات سے کوئی واسطہ نہونا چاھئے- چنانچہ یہی کافی سمجھا جاتا تھا کہ وہ اخلاقی طور پر پاک رہے ، اور بنی نوع انسان کے ساتھ خیر خواھی اور محبت کی تعلیم دیا کرے - بدھ مت جیسے ایک بڑے مذھب کے بانی کو ھم انسان کی حقیقی زندگی سے زیادہ مابعد الطبیعیات کی جانب متوجہ پاتے ھیں - گوتم بدھ نے تمام مشہودات اور موجودات کو بے اصل ثابت کرنے کی کوشش کی تھی -پوری زندگی کو ایک شر گردانا تھا ، جو زندہ رہنے کی خواھش کی آفریدہ تھی ، اور اسی لئے انسان کا مقصد عظیم خواھش کو کاملاً فنا کر کے تمام شخصی اور اجتماعی وجود سے چھٹکارا پانا قرار دیا - ظاھر ھے کہ ایک ایسے معلم کو معاشرہ کی اصلاح اور از سرنو تعمیر یا حقیقی یا مثالی مملکت کی سیاسیات سے کچھ واسطہ نہیں ھوسکتا - اسلام کے منظر عام پر آنے سے قبل مذھب کا مفہوم صرف عالم آخرت کے معاملات سے تھا - قدیم عیسائی یہ یقین رکھتے تھے کہ دنیا کا خاتمہ نہایت قریب ھے ، اور کوئی چیز سوائے انابت و عبادت کے ایسے موقع پر کار آمد نہیں ھو

سکتی ۔ مملکت میں برائیوں کی بابت ان کا یہ خیال تھا کہ ان کا انسداد ان کے فرائض میں نہیں ہے ۔ ان کا اعتقاد تھا کہ "خطبۂ جبل" (Sermon on the Mount) ظلم کو بھی بے چون و چرا قبول کرنے کی تعلیم دیتا ہے ۔ "اگر تمہارے ایک گال پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کو پیش کر دو ۔ اور اگر کوئی تمہارا کرتا چرا لے تو کوٹ بھی اس کی نذر کر دو" ۔ جس مملکت میں وہ رہتے تھے اسکے قوانین کی اطاعت کے بارے میں انہیں حضرت عیسیٰؑ کے اس حکم کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی کہ "قیصر کی چیزیں قیصر کے حوالہ کرو" ۔ عقیدۂ رحم و شفقت کو جس کی حضرت عیسیٰؑ نے تبلیغ کی تھی ، خاموشی کے ساتھ شر کو برداشت کرنے کی تعلیم بنا دیا گیا تھا ۔ وہ فطرت انسانی کی اس بنیادی حقیقت کو بھول چکے تھے کہ بلا تعرض شر کو برداشت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ خود شر کا ارتکاب کرنا ۔ اور غلامانہ طور پر ظلم برداشت کرنےوالے ہی ظالموں کی پرورش کرتے ہیں ۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ "اگر کوئی آدمی برائی کو دیکھے تو اس کو عملاً دور کرنے کی کوشش کرے ، اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو الفاظ کے ذریعہ اس کے خلاف احتجاج کرے ، اگر وہ یہ بھی نہیں کر سکتا تو دل میں اس سے نفرت کرے ، جو ایمان کی کمزور ترین صورت ہے"۔* آپ افلاطون اور ارسطو سے اس امر میں متفق تھے کہ ایک منصف مزاج آدمی منصفانہ طریقہ پر صرف ایک عادل مملکت میں ہی رہ سکتا ہے ۔ اس لئے

* من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذالک اضعف الایمان —مسلم

ایک عادل مملکت کا قیام معاشری عدل اور فرد کی خوشحال زندگی کے لئے نا گزیر شرط ہے ۔ حضرت عیسیٰ[ع] کے اس قول میں بڑی صداقت تھی کہ آسمانی سلطنت خود تمہارے باطن میں ہے ، کیونکہ کوئی عدل پسند سلطنت ان غیر عادل آدمیوں سے نہیں بنائی جا سکتی جو پہلے اپنے نفوس میں ایک آسمانی سلطنت کی تخلیق خود اپنی زندگیوں میں اس نصب العین کو بروئے کار لا کر نہ کر چکے ہوں ۔ لیکن اسلام کہتا ہے کہ یہ کافی نہیں ہے ۔ باطن کی آسمانی سلطنت کو خارج کی آسمانی سلطنت میں متشکل کرنا چاہئے تاکہ انسان کی منظم زندگی محبت ، اخوت اور انصاف پر مبنی ہو سکے ۔ اگر خدا کے نیک بندے انسان کی معاشری اور سیاسی زندگی کو اپنے حال پر تنہا چھوڑ دیں تو معاشی اور معاشری خرابیوں کے سبب نیک افراد کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ جائیگی ۔ چنانچہ آنحضرت[ص] کا ارشاد ہے کہ ” اگر معاشرہ میں چند آدمی برائی کرتے ہوں اور دوسرے ان کو روکنے کے لئے کچھ نہ کرتے ہوں ، تو نیک اور بد سب کے سب تباہی میں گھر جائینگے کیونکہ نیکوکار محض خاموش تماشائی بنے رہے اور برائی کو روکنے کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا “۔

اس لئے اسلام محض خدا پر ایمان لانا ، اپنی روح کی حفاظت کے لئے اس کی عبادت کرنا ، اور دنیا کی آلودگیوں سے پرہیز کرنا ہی نہیں ہے ۔ بلکہ اس کا اولین مقصد زندگی کے تمام ضروری پہلوؤں پر عملاً اور کاملاً نظر رکھ کر موجودہ زندگی کو بہتر بنانا ہے ۔ موجودہ زندگی کو کل کائنات کی ابتداء و انتہاء فرض کرتے ہوئے کوئی بڑا مذہب بالکل غیر دنیاوی نہیں رہ سکتا ۔ اس کا دنیاوی زندگی سے تعلق ہونا لازمی ہے ۔

اسلام نے دونوں عالموں کا امتزاج کیا ہے اور ما بعد زندگی کا تعین یہاں کی زندگی کی حالت سے ہوتا ہے۔ ''جو یہاں بے بصر ہے وہ آخرت میں بھی بے بصر رہیگا''*۔ جب آخرت کی زندگی میں نیکوکار بہشت کے ثمرات کا مزہ چکھینگے تو کہینگے، ''وہ اپنی سابقہ زندگی میں ان سے ملتی جلتی چیزوں سے لذت شناس ہو چکے ہیں''۔† جو زندگی یہاں بسر کی جاتی ہے اس کی بناء عالم گیر محبت و انصاف پر ہونی چاہئے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے، ''خدا کی رحمت ہرچیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے''‡۔ اہل ایمان سے کہا گیا ہے کہ وہ دعا مانگا کریں کہ ''خدایا! ہمیں یہاں کی زندگی کی خوشحالی اور آخرت کی زندگی کی خوشحالی عطا فرما''§۔ ہمیں اس دعا میں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ اس دنیا کو ترجیح و تقدم زمانی حاصل ہے، اگرچہ کہ یہ قدر کے لحاظ سے نہیں ہے۔ اور یہ زندگی ایسے اسباب پر مشتمل ہے جس کے نتائج آخرت کی زندگی میں دیکھے جائینگے، اگرچہ کہ یہ ضروری نہیں کہ تمام نتائج آخرت کی زندگی ہی کے لئے اٹھا رکھے جائیں۔

چنانچہ اسلام کے نزدیک انسان ایک معاشری اور سیاسی وجود ہے اور اس کی فلاح و بہبود معاشرہ کی فلاح و بہبود سے وابستہ ہے۔ معاشرہ کی اعلیٰ ترین تنظیم مملکت ہے۔ اسلام کو ایک مملکت قائم کرنی تھی اور عملی شکل میں مملکت کے اعلیٰ نمونے دنیا کے سامنے پیش کرنے تھے۔ آخر کار انسان نے فلسفی سلطان کے تصور سے نجات پائی۔ یہ معاملہ انسانی معاشرہ کی دوبارہ تشکیل اور تفصیلی تحقیق کے لئے نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے کیا نصب العین تھے اور زندگی میں کس طریقہ سے انہیں نظام سیاست کی تخلیق میں بروئے کار لایا جائے۔

* من کان فی ہذہ اعمی......الخ
† ......اتوبہ متشابہا......الخ
‡ ورحمتی وسعت کل شئی
§ ربنا آتنا فی الدنیا......الخ

یہ مسئلہ کہ مذہب کس طرح زندگی میں تخلیقی تحریک پیدا کرتا ، اسکو ترقی دیتا ، اور سنوارتا ہے ، قدرتاً اس سوال سے مربوط ہو جاتا ہے کہ زندگی کو معاشرہ کی اعلیٰ ترین تنظیم سے ، جسے مملکت سے تعبیر کیا جاتا ہے ، کس طرح تعلق رکھنا چاہئے - جب ہم حقیقی تفصیل اور واقعات کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہیں تو غیر مرئی سلطنت کے تصورات ، جن کا مقام الوھیت یا افلاطون کی مثالی مملکت یا ہمارے باطن کی آسمانی سلطنت ہوتا ہے ، ہماری تسکین خاطر نہیں کرسکتے- ہر واقعی مملکت کسی نصب العین کی صورت پذیری کرتی ہے ، جس کو وہ ممکن العمل سمجھتی ہے - اور اس کی تمام سیاسی اور تہذیبی ساخت اور اس کے آئین کی نوعیت اسی پر منحصر ہوتی ہے - مملکت کے شہریوں اور مابقی انسانیت کی زندگی کے لئے یہ معاملہ نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ اس نصب العین کی تعریف و تعیین کی جائے ، جو اس کی زندگی میں تخلیقی تحریک پیدا کرتا اورخوشحالی کے تصور کوعملی صورت دیتا ہے اور جس کو کہ وہ حاصل کرنا چاہتی ہے - اسلامی حکومت کو اکثر مذہبی حکومت کہا جاتا ہے - اگر ہم دینی مملکت کو خالص دنیوی مملکت سے متمائز کرنے کے لئے اس کے مفہوم کی صاف طور پر تعریف کریں تو اس سے ہمیں ان امور کی توضیح میں بڑی مدد ملے گی - مذہبی حکومت وہ ہے جو اپنے تحدیدی اختیار کو کئی خداؤں یا ایک خدا یا ان مذہبی اصول سے حاصل کرتی ہے جو بطور انضباطی قوتوں کے عمل کرتے ہیں - تمام قدیم ملتیں مرئی اور غیر مرئی عناصر رکھتی تھیں - ایک قبیلہ کا مرئی اور غیر مرئی حکمران ہوتا تھا - قبیلہ کے رسم و رواج کو غیر مرئی قوتوں کی تدریس و توثیق حاصل تھی اور ان ھی کے ذریعہ

قبیلہ باہم مرتبط رہتا تھا۔ رسم و رواج کا یہ میلان ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی قوت فراہم کریں، اور ان مذہبی معتقدات کے بعد جنہوں نے ان کی توثیق کی تھی لیکن بعد میں خود کمزور اور متزلزل ہو گئے، اپنی قوت کو جمود کے ذریعہ جاری رکھیں۔ قبائلی استحکام کا، کسی غیر مرئی بنیاد پر قوی عقیدہ سے زیادہ، طریقہ ہائے زندگی اور رسوم و روایات پر انحصار ہوتا ہے۔ ایسے فرقے جب تنظیم کے کسی درجہ تک ترقی کرتے ہیں تو پیشوایان مذہبی کے طبقہ کو وجود بخشتے ہیں۔ مذہبی پیشوا قبیلہ اور غیر مرئی حکمران کے مابین وسیلہ ہوتا تھا، اور ہر ترقی یافتہ قبیلہ اپنے مذہبی پیشوا رکھتا تھا۔ قدیم تہذیبوں میں مذہب و سلطنت، یا مذہبی اور غیر مذہبی قانون کے درمیان ہنوز کوئی تفریق نہیں تھی۔ قدیم قبیلہ میں فرد کی ہستی ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ کوئی شخص رائے اور عمل کے مرکز کی حیثیت سے ہنوز کوئی وجود نہ رکھتا تھا۔ کوئی شخصیت بجز قبائلی شخصیت کے نہ تھی اور قبیلہ کا نفع و ضرر اجتماعی صورت رکھتا تھا۔ اس کو مذہبی اشتمالیت کہا جا سکتا ہے۔ یہ قدیم اشتمالیت تھی جس سے انسانی معاشرہ کا آغاز ہوا۔ خدایان باطل یا غیر مرئی قوتیں قبائلی رسم و رواج کے محافظ و نگران تھیں۔ سردار قبیلہ اپنے نام پر حکومت نہیں کرتا تھا بلکہ قبیلہ کی شخصیت کے نام پر جسے فوق البشر حیثیت میں الوہیت کا درجہ دیا گیا تھا۔

زیادہ ترقی یافتہ تہذیبوں میں مذہب و سلطنت کا تعلق مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا۔ قدیم ہندو سلطنت اور ہندو تہذیب دینی حکومت تھی۔ رسم پرستانہ مذہب جس قدر عسیر الفہم الٰہیات، علم کائنات اور مسائل معاد سے پیچیدہ

ہوتا گیا ، پیشوایان مذہب کی جماعت ابھرتی گئی ، جو یہ سمجھتی تھی کہ اسے غیر مرئی قوتوں پر تصرف حاصل ہے۔ زندگی کا ہر فعل مذہبی عمل تھا ، جس کی توثیق برھمنی پیشوائیت سے ضروری تھی۔ برھمن قانون و رواج کے محافظ اور قانون ساز تھے۔ حکمران اپنا اختیار ان سے حاصل کرتے تھے اور تخت پر بیٹھنے سے پہلے انہیں ان کے آگے زمین بوس ہونا پڑتا تھا۔ ہر اہم موقع پر دنیوی حکمران کو برھمن کی پوجاپاٹ کرنی پڑتی تھی۔ تمام سیاسی فیصلوں میں اس کی آواز سب سے زیادہ وزن رکھتی تھی۔ وہ آئین و ضوابط جو تمام اخلاقیت اور تمام رسوم کا انضباط کرتے تھے ، شاستر تھے ، جن میں اخلاقیات ، الٰہیات اور قانون کے درمیان ہنوز کوئی تفریق نہ کی گئی تھی۔ منوکا دھرم شاستر تمام ہندو تقلید پرستی کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ نکاح ، وراثت ، تجارت نسب ، ضوابط ، اور غذائیات غرض یہ کہ زندگی کا ہر پہلو مذہبی آئین و ضوابط سے گھرا ہوا تھا ۔ جبتک کہ ہندو سوسائٹی کی قلب ماہیت حد شناخت سے باہر نہو جائے اس میں از سرتاپا دینی حکومت رہیگی۔ برھمنیت کسی دوسرے بڑے مذہب سے زیادہ طویل عمر رکھتی ہے۔ وہ اپنے حق و اقتدار پر جملہ یورشوں کی مقاومت کرتی رہی ہے۔ کپلنگ نے مشرق کی بابت یہ کہا تھا کہ یہ ہر انقلاب اور فتح کے جھونکے کے آگے ایک بردبارانہ گہری حقارت کے ساتھ سرنگوں ہو جاتا ہے اور اس کے گذر جانے کے بعد پھر اپنے خیالات میں مستغرق ہوجاتا ہے۔ یہ معتقدات کے کسی مقررہ نظام پر زیادہ مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے کا نتیجہ نہیں بلکہ مذہبی توثیق شدہ روایات کی قوت ہے ، جو ایسی

چٹان کی مانند سمندر میں رہتی ہے جس کے خلاف امڈتا
ہوا طوفان اپنے غم و غصہ کو جھاگ کی صورت میں اس کے
قدموں پر ڈال دیتا ہے - بحیثیت کسی مخصوص مذہب یا نظام
معتقدات کے ، جس کو اس کے پیروؤں کی اکثریت مانتی ہو ،
ہندو مذہب کی تعریف کرنا ناممکن ہے - فلسفیانہ وحدت
وجود یا توحید پرستی سے لے کر انتہا درجہ رکیک اصنام پرستی،
فطرت پرستی ، علامت پرستی ، یا اشیاء پرستی تک یہ تمام
چیزیں ان کے مذہب میں داخل ہیں - ہندؤں میں کسی
مشترک عقیدہ کو تلاش کرنا گویا گھاس کے انبار میں
سوئی کو ڈھونڈنا ہے ، اور یہ جستجو ایسی ہی لا حاصل
ہوگی - کسی کلبی نے فلسفیوں کی بابت کہا ہے کہ یہ مثل
نابینا انسانوں کے ہیں جو اندھیرے میں گربۂ سیاہ کو ٹٹول
رہے ہیں ، جس کا کہیں وجود نہیں - اور یہی حال ہندؤں
میں مشترک عقیدہ کا ہے - اگرچہ ہندؤں میں پاکیزہ روحانیت
کے کچھ اعلیٰ نمونے مل سکتے ہیں ، مگر دوسری طرف ان میں
ایسے فرقے بھی موجود ہیں جو غلامت پرستی پر عمل کرنے اور
انسان کو بھینٹ چڑھانے تک کے قائل ہیں - ہندو مذہب بحیثیت
روحانی اور اخلاقی اصول کے ، جسے اس کے بڑے بڑے رشیوں
اور منیوں نے ترقی دی تھی ، کبھی کامیابی کے ساتھ ادنیٰ
اور وحشیانہ طریقوں کو رد نہ کر سکا - اس کا سبب کچھ تو
یہ تھا کہ برھمنوں نے کرما اور ذات پات کے نظریوں کو
ترقی دی تھی جو ذات سے خارج اشخاص کے لئے کسی قسم
کی ذمہ داری قبول نہ کرتے تھے - اور اس طرح یہ ادنیٰ درجہ
کے انسان مصائب و آلام میں زندگی بسر کرتے تھے - کیونکہ
یہ اسی کے مستوجب سمجھے جاتے تھے - ان کو روحانی طور

پر ابھارنے کی کوئی کوشش مہاپاپ سمجھی جاتی تھی اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جاتیوں کے علحدہ رکھنے کے خدائی منصوبہ میں یہ ایک طرح کی دخل اندازی ہے ۔ ہندو پیشوائیت میں ایک اور امتیازی چیز ہے جس کی مثال دوسری تہذیبوں میں ملنی مشکل ہے ۔ جہاں تک عالم غیب کے معتقدات کا تعلق ہے یہ تمام مذہبی پیشوائیت میں سب سے زیادہ بے تعصب اور وسیع المشرب ہے ۔ نہ صرف پیشوایان مذہبی بلکہ عام طور پر ہندو سوسائٹی معتقدات کے معاملہ میں غیر جانب دار ہے ۔ تم جس چیز پر چاہو ایمان لا سکتے ہو ، یا چاہو تو کسی چیز پر بھی ایمان نہ لاؤ ۔ ایک منکر خدا ایسا ہی بہتر ہندو ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک ویدانتی اہل باطن ، یا ٹیگور یا گاندھی جیسا ایک خدا پرست ۔ حال ہی میں رسوم و روایات اور ہندو اتحاد کے غیر معین اعتقاد کو تقویت قومی جذبہ سے ہوئی ہے ، جو مغرب سے تصادم کا نتیجہ ہے اور جس سے ہندو سوسائٹی باہم مربوط ہوگئی ہے ، ورنہ اس میں کوئی اندرونی یا عضوی وحدت نہیں ہے ۔

گاندھی کی قیادت نے ہندو فرقوں میں جوش وقوت پیدا کر دی مگر ابتک پوری طرح یہ ہم آہنگ نہوسکے ۔ یہ توحید پرست اور مذہبی آدمی تھا ۔ اس نے ہندو معتقدات کے انبار سے ، مثل رام موہن رائے کے ، وحدانیت کو چن لیا تھا جو ہندو مت کی انتہائی ترقی یافتہ صورت کو پیش کرتی تھی ۔ اس نے ذات پات کے طریقوں میں ظلم و زیادتی کو کم کرنے کی بھی کوشش کی ، اگرچہ انتہا پسند مصلحین اس معاملہ میں اس سے بھی زیادہ تشدد چاہتے تھے ، اور اس خرابی کو جڑ سے اکھاڑنے کیلئے

راست حملہ کے خواہشمند تھے - لیکن مذہبی اور معاشری حیثیت سے گاندھی انقلابی نہ تھا - اور اس پر راسخ اعتقاد رکھتا تھا کہ مملکت اس طرح دنیوی نہ ہونی چاہئے کہ وہ خدا کو بالکل چھوڑ دے اوران روایات و تجربات سے بے اعتنائی برتے جو اولیاء اور انبیاء کے توسط سے صدیوں میں حاصل ہوئے ہیں، خواہ وہ ہندو مت سے حاصل ہوئے ہوں یا دیگر بڑے مذاہب سے - یہ کوئی توہم پرستانہ اعتقاد نہ رکھتا تھا، اور اس کا محکم یقین تھا کہ انسانیت صرف عدم تشدد کے عقیدہ پر ایمان لانے سے محفوظ رہ سکتی ہے - ہندوستان اس کی مدبرانہ نظر اور قوت عمل کے ذریعہ آزادی سے دو چار ہوا - یہ ایک غیر مذہبی حکومت کا اس مفہوم میں خواہاں تھا کہ کوئی مخصوص مذہب دیگر مذاہب کے پیرؤں پر اپنے تصورات اور طریق زندگی کو عائد نہ کرسکے - مگر جس مملکت کا خاکہ اس نے اپنے ذہن میں قائم کیا تھا وہ اس کو رام راج یعنی حکومت الٰہیہ کہتا تھا جو ایک حیثیت سے مذہبی اساس رکھتی تھی - لیکن اس کا رام راج ایسا کوئی مذہبی آئین نہ رکھتا تھا جس پر کہ وہ چل سکے اور نہ کوئی ایسا مذہب تھا جو مملکت پر فرماں روائی کر سکے - اس نے کئی ایسے متناقض تصورات رکھنے والے جتھے چھوڑے ہیں جو اسے بحیثیت ایک گرو کے مانتے ہیں - لیکن یہ فرقے اسی کے نام پر شدت کے ساتھ باہم دگر دست و گریباں ہیں - اس کے ساتھ وہی ہوا جو بالعموم ایسے قائدین خیال و عمل کے ساتھ ہوتا ہے جو زندگی پر من حیث الکل بحث کرتے ہیں، اور جن کے عقائد و اظہارات عمل سے علحدہ ہوکر مبالغہ آمیز تشریح کے ساتھ منحرف بلکہ معاندانہ فرقوں کی صورت

اختیار کر لیتے ھیں - نہرو جس کے کندھوں پر اس کی ردائے سیاسی ڈالی گئی ھے کوئی مذھبی آدمی نہیں ھے - اوراس بات کی تکرار و اعادہ سے کبھی نہیں تھکتا کہ مملکت بالِکلیہ غیر مذھبی ھو اور کسی مذھب سے اس کا کوئی واسطہ نہ ھونا چاھئے - لیکن راجگوپالاچاریہ ، جو گاندھی کے نہایت عقلمند اور مخلص چیلوں میں سے ھے ، یہ کہتا ھے کہ مملکت کا پس منظر اور اساس مذھب کو ھونا چاھئے کیونکہ بغیر مذھب کے معاشرہ اور مملکت میں عدم موافقت کی صورت پیدا ھو جائیگی - یہ چیز اسلامی نقطۂ خیال سے مطابقت رکھتی ھے کہ جہاں مدبرانہ نظر قاصر رھتی ھے قومیں تباہ ھو جاتی ھیں اور ''صحیح ترین بصیرت خدا کی بصیرت ھوتی ھے -'' ھندوستان غیر مذھبی حکومت کا دعویدار ھے اور پاکستان کو مذھبی اساس اختیار کرنے پر مطعون کرتا ھے ، لیکن حقیقی معنوں میں ھندوستان پاکستان سے کہیں زیادہ مذھبی مملکت ھے - کیا کوئی ایسی مملکت حقیقتاً دنیوی کہلائی جا سکتی ھے جس کے باشندوں کی زندگی پر مذھبی روایات ، رسومات اور تعصبات کی حکمرانی ھو - رسم پرستی ھندؤں کی معاشری زندگی میں یہودیوں سے بھی کہیں زیادہ رچی ھوئی ھے - مذھبی روایات انہیں پیدائش سے قبل ھی اپنی آغوش میں لے لیتی ھیں - ان کی پیدائش مذھبی رنگ کی ھوتی ھے اور ان کی اجتماعی حیثیت کا تعین کرما اور ذات پات کے قاعدوں سے ھوتا ھے - ان کا کھانا پینا ، حجامت بنانا ، نہانا ، شادی بیاہ کرنا اور مرنا سب مذھبی ھوتا ھے اور جیسا کہ کسی نے کہا ھے کہ ان کا پاپ بھی دھرم ھی سے ھوتا ھے - نہرو کہتا ھے کہ ھندوستان کی تہذیب کا غالب رنگ اور امتیازی نشان ھندو ھوگا اور

ہندو تہذیب خالصاً مذہبی ہے۔ تمام مملکتوں کی تعمیر ان کے جمہور کی نفسیات پر ہوتی ہے۔ آئین و دستور جمہور کی نفسیات سے علحدہ ہو کر، جن کے لئے وہ بنائے جاتے ہیں، ایک نقلی وجود رکھتے ہیں جو زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہ سکتے۔ گائے کا احترام، جس میں بہت سے ہندو باہم متحد ہیں، تعزیری قانون کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس میں ایسی گائیں بھی شامل ہیں جن کو باقی رکھنا انتہائی غیر کفایت شعارانہ ہے اور ایسے غریب کسان پر یہ ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے جو خود کو اور اپنے خاندان کو فاقہ کشی سے بچانے کے لئے ہولناک کشمکش میں مبتلا ہے۔ ایک ایسے معاشرہ سے جو سختی کے ساتھ مذہبی روایات، رسومات اور تعصبات میں جکڑا ہوا ہو یہ توقع کس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ مساویانہ شرائط پر بھائی چارہ قائم کر سکیگا جو اس کی ان مقدس چیزوں کو نہیں مانتا۔ سلطنت کا دستور اگر محض نصائح کہال کا مجموعہ نہ ہو تو اسکو ذہنی طور سے آزاد مصلحین کی تحریروں سے مستفید اور مملکت کے باشندوں کی نفسیات سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ قابل عمل دستور و آئین کو قوم کی زندگی اور اس کے خیال، احساس اور عمل کے گہری خصلتوں سے ابھرنا چاہئے۔

موضوع سے اس انحراف کے بعد ہم کو دینی اور دنیوی مملکتوں کی زیادہ واضح الفاظ میں تعریف کی طرف رجوع ہونا چاہئے، تاکہ ہم اپنے اصل موضوع اسلام اور اس کی امتیازی نوعیت کی دینی حکومت کی طرف متوجہ ہوسکیں۔ حکومت الٰہیہ وہ حکومت ہے جس کی ظاہر و پوشیدہ اساس

مذہبی ہو ۔ دینی حکومتیں مخصوص ما بعدالطبیعیاتی معتقدات کی حامل ہوتی ہیں ۔ یہ معتقدات یا تو ضابطہ کی صورت اختیار کرتے ہیں یا ان کی تشکیل قدیم رسم و رواج یا روایات میں ہوتی ہے ۔ دنیوی مملکت وہ ہے جس میں یا تو تمام رعایا کی فلاح و بہبود یا مخصوص طبقوں کی خوشحالی مدنظر ہوتی ہے ۔ یہ اپنے قوانین یا تہدیدات کسی فوق العقل الہامی ذریعہ سے حاصل نہیں کرتی ، بلکہ وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق قانون سازی میں آزاد ہوتی ہے ۔ اگر یہ مملکتیں ترقی یافتہ ہوں تو وہ چند بنیادی حقوق و فرائض کسی خدا یا خداؤں یا الہامی ذریعہ کے حوالہ کے بغیر اپنے باشندں کے لئے معین کرتی ہیں ۔ ایسی مملکتیں اپنے باشندوں کے درمیان نسل یا مذہبی معتقدات کی بناء پر فرق و امتیاز نہیں کرتیں ۔ چونکہ دنیوی حکومت مذہب سے لاپرواہ ہوتی ہے اس لئے وہاں مذہبی آزادی زیادہ ہوتی ہے اور مملکت کی خدمت یا تمام حقوق یا رعایتوں کے لئے مذہب کسی شہری کے حق میں موجب نفع و ضرر نہیں ہوتا ۔ یہ دنیوی مملکت کے دعووں کے نمایاں خط و خال ہیں ۔

جس طرح ایک دینی حکومت مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہے اسی طرح ایک دنیوی حکومت بھی کر سکتی ہے ۔ محض دنیویت کسی مخصوص نظریہ پرستی کی ضامن نہیں ۔ موجودہ زمانہ کی زیادہ تر حکومتیں عملی اعتبار سے دنیوی ہیں ، لیکن ان کے خوشحالی کے تصورات اور طریق کار میں نمایاں فرق ہوتا ہے ۔ کسی مملکت کا جمہوری یا دنیوی کہلانا ترقی یافتہ اور مثالی ہونے کی علامت بن گیا ہے ۔ ایسی مملکت جو تمام باشندوں میں مقبولیت حاصل کرنا چاہتی ہو وہ صریحاً مذہب کو اپنی

اساس نہیں بنا سکتی۔ اگرچہ انگلستان اور ممالک متحدہ کے بڑے مدبرین کبھی کبھی اپنے اہل ملک پریہ اثرڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور باقی دنیا پر بھی یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی تہذیب عیسائی تہذیب ہے اور ان کا مقصد زندگی کے ہر پہلو میں عیسائی تصورات کو روبہ عمل لانا ہے، لیکن یہ عیسائی تصورات کی تفصیلی تعریف کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ اس سے شدید بحث و مباحثہ کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ دیگر نعروں کی طرح اس کی قدر بھی غیر معین ہونے میں مضمر ہے۔ عام تخیلی اور مبہم اصول پر اتفاق آسان ہوتا ہے۔ دشواریاں تو اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کوئی ایسی عام صداقت کے ٹھوس مضمرات کو جو پیش پا افتادہ اور فرسودہ بن چکی ہو، استدلال اور اخلاص سے پیش کرنا چاہتا ہے۔ متعدد مخالف نظامات ایک ہی اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں۔ اور تقریباً سب کے سب خود کو جمہوری اور لا دینی کہتے ہیں۔ جمہوریت مبہم ترین تصور بن چکا ہے۔ ہٹلر کی نازیت جمہوریت کی دعویدار تھی اور اکابر نازی دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ ہٹلر کا انتخاب آزادانہ جمہوری طریقہ پر رائے شماری کے ذریعہ بحیثیت قائد قوم ہوا ہے، اور وہ قوم کی آواز و ارادہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہودیوں سے بدسلوکی اسی جمہوریت کا مظاہرہ تھی، کیونکہ یہ مشتعل اکثریت کا ارادہ تھا جس نے اپنا فیصلہ ایک قومیت دشمن اقلیت کے خلاف صادر کیا تھا۔ فاشستی بھی اس بات کے دعویدار تھے کہ انہوں نے ایک خاص نمونہ کی جمہوریت ایجاد کی ہے، جو اینگلو امریکی قسم سے مافوق ہے۔ مسولینی کے قول کے مطابق یہ اینگلو امریکن جمہوریت محفوظ اور مرفہ الحال

قوموں کی عیش پسندی ہے اور غیر مامون و نادار قومیں اس کی نقل نہیں کر سکتیں - روسی اشتمالیت موجودہ نظامات میں سب سے زیادہ جمہوری ہونے کی دعویدار ہے - یہ اینگلو امریکی جمہوریت کو دولت مندوں کی حکومت کہتی ہے، جہاں بلا واسطہ یا بالواسطہ سرمایہ حکمران اور محنت پامال ہے - برطانوی اور امریکی روسی اشتمالیت کو ہمہ گیریت (Totalitarianism) سے تعبیر کرتے ہیں - جہاں ریاستی سرمایہ داری کا عضویت اور یک جماعتی تسلط فرد کو اپنے بنیادی حقوق سے محروم رکھتا ہے - اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لادینیت اور جمہوریت مختلف صورتیں اختیار کرسکتی ہیں - ہیگل اور فشتے جیسے جرمن فلاسفہ نے مملکت کی پرستش اور جرمن قوم کے عالمی مشن کا ڈھنڈورا پیٹا - یہ لادینیت تھی جو تصوریت کے روپ میں پیش کی گئی تھی - نیٹشے کی طرح کے مفکرین اور اس کے بعد ٹرائشکے (Treitske) نے بطور بنیادی سیاسی قدر کے قوت و طاقت کی تبلیغ کی - ہٹلر نے نسلیت کو قائم کرنے کے لئے تمام دینی اور مذہبی نظامات فکر کو ختم کرنے کی کوشش کی، مگر پھر بھی خدا کو بحیثیت آریائی نسل کے کائناتی کفیل کے باقی رکھنا چاہا، جو اس کے نزدیک برگزیدہ قوم تھی- اور یہ اسی یہودی تصور کی مختلف پیرایہ میں تعبیر تھی جس کا وہ استیصال کرنا چاہتا تھا - اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ لادینیت انتہا درجہ تغیر پذیر تصور ہے اور یہ کئی شکلیں اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے - یہ تصور سرمایہ داری، نسلیت، پرولتاریت، اشتراکیت، یا اشتمالیت، یا وسیع مذہب انسانیت کا عقیدہ ہو سکتا ہے، جو اصلاً تمام انسانی حقوق کا تحفظ کرتا اور جو اعتدال پسند قومیت کو انسان دوست بین الاقوامیت کا لازمی

جزو سمجھتا ہے ۔ جبتک کہ ہم ان کے پورے مضمرات اور عملی اطلاقات کو نہ سمجھیں محض نعروں سے ہمیں کوئی روشنی حاصل نہیں ہو سکتی ۔

اب ہم اپنے اصل مسئلہ اسلام اور مملکت کے باہمی تعلق پر بحث کریں گے ۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اسلام اپنے آپ کو روحانیت یا اخلاقیت یا بحیثیت علیحدہ وجود کے فرد کی نجات تک محدود نہیں رکھتا ۔ اس میں شک نہیں کہ ایک فرد کی خودی کو بڑی اہمیت حاصل ہے ، لیکن وہ معاشرہ میں زندہ رہتی ، حرکت کرتی اور اپنا وجود رکھتی ہے ۔ یہ معاشرہ ہی ہے جو خود آگاہی کی تخلیق کرتا اور اسے پروان چڑھاتا ہے ۔ تمام اخلاقیت ایک معاشری نسبت رکھتی ہے ۔ اسلام ہمیشہ معاشرہ کے اندر انسان سے بحث کرتا ہے ۔ اس کے نزدیک صرف معاشری عدل ہی برتر اشیاء کی طرف بڑھنے کا زینہ ہوتا ہے ۔ اسلام نے کسی فرد کو محض ہمسایہ سے محبت کی تعلیم دے کر ہی نہیں چھوڑ دیا ۔ اعلیٰ اخلاق کی تعلیم تو تمام بڑے مذاہب نے دی ہے ، مگر کسی مذہب نے اسلام سے قبل بالکل آغاز ہی سے یہ کوشش نہیں کی کہ ایک بہی خواہ مملکت کی صورت میں معاشرہ کی تنظیم کرے ۔ اسلام نے اپنے نظام فکر پر عملاً ایک مملکت کی بنا ڈالی اور اس کو ایک مثالی مملکت فلاح و خیر کی صورت دی ۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ افلاطون کا فلسفی ایک بادشاہ بن بیٹھا ۔ اس نے یہ تمثیل پیش کی تھی کہ کیسے اور کیوں ایک مملکت کا قیام ضروری ہے ۔ اگر عوام معاشری عدل کے تصورات سے مستفیض ہوں اور ٹھوس نتائج حاصل کرنا چاہیں تو انہیں منظم ہونا چاہئے ۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہیں خود

کو منظم کرنا پڑے گا۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں خلاف عقل جانب داریوں اور بے قید محرکات کا تسلط ہو اور جو افراد و جماعات کے مستقل مفادات سے گھری ہوئی ہو تو ایسی تخیل پرست جماعت کو خود اپنے وجود ہی کے لئے جنگ آزما ہونا پڑیگا۔ اسلام کے معنی صلح و امن کے ہیں، اور جنگ امن کی نقیض ہے۔ اسلام نے دنیا کو جنگ کا ایک معقول تصور عطا کیا ہے۔ جنگ ایک اجتناب کرنے کی چیز ہے، لیکن اگر جنگ ہی کسی بڑی برائی کو روک سکتی ہے تب وہ سب سے بڑا فرض بن جاتی ہے۔ جب امن قائم ہو جائے اور انسانی حقوق کا تحفظ ہو جائے تو فوراً تلوار نیام میں کر لینی چاہئے۔ اسلام دس سال سے زائد عرصہ تک وحشی ستم رانوں کا تختۂ مشق بنا رہا، جن کے ہاں انسانی زندگی اور اس کے اقدار کا کوئی احترام نہ تھا۔ جب وہ بے بسوں اور کمزوروں کی حفاظت اور ظالموں کو ظلم کے چھوڑنے پر مجبور کرنے کیلئے کافی قوت فراہم کر چکا تو اسنے اپنے متبعین کو اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا جبتک کہ امن قائم اور انسانی آزادی محفوظ نہو جائے۔ اگرچہ یہ ایک مذہبی تحریک تھی، مگر دین کی نشرو اشاعت کے لئے جنگ کی اجازت نہ تھی۔ قرآن نے اس اصول کا اعلان کیا کہ لا اکراہ فی الدین۔ ''دین میں جبر و استکراہ نہیں ہے''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں بعض اوقات ایسے غیر مسلم تھے جو ان حضرات کے گھروں پر خدمت گار تھے، لیکن انہیں اسلام قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا گیا۔

مسلم مملکت چند معین اصولوں پر قائم کی گئی تھی۔ چونکہ اسلامی مملکت کا قیام مذہبی اساس پر تھا، اس کو مذہبی حکومت کہنا حق بجانب ہے۔ لیکن محض یہ اصطلاح

کچھ مفید مطلب نہوگی جبتک کہ ہم نہایت تفصیل سے اس کی تعریف نہ کریں۔ مسلم مملکت نے جس کو آنحضرتؐ نے قائم فرمایا اور جسکو مزید ترقی آپ کے قریبی جانشینوں نے دی ، ہمیں چند اساسی اصول عطا کئے ہیں۔

(۱) دیگر پیروان مذہب کی طرح مسلمان بھی مذہبی آزادی سے مستفیض ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ اگر انہیں ستایا جائے اور وہ اپنی زندگی اور ناموس کی مدافعت کے لئے کافی قوت نہ رکھتے ہوں تو انہیں اپنے مذہب پر قائم رہ کر صبر کے ساتھ مصائب جھیلنا چاہئے۔

(۲) اگر ان کے صبر و تحمل کا جام لبریز ہو جائے، اور وہ مقاومت کے ناقابل ہوں تو انہیں دار ظلم سے ہجرت کرنی چاہئے ، انہیں کہیں اور پناہ دینے کے لئے خدا کی زمین کافی وسیع ہے۔ ان احکام کی رو سے سابقین اسلام کو حبشہ اور بعد ازاں مدینہ اور دیگر مقامات کو ہجرت کا حکم دیا گیا۔

(۳) وہ خود اپنے اور دوسروں کے لئے امن و امان کی ساز گار فضا پیدا کرنے کے لئے غیر مسلموں سے معاہدات قائم کرنے کی کوشش کریں۔

(۴) یہ ان عہد ناموں کی بھی پابندی کریں جو ہر لحاظ سے ان کے لئے اطمینان بخش نہوں۔ عہد نامہ کی یکطرفہ خلاف ورزی پر از معصیت ہے۔ اگر انہیں معاہدہ کرنے والی دوسری جماعت سے عہد شکنی کا یقین ہو جائے ، تو وہ عہد نامہ کو ختم کرنے کے لئے ایک مدت معین کرکے دوسرے فریق کو مطلع کریں۔

(۵) جب انہیں اپنی حفاظت کے لئے کافی قوت حاصل ہو جائے تو ان کو مناسب حدود سے تجاوز کئے بغیر زیادتی کرنے والوں کے خلاف قوت استعمال کرنے نیز ضروری حقوق تحفظ اور مخالف کے بالکلیہ مغلوب ہونے تک لڑنے کی اجازت ہے۔

(۶) اگر غیر مسلم مملکت کی پر امن اور وفادار رعایا بن جائیں تو انہیں مذہبی اعتقاد کی کامل آزادی عطا کی جائے۔ ایک قلیل اور واجبی ٹیکس کے عوض، جو وہ اپنی حفاظت کے لئے مملکت کو ادا کریں گے، قانون کی نظر میں ان کی مساوات کی ضمانت دی جائے۔ چنانچہ خلیفہ کے خلاف بھی ایک غیر مسلم عدالت میں رجوع ہو سکتا ہے، اور ابتدائی خلفاء کے دور میں واقعتاً ایسی صورتیں رونماء ہوئی تھیں۔ کسی مسلمان کو غیر مسلم کے خلاف امتیازی استحقاق کے دعوے کی اجازت نہوگی۔

(۷) مسلم مملکت ایک اشتراکی جمہوریت ہوگی۔ اسلام میں شاہیت کا کوئی مقام نہیں اور نہ موروثی جانشینی کو کسی قسم کی تائید حاصل ہے۔ یہ ایک مذہبی عمومیت ہوگی لیکن اس میں کوئی ملائیت یا کلیسائی نظام نہ ہوگا۔ یہ صرف اس مفہوم میں دینی حکومت ہوگی کہ یہ اپنا اقتدار خدا سے حاصل کرتی ہے۔ خدا عالم گیر اجتماعی عدل کی ایک علامت ہوگا۔

(۸) دستور کے بنیادی اصول تمام رعایا کو مساوی شہری حقوق کی ضمانت دیں گے۔ تمام غیر مسلم مذہبی فرقوں کو یہ حق رہیگا کہ وہ اپنے مقدمات کا تصفیہ اپنے شخصی قوانین کی

رو سے کریں بشرطیکہ ان سے ابتدائی حقوق انسانیت کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔

(۹) قانون کے تحت عورت اور مرد یکساں بنیادی حقوق سے مستفید ہوں گے۔ عورت کو اپنے نام پر املاک و جائیداد رکھنے کی اجازت ہوگی۔ نکاح ایک معاہدہ کی نوعیت رکھے گا جس میں کسی قسم کے بھی شرائط داخل کئے جا سکیں گے، بشرطیکہ وہ خلاف اخلاق اور خلاف آئین نہوں۔

(۱۰) قوم کی معاشیات کا انضباط اس طرح پر ہوگا کہ سرمایہ داری اور غیر کمائی ہوئی آمدنی پر زندگی بسر کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی جائیگی۔

(۱۱) قانون کلانیت، جس کی رو سے خلف اکبر تمام جائیداد کا وارث قرار پاتا ہے، برخاست کر دیا جائیگا۔

(۱۲) سرمایہ پر محصول وصول کرنا لازمی ہوگا تاکہ اس کی گردش موقوف نہو یا یہ جمع نہ ہوتا رہے۔ اس محصول کا اصل مقصد مصیبت زدوں کی امداد کرنا اور معاشرہ کو بتدریج ایک سطح پر لانا ہے۔ یہ محصول ان سے لیا جائے گا جو مالدار ہیں اور ان پر خرچ کیا جائیگا جو نادار ہیں۔

(۱۳) تمام باشندوں کی فلاح و بہبود مملکت کا اصل مقصد ہے۔ یہ محض انتظامی مملکت نہوگی، جس کے فرائض نظم و ضبط کے حاصل ہوتے ہی ختم ہو جائیں۔ اسلامی مملکت در اصل فلاح و بہبود عامہ کی حکومت ہے۔

(۱۴) کسی مسلم یا غیر مسلم باشندہ سے اس کی استطاعت سے زیادہ حاصل نہ کیا جائیگا۔ جو روزی کمانے کے ناقابل ہیں

وہ کوئی محصول ادا نہ کریں گے ، بلکہ دوسری طرف ان کی بیت المال سے مدد کی جائیگی ۔

(۱۵) تجارت کی آزادی ہوگی ، لیکن سٹہ بازی کی ممانعت۔ اور نفع بازی کے لئے اشیائے تجارت کا احتکار غیر آئینی سمجھا جائیگا ۔

(۱۶) مال و دولت کی معاشرہ میں ریل پیل ہوگی ۔ مشترک خاندانی نظام میں جائیداد کو غیر منقسم رکھنا خلاف قانون ہوگا ۔ صاحب املاک کے انتقال پر اس کی جائیداد قریبی رشتہ داروں میں تقسیم ہوگی تاکہ سرمایہ معاشرہ میں پھیلے اور اس کے فوائد سے زیادہ لوگ متمتع ہوں ۔

(۱۷) صدر جمہوریہ کے انتخاب کے لئے کوئی طریقہ مقرر نہیں کیا گیا ۔ فہرست اسماء میں سے صدر کے انتخاب کی سفارش کی جاسکتی ہے مگر قوم کی توثیق کے بغیر کسی جانشین کو نامزد کرنے کی اجازت نہیں ۔ آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کے طریق عمل سے یہ اصول مستنبط کئے گئے ہیں ۔ ہر شخص کو امیدوار بننے اور رائے دینے کا حق حاصل ہے ، بشرطیکہ وہ دماغی اور اخلاقی حالت کی صحت کے بنیادی شرائط پورے کرتا ہو ۔ ہر باشندۂ ملک صدر حکومت کے کسی فعل پر باز پرس کر سکتا ہے ، اور اس کا یہ فرض ہوگا کہ اپنے فعل کو حق بجانب ثابت کرے ۔

(۱۸) اسلام کی رو سے اقتدار اعلیٰ کسی بادشاہ یا جماعت کو حاصل نہیں اور نہ قوم کو اس کا حق پہنچتا ہے ۔ اقتدار اعلیٰ خدا کو حاصل ہے ، اور معاشری عدل کا استخراج

خدا کی صفات سے ہوتا ہے - یہ اقتدار اعلیٰ صاحبان اخلاق و صداقت کے تفویض ہوا ہے - مملکت کے بنیادی اصول کا حکم خدا نے دیا ہے اور قانون سازی کے بنیادی اصول بھی اسی کے عطا کردہ ہیں - حالات کی تبدیلیوں کے باعث، علماء کے اتفاق آراء سے جدید قانونی تاویلات کی اجازت ہے -

(۱۹) اسلامی مملکت مقررہ قاعدوں کی متابعت کریگی - یہ نظام ظاہر و آشکارا ہے، سر بمہر اور سربستہ نہیں - مسلمان وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے قانون سازی میں آزاد ہیں، لیکن کوئی قانون اساسی دستور کو توڑ نہیں سکتا - وہی اشخاص قانون و ضوابط کی تدوین کے مجاز ہیں جو اسلام کی روح اور معاشری عدل کے اصول کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں - مملکت میں علماء قوانین کی تشریح اور نظر ثانی کو جاری رکھیں گے اور جاہل عوام کی رائے سے متاثر نہوں گے، جو محض بے شعور اکثریت ہوتے ہیں -

(۲۰) بین الاقوامی صلح و امن کے لئے تمام مساعی کی جائیں گی - قرآن صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ اگر دو جماعتوں میں سخت تنازعہ پیدا ہو جائے تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ درمیان میں پڑ کر صلح و صفائی کی پوری کوشش کرے - اگر ان ساری کوششوں کے بعد بھی کوئی جماعت ظلم و زیادتی یا اختلاف پر اڑی رہے تو مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ مظلوم کی حمایت کریں اور اپنی متحدہ قوت سے ظالم کو مغلوب کریں - مجلس اقوام اور اس کے بعد اقوام متحدہ نے صرف نظری طور پر اور ہچکچاتے ہوئے ان اصولوں کو ذہنی تحفظات کے ساتھ اختیار

کیا ہے ۔ اگر بین الاقوامی اخلاقیت ان اصولوں کو یقین واثق کے ساتھ اختیار کرے اور ان کو رو بہ عمل لانے کے ذریعے اور طریقے معلوم کرے تو ظلم و زیادتی کا فوری قلع قمع ہو سکتا ہے اور اگر وہ سر اٹھائے تو اسکو مؤثر طریقہ پر کچلا جا سکتا ہے ۔

(۲۱) ظالم حکومت کے خلاف بھی اہل ملک کی کسی جماعت کو اسلام مسلح بغاوت کا حق عطا نہیں کرتا ۔ یہ اصول تمام ممالک کی انقلابی جماعتوں کو ناخوشگوار معلوم ہوگا ۔ لیکن اسلام بحیثیت ایک عالمگیر مذہب ہونے کے ، جو کسی اور چیز سے زیادہ امن و امان کا قدر دان ہے ، بے جا تشدد کی ممانعت کرتا ہے ۔ اگر ایک مظلوم جماعت ستائی گئی ہے ، یا اس کے خلاف امتیاز برتا گیا ہے ، تو وہ تشدد اور مسلح بغاوت کے سوا ، خرابیوں کی اصلاح کے لئے دوسرے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کرسکتی ہے ۔ شروع میں تمام با امن اور آئینی طریقے روبہ عمل لائے جائیں اور اگر اس پر بھی وہ جماعت ابتدائی حقوق انسانیت کے حصول میں ناکام رہے تو اس کو اس ظالم علاقہ سے نکل کر کہیں اور پناہ ڈھونڈنی چاہئے ۔ ایک منظم حکومت کے خلاف بغاوت خانہ جنگی کا موجب ہوگی اور یہ اصلاحی کوشش اس برائی سے زیادہ بدتر ثابت ہوگی ۔ ظالم حکومت کی قلمرو سے نکلنے کے بعد انہیں اپنے آپ کو طاقتور اور منظم بنانا چاہئے ۔ اور ان ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے حق پسند مملکتوں سے اعانت طلب کرنی چاہئے ۔ مملکت میں رعایا کی حیثیت سے رہنے کی صورت میں اسلام صرف آئینی طریقے اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے ۔ بے بس اقلیتوں

کی طرف سے مسلح بغاوت سلطنت کے رہے سہے نظم و ضوابط کو درہم برہم کر دیتی ہے ، اور ایسے اشخاص کے ظالمانہ اور مجرمانہ میلانات کو بے لگام چھوڑ دیتی ہے جو اس ابتری سے ذاتی نفع حاصل کرتے اور تہذیب سوزی اور غارتگری کے موجب ہوتے ہیں - ظالم علاقوں سے ہجرت اور زیادہ پر امن علاقوں میں توطن کی مثال خود آنحضرت‌ؐ نے قائم فرمائی ہے جو مسلمانوں کے لئے ہر زمانہ میں ایک اسوۂ حیات بن گیا ہے - لیکن جب مسلمان ایک طاقتور سلطنت کی صورت میں خود کو منظم کر لیں تو مظلوم کی حمایت ان کا فرض ہوجاتا ہے ، خواہ وہ کوئی ہو یا کہیں بھی ہو - نیکی کی حفاظت اور برائی کا خاتمہ کرنا ، جو ظلم و تعدی کی صورت میں مملکت کے اندر یا باہر رونما ہوتی ہے ، ہر مسلمان فرد اور ہر مسلمان مملکت پر فرض کیا گیا ہے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بین الاقوامی اخلاق کے محتسبوں کی طرح تمام دنیا میں گشت لگاتے پھرتے رہیں اور جنگ آزمائی کے لئے اپنے صالح جتھے ہر اس سلطنت کے خلاف لے جائیں جو اسلامی ضابطۂ اخلاق کے مطابق زندگی بسر نہ کر رہی ہو - اسلامی مملکت کو یہ اجازت نہیں دی گئی ہے کہ وہ من مانے طور پر دیگر اقوام کی زندگی اور ان کے طور و طریق کے قوانین میں دخل اندازی کرے ، جبتک کہ کوئی قوم کھلے طور پر حقوق کو پامال کرنے والی ثابت نہو - ایک مسلمان سلطنت کو بطور خود یا دیگر حریت پسند مملکتوں کے ساتھ ملکر ظلم و زیادتی کا قلع قمع کرنے اور عام باشندوں کے حقوق کو دوبارہ بحال کرنے کا اختیار حاصل ہے - اسلام مذہبی آزادی یا آزادی ضمیر کو ایک مہذب مملکت کا لازمی جزو قرار دیتا ہے ، خواہ وہ مملکت اسلامی ہو یا

غیر اسلامی -

(۲۲) اسلام نے غیر مسلم مملکتوں میں مسلمانوں کے بحیثیت رعایا رهنے کے امکان کا بھی لحاظ رکھا ہے - ایک ایسی ملت کے لئے جو تمام دنیا میں پھیل جانا چاهتی هو یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ہر جگہ اپنی هی حکومت کے تحت رهیگی - جب مسلمان اذیت و عقوبت کے باعث حبشہ کی طرف هجرت پر مجبور هوئے ، جو ایک عیسائی ریاست تھی ، تو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ وهاں مثل پابند قانون شہریوں کے مانند رهیں - چنانچہ بحیثیت پابند قانون شہریوں کے انہوں نے نجاشی کے دربار میں عزت و وقار حاصل کیا - ایک مسلمان جو غیر مسلم مملکت میں شہری کی حیثیت سے رهتا ہے تو وہ اس حکومت کے قانون کی پابندی کا خاموش معاهدہ کرتا ہے ، مگر جہانتک اس کی شخصی زندگی کا تعلق ہے وہ اپنے اسلامی تقاضوں کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتا - اسلام معاهدوں اور عہد ناموں کے ایفا پر بڑا زور دیتا ہے ، خواہ وہ بعض پہلوؤں سے مسلمانوں کے لئے کتنے هی ناخوشگوار هوں - ایسے جو عہد نامے کئے گئے اور جن کی پابندی صوری اور معنوی حیثیت سے کی گئی ، ان کی متعدد مثالیں خود آنحضرتؐ نے پیش فرمائی هیں - ''کامیاب مسلمان وہ هیں جو اپنے معاهدات کی پابندی کرتے هیں -''* اور ''اپنے عہد کو پورا کرو -''† ایک ایسا حکم ہے جس کا بار بار اعادہ هوا ہے - جبتک دوسری جانب سے معاهدہ کی خلاف ورزی نہیں هوتی ، اور کھلے یا پوشیدہ طور پر مسلمانوں کے خلاف جارحانہ عمل کی تیاری اور سازش نہیں کی جاتی ، ان پر اپنے عہد کا

* والموفون بعهدهم—بقرہ—۱۷۷
† یا ایها الذین آمنوا اوفوا بالعقود—مائدہ - ۱

پورا کرنا لازم ہے ، خواہ وہ کسی نیم وحشی مشرک ہی سے کیوں نہوا ہو۔ اور ''وہ مشرکین جو تم سے معاہدہ کرچکے ہیں اور جنہوں نے کسی طرح اس کی خلاف ورزی اور تمہارے مقابلہ میں کسی کی اعانت نہیں کی ہے ، تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ ایفائے عہد کرو''*۔ آنحضرتؐ جب کبھی اپنی فوجوں کو روانہ فرماتے تو آپ خاص طور پر اس امر کی تاکید فرماتے کہ کسی کو دھوکا نہ دیا جائے اور نہ کوئی عہد توڑا جائے ۔ جنگ کو دھوکہ اور فریب دہی کی ایک بازی سمجھا جاتا ہے اور یہ چیز زبان زد عام ہو چکی ہے کہ محبت کی طرح جنگ میں بھی ہر چیز جائز ہے ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقیت کے بنیادی اصول کی بھی بیباکانہ خلاف ورزی کی جاسکتی ہے ۔ میدان جنگ میں دشمن کو اپنی طاقت اور عندیہ کی بابت دھوکا دینا ضروریات جنگ سے ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ اسلام اپنے پیرؤں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے معاندین کے ساتھ بھی انسانیت کے بنیادی اوصاف کی پابندی کریں ۔ خیانت اور عہد شکنی کی کسی حالت میں بھی اجازت نہیں ہے ۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا ، جبکہ ایک تنہا مسلمان نے ، جو اس کا مجاز نہیں تھا ، دشمن کی محصور فوج سے اس شرط پر کہ وہ ہتھیار ڈالدیں یہ وعدہ کیا کہ ان کی جان و مال سے کوئی تعرض نہ کیا جائیگا ۔ جب مسلمان فوجوں نے ان پر دست درازی کرنی چاہی تو انہوں نے اس منفرد مسلمان کا وعدہ پیش کیا ۔ خلیفہ نے اس عہد کی توثیق کی اور یہ کہا کہ اگرچہ وہ ایسے معاہدہ کا مجاز نہیں تھا لیکن پھر بھی اس کا معاہدہ صاحب اختیار کی طرح سمجھا جائیگا اور یہ ایسا ہی ہوگا جیسے

---

* الا الذین عاهدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شئیا ولم یظاهروا علیکم احدا فاتموا الیهم عهدهم — توبہ - ۴

کہ پوری ملت نے اس کی منظوری دی ہے۔ یہی قانون جو معاھدوں کو جنگ میں برقرار رکھنے کا حکم دیتا ہے، اس کا اطلاق مسلم رعایا اور غیر مسلم حکومتوں کے باھمی تعلقات پر بھی ھوتا ہے۔ ھدایہ جو مسلمانوں کے قانون اور فقہ کی مشہور کتاب ہے صراحتاً بیان کرتی ہے کہ ”جب کبھی کوئی مسلمان کسی غیر مسلم مملکت میں داخل ھوتا ہے تو اس پر لازم ھوتا ہے کہ وہ اس کے باشندوں کی جان ومال کا احترام کرے، کیونکہ اس نے بن کہے اس امر کا عہد کیا ہے کہ وہ ایسا ھی کریگا“۔

ھم نے اسلامی مملکت کے بنیادی اصولوں سے مختصراً بحث کی ہے۔ معاشی فلاح و بہبود کے کچھ اصول اور صلح و جنگ کے کچھ لوازم بحیثیت اساسی اصول کے پیش کئے گئے ھیں۔ یہ اس کے لوازم ھیں جنہیں مسلمان شریعت اور اسلامی قانون سے تعبیر کرتے ھیں۔ لیکن قانون سازی محض دستور کا بنیادی اصول ھونے سے کہیں زیادہ وسیع چیز ہے۔ یہ معاملہ نہایت اھمیت رکھتا ہے کہ قانون سازی کی بابت اسلام کے رجحان کو سمجھا جائے۔ اس کو زمانہ اور حالات کے موافق ھونا چاھئے۔ اور اس میں قوم بہ قوم اور عہد بہ عہد تنوع اور اختلاف ضروری ہے۔ یہاں ھم ایک انتہا درجہ متنازع فیہ مقام پر پہنچتے ھیں کہ تمام ترقی پذیر اقوام کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے قوانین کو بدلتے ھوئے حالات کے ساتھ مطابقت دیں۔ کیا اسلام کوئی ایسا نا قابل تغیر ضابطہ پیش کرتا ہے جو اھل میڈیا اور فارس کے شہرۂ آفاق قوانین کی طرح ہے؟

اسلامی سلطنتوں کے جمود کے بعد سے کچھ اس قسم کے خیالات تقلید پرست علماء اور نا واقف عوام نے اختیار کرنے شروع

کئے کہ مغرب کے نکتہ چین یہ کہنے لگے کہ مسلمانوں کے قانون کی سخت گیری نئے حالات کے ساتھ ترقی پذیر مطابقت میں ایک عظیم رکاوٹ ھے - اس نکتہ چینی میں بہت کچھ صداقت بھی ھے - مگر یہ الزام اسلام کے سر نہیں ڈالا جا سکتا - جب اسلام ایک زندہ قوت تھا اور اپنے اقتضاء کے مطابق ایک کامل تہذیب کی تشکیل کر چکا تھا تو بڑے بڑے فقہا کے ذریعہ آزادانہ قانون سازی کی جاتی تھی اور مسلمان مملکتیں اپنی معاشی اور معاشری زندگی کو تغیر پذیر حالات کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیتی تھیں - اسلام ابتداً کوئی وسیع اور جامع ضابطۂ قوانین اپنے ساتھ نہیں لایا تھا - اس نے ایک مہذب زندگی کے لئے صرف اساسی اصول عطا کئے تھے جو افراد اور معاشرہ کے لئے کامل خوشحالی کے کفیل تھے - اسناد میں مستند ترین کتاب قرآن ھے ، لیکن اس پوری کتاب مقدس میں ضابطۂ قوائین دس صفحات سے زیادہ پر پھیلے ھوئے نہ ھونگے - اس طرح اسلام کسی ایسے بوجھل مجموعۂ قوانین سے گرانبار نہیں ھے جو اپنی غیر تغیر پذیری کے سبب ترقی پذیر قانون سازی کی راہ میں حائل ھو - قرآن جیسی ایک مختصر سی کتاب زندگی کے صرف بنیادی اصولوں ھی سے بحث کر سکتی ھے - بجز خدا کی وحدانیت پر ایمان لانے ، اور انسان کو تمام خداؤں اور اصنام کی پرستش کو ترک کر کے ایک ایسے خالق موجودات کی عبادت پر جمے رھنے کی نصیحت کے ، جو تمام اقدار کا خالق و محافظ ھے - اور بجز معاشری عدل پرعمل اورشخصی اخلاص و پاکیزگی کی نصیحت کے قرآن میں بہت کم ایسی چیزیں ھیں جنھیں غیر تغیر پذیر ابدی قوانین کی طرح پیش کیا گیا ھو - یہ کتاب زیادہ تر اساسی اصولوں پر مشتمل ھے ، جن میں بعض

ایسے ہیں جو حسب حالات مطابق کئے جا سکتے ہیں۔ یہ اصول ہی ہیں جو ابدی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ ان کی زمانی تطبیق۔ خود آنحضرتؐ اور آپ کے خلفاءؓ نے ان بنیادی اصولوں کو مناسب طریقوں سے، بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ان کے مناسب حال تطبیق دی۔ مگر یہ سب کچھ لوازم اسلام کے اندر رہ کر کیا گیا تھا کیونکہ یہ پوری طرح اسلام کی روح کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھے۔ فقہائے متاخرین کو علم فقہ کی تفصیلات کی تکمیل کرنی پڑی اور انہیں ایسے جامع ضوابط مدون کرنے پڑے جو حقیقی اور فرضی صورتوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ بعد میں یہ فقہی مذاہب اسلامی تقلید پرستی کے پشت پناہ بن گئے اور یہ ضوابط بھی اسلام کی طرح قائم اور اٹل سمجھے جانے لگے۔ اس طرح کی فرسودہ تقلید پرستی مسلمان مملکتوں کے سیاسی جمود کا نتیجہ تھی اور مسلمانوں کی تخلیقی ذہانت، متصرفانہ تحریک، اور آزادانہ تحقیق غیر اسلامی جابرانہ حکومت اور شاہی خانوادوں کی باہمی کشمکش کے ذریعہ دبا دی گئی تھی۔

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا ہے اسلام نے ایک نظام زندگی کا نقشہ مرتب کیا تھا اور بمشکل زندگی کا کوئی ایسا ضروری پہلو تھا جس کو اس نے بے تعلق چھوڑ دیا ہو۔ اہم مذہبی معتقدات کے علاوہ معاشری، معاشی، اور سیاسی زندگی کے اساسی اصول کی بھی تعلیم دی گئی اور ان پر عمل کیا گیا اور ایک واقعی طاقتور مملکت کی بنیاد ان پر رکھی گئی۔ اگر اسلامی نظام کوئی آزادانہ نظام ہونے کے بجائے محدود و مقید نظام ہوتا تو مسلمانوں کی ترقی پذیر تہذیب، جو صدیوں تک دنیا کے تہذیبی منازل ارتقاء کی قیادت کرتی رہی، کبھی

معرض وجود میں نہ آتی ۔ جب اسلام ایک زندہ قوت تھا تو اس نے ایسے اصول قانون بنائے جو آزادانہ قانون سازی کے لئے وسیع گنجائش رکھتے تھے ۔ اگر یہ وسعت خیال خود روح اسلام میں کار فرما نہ ھوتی تو مسلمانوں کی تہذیب بہت جلد ساکن و جامد ھو جاتی ۔ اب ھم اسلامی فلسفۂ قانون کے اصول بیان کرینگے تاکہ یہ معلوم ھو جائے کہ وہ آزادی کی کس قدر پرورش کرتے ھیں ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا آخری سر چشمہ وحی ھے ۔ دیگر بڑے مذاھب کی طرح یہ بھی حقائق کے فوق الحس اور فوق العقل فہم و ادراك کو تسلیم کرتا ھے ۔ لیکن اسلام کی امتیازی خصوصیت یہ ھے کہ وہ وحی کو فطرت اور عقل کے بالکل مطابق مانتا ھے ۔ تمام کائنات از سر تا پا ایک وحی و الہام ھے اور ھر ایک کی رھنمائی وحی کے ذریعہ کی جا رھی ھے ۔ فطرت بذات خود ایک مصحف کائنات ھے ۔ حیوانی جبلتیں بھی وحی کے مماثل بتلائی گئی ھیں ۔ جیسا کہ قرآن کہتا ھے کہ خدا نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ وہ اپنا چھتہ تیار کرے ۔ قرآن میں وحی عقل و فطرت کی ایسی ھدایت کا نام ھے جس سے وہ فوق العقل القا شدہ صداقتوں کا فہم و ادراك کرتی ھے ۔ قرآن کی رو سے وحی عقل کی جگہ نہیں لیتی بلکہ وہ اس کو تقویت پہنچاتی، مدد دیتی اور محسوس سے غیر محسوس کی طرف لیجاتی ھے ۔ تقریباً ھر حکم یا ھر اصول کے بیان کے بعد قرآن اس کا اضافہ کرتا ھے کہ ”تم کیوں غور نہیں کرتے“ ۔ ”تم کیوں تدبر نہیں کرتے“ ۔ لہذا قرآن کی وحی کوئی عجائبات کی وحی نہیں ھے ۔ اسلام تمام مذاھب میں سب سے زیادہ غیر پر اسرار ھے ۔ اس میں بجز خدا کی وحدانیت کے کوئی اذعان نہیں ھے ، ایسا خدا

جو خود کو عقل اور فطرت میں ظاہر کئے ہوئے ہے اور سب سے بڑھکر اولیاء اور انبیاء کی زندگیوں میں ظہور کئے ہوئے ہے، جو سب کے سب ایمان کے بنیادی اصول پر متفق ہیں۔ ان قوانین کے بعد جو صراحتاً قرآن اور آنحضرتؐ کے ذریعہ عطا ہوئے ہیں آئین و ضوابط کا کل مجموعہ اصولاً لوازم اسلام ہی سے اخذ کیا جانا چاہئے۔ اسلام صرف اس؟ مفہوم میں دینی حکومت ہے کہ اس کے بنیادی اصول خدا کے عطا کردہ یقین کئے جاتے ہیں۔ لیکن خدا جس نے انسان کو عقل عطا کی ہے اور جس نے ایک منظم کائنات پیدا کی ہے، اسنے انسان کو بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنے انتظامی اصول بنانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے ابتداء ہی سے مسلمانوں کے علم فقہ میں منطقی اور تمثیلی استخراج کے اصول اختیار کئے گئے اور اس کی اصطلاحات میں استنباط، جس کے معنی کھود کر پانی نکالنے کے ہیں اور اجتہاد و استخراج، جس کے معنی منطقی اور تمثیلی نتیجہ کے ہیں، اسی کے تحت داخل ہیں۔

آنحضرتؐ اس کا بخوبی علم رکھتے تھے کہ کوئی قانون اتنا جامع نہیں ہوسکتا جو زندگی کے تمام متنوع حالات پر حاوی ہو سکے۔ بنی نوع انسان کو عقل سے سرفراز کیا گیا ہے اور ضرورت ہے کہ اس کو کام میں لایا جائے، سنوارا جائے اور اس کی اصلاح کی جائے۔ کوئی اخلاقی ضابطہ بھی اتنا جامع نہیں ہو سکتا جو انسانی حالات کے غیر محدود تنوع سے بحث کر سکے۔ اخلاقیات عملی کی تفصیلات پر حاوی ہونے کی کوشش سوفسطائیت پر منتج ہوتی ہے جو اصول اخلاق کو گھٹا کر اکثر مہمل حد تک پہنچا دیتی ہے۔ سوال کرنے والا بالواسطہ انسانی آرزوؤں کے ساتھ ظلم کرتا ہے۔ آپ نے مزید

ارشاد فرمایا کہ سابقہ قومیں کثرت سوال اور دینی موشگافیوں کے سبب برباد ہوئیں - ہمارے سامنے عدیم النظیر حکومت الٰہیہ کے بانی کی ایک واضح مثال موجود ہے جن کی یہ خواہش تھی کہ عام اصول اور ان کے چند اطلاقات پر بطور نظائر کے قائم رہیں اور بقیہ کو زندگی کی تبدیلیوں اور ترقیوں کے لئے آزاد چھوڑ دیں تاکہ وہ اخلاق اور عقل کے اساسی اصول کے مطابق ڈھالے جا سکیں - آنحضرت‌ؐ کے کئی ارشادات اور قرآنی آیات ہیں جو منطقی اور تمثیلی استخراج کے لئے بطور بنیاد کے کام دے سکتے ہیں - حضرت معاذ‌ؓ جب یمن کے گورنر مقرر ہوئے تو آنحضرت‌ؐ نے دریافت فرمایا کہ تم کس اصول کی پابندی کروگے - انہوں عرض کیا قرآن کے احکام کی - آنحضرت‌ؐ نے ارشاد فرمایا اگر تمہیں اس میں کوئی ہدایت نہ ملے تو کیا کروگے - انہوں نے عرض کیا میں سنت رسول‌ؐ پر عمل کرونگا - پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر سنت رسول میں بھی تمہیں کوئی ہدایت نہ ملے ، اس پر انہوں نے عرض کیا کہ میں اجتہاد کو کام میں لاؤنگا اور اپنی عقل کے مطابق فیصلہ کرونگا - آنحضرت‌ؐ نے اس طریق کار کو پسند فرمایا اور ان کو خیر و برکت کی دعا دی - اسی کے مماثل ایک اور واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت‌ؐ نے ایک شخص کو نصیحت فرمائی تھی کہ وہ اپنے قلب سے مشورہ کیا کرے - جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی فیصلہ پر پہنچنے سے قبل اپنی عقل و ضمیر سے استشارہ کر لیا کرے - اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت‌ؐ کے زمانہ ہی میں صحابہ کو جب کبھی ضرورت پیش آتی تو آزادانہ اجتہاد کرتے تھے - حقیقی تاریخی پس منظر سے ناواقفیت نے متاخرین میں یہ غلط عقیدہ پیدا کیا کہ اجتہاد

صرف بڑے فقہا اور ائمہ کا حق ہے ، جن کے فقہی مذاہب بعد میں تقلید پرستی سے مبدل ہوگئے تھے - آنحضرتؐ نے خود والیان صوبہ کو چاروں طرف روانہ فرمایا تھا اور یہ بشری امکان سے باہر تھا کہ ہر صورت حال میں حضورؐ کی طرف رجوع کیا جاتا - آنحضرتؐ کے بعد ایک قلیل عرصہ میں اسلام کی عملداری متمدن دنیا کے ایک بڑے حصہ پر پھیل چکی تھی - وسیع پیمانہ پر قانون سازی زیادہ سے زیادہ ناگزیر ہوتی گئی - آبادیاں اور وسیع علاقے جو اپنے طریقہ ہائے زندگی میں حد درجہ مختلف تھے ، اسلام کے نظام سیاست میں شامل ہوتے گئے اور قوانین میں اضافہ ہوتا گیا - قوانین بنتے رہے اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ تغیر پاتے رہے ، لیکن اسلام کے بنیادی اصول ہمیشہ اساس بنے رہے - ابتدائی خلفاء کی زندگیوں میں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں ان کے فیصلے بظاہر احکام قرآن کے بھی معارض نظر آتے ہیں - جب دیگر متمدن اقوام چوروں کو سنگین سزائیں دیتی تھیں تو اسلام چور کے لئے صرف قطع ید کا حکم دیتا تھا - لیکن زمانۂ قحط میں حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ دوران قحط میں چور کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں کیونکہ حالات غیر معمولی تھے - حضرت عمرؓ کا دور خلافت ایسے واقعات سے معمور ہے جن میں آپ نے معمولی آئین و دستور سے تجاوز فرمایا تھا - کیونکہ آپ کے نزدیک حالات قانون میں تغیر و التواء کے متقاضی تھے - آپ نے مفتوحہ علاقوں کو فاتحین میں تقسیم کرنے سے انکار فرمایا - بعض صحابہ نے قبائلی لڑائیوں کی مثال پیش کی جن میں بعض اوقات شکست خوردہ دشمن کی زمین تقسیم کر دی جاتی تھی - ان کا خیال تھا کہ حضرت عمرؓ نئی چیز کی ابتداء فرما رہے ہیں اور مسلمہ اصول کی

خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ لیکن آپ اپنی اس رائے پر قائم رہے کہ قبائلی جنگ و جدل ایک مستقل حکومت کے ذریعہ متمدن علاقوں کی فتح سے مختلف ہے۔ چنانچہ آپ نے کسی مسلمان سپاہی کو زمین عطا کرنے سے انکار فرما دیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا قانون معین بھی ہے اور ساتھ ہی آزاد بھی۔ صرف چند عام اصول، جو اسلامی نظریۂ حیات کا لازمی تقاضا ہیں، معین ہیں۔ ان کی مجرد نوعیت بعض حقیقی حالات کے انطباق سے محسوس بنا دی گئی ہے۔ مگر ظاہری صورت سے زیادہ ان کی باطنی روح اہمیت رکھتی ہے۔ شریعت جو مسلمانوں کے قانون اور اخلاق کی مستقل اساس ہے وہ فی الحقیقت چند بنیادی اصولوں کا تعین ہے۔ ایسی سخت گیری جو کسی قوم کی آزادانہ ترقی اور روح اسلام کے حصول میں مانع ہو سکتی ہے وہ خود اسلام سے زیادہ فقہی تقلید پرستی کا نتیجہ ہے، جو صدیوں ملت اسلامی کی ترقی پذیر زندگی کے بعد جامد ہو چکی ہے۔ اسلام کے خلاف ایسی تنقید خود متناقض بالذات ہے۔ ناقدین کی ایک قسم یہ دعویٰ کرتی ہے کہ دنیا میں اسلام کی اشاعت نہایت سرعت کے ساتھ اس لئے ہوئی کہ اس کے اخلاق اور قانون نہایت لچکدار اور نرم تھے اور انسان کے ہر قسم کے ممنوعہ جذبات کو کھل کھیلنے کا موقع ملتا تھا۔ جن چیزوں کی دیگر مذاہب نفی کرتے تھے انہیں یہاں سند جواز حاصل تھی۔ ناقدوں کی دوسری قسم یہ کہتی ہے کہ اسلام ایک آہنی صدری کے مثل تھا اور انسانوں کو اپنے سخت گیر پروکرستینی (Procrustean) بستر پر کھینچنا چاہتا تھا۔ اور اسی لئے معاشی اور سیاسی حالات میں تبدیلیوں کے ساتھ اس کا ترقی کرنا بھی موقوف ہو گیا۔ لیکن اس قسم کے تمام الزامات

جہالت اور تعصب کا نتیجہ ہیں جو تاریخی حقائق کے آگے ٹک نہیں سکتے ۔ کسی مذہب کی حقیقی روح کا پتہ اس کے ابتدائی اور تخلیقی ادوار میں لگایا جا سکتا ہے ۔ اسلام کی ابتدائی صدیاں اس کی تخلیقی صدیاں تھیں۔ اور اگر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو اسلام نے انسانیت کو جو تہذیبی ورثہ عطا کیا ہے اس کا مطالعہ کرنا چاہئے ۔ اسلام نے انسانیت کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ نسلیت اور قومیت کے حدود سے آگے بڑھ جائے۔ ڈبلیو ۔ آر ۔ انگے صدر سینٹ پال کے اس اقتباس سے بھی میرے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے ۔ ''مذہبی رشتہ جو مسلمانوں کو باہم مربوط کئے ہوئے ہے وہ محض سیاسی رشتہ سے زیادہ محکم معلوم ہوتا ہے ۔ نسلیت اور بڑی حد تک طبقاتی اختلافات بھی اس مذہب سے مغلوب ہو چکے ہیں ۔ یہانتک کہ ایک نیچ ذات کا ہندو ، مسلمان ہو کر سب کچھ حاصل کر سکتا ہے۔'' (Outspoken Essays صفحہ ۷۰) اگرچہ میں بعض دیگر باتوں میں اسلام کی بابت اس مصنف کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا مگر بعض تاریخی حقائق کا یہ بے لاگ اعتراف ایک ایسے شخص کے قلم سے جو کلیسا کا بڑا عہدہ دار ہو ، قابل قدر ہے ۔ اسی مصنف کا یہ خیال ہے کہ ''عرب ابتدا میں مذہب بدلنے کے خواہشمند نہ تھے اگرچہ کہ وہ بت پرستی کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ عیسائیت کے ساتھ وہ غیر رواداار نہ تھے اور ان کا سلوک یہودیوں کے ساتھ اس زمانہ کے عیسائیوں کے سلوک سے بدرجہا بہتر تھا ۔ فتوحات اور ملک گیری کی اس حیرت انگیز صدی کے اثرات نے موجودہ دور کی تاریخ پر بھی اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں ، لیکن ہم کو تاتاریوں کی بربریت کے لئے مذہب اسلام کو ذمہ‌دار گرداننے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے جو سوئے

اتفاق سے عربوں کے جانشین اور مسلمانوں کی قوم کے خاص نمائندہ قرار دئے گئے تھے۔'' اسلام پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بعض اوقات ڈین انگے جیسے ذہین مصنفین بھی خود کو تناقضات میں غیر شعوری طور پر الجھا دیتے ہیں۔ وہ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلامی فلسفۂ قانون الوہی ہے اور اس قانون کا سر چشمہ ذات باری ہے، وہی ذات جو اجتماعی انصاف کے حقیقی نصب العین کا حکم دیتی ہے۔ جس طرح ہر قسم کی خیال پرستیاں لادینی مملکت کے تصور کے تحت باہم جمع کر دی گئی ہیں، اسی طرح مختلف بلکہ متناقض خیال پرستیوں کو باہم ملا کر ان پر دینی حکومتوں کی مہر لگا دی گئی ہے۔ دینی حکومت اپنے وسیع تسلیم شدہ مفہوم میں سخت اور غیر جذب پذیر سمجھی جاتی ہے۔ اگر وہ کشادہ دلی سے انسانیت کے تہذیبی ورثہ کو، جہاں کہیں پاتی یا معلوم کرتی، اپنے میں جذب کر لیتی تو غیر ترقی پذیری کا الزام، کھلے دل سے صداقتوں کے قبول کرنے کے سبب، اس سے دھل جاتا۔ علم کے متعلق آنحضرتؐ کا یہ عام ارشاد ہے کہ کلمة الحکمة ضالة المؤمن فحیث وجدها فهو احق بها (ترمذی) ''علم و حکمت کی بات مومن کی گمشدہ چیز ہے۔ وہ اس کو جہاں پائے اس کے لینے کا وہی زیادہ مستحق ہے۔'' ہر قسم کا علم انسان کی عالم گیر میراث ہے۔ صداقت کسی قوم کا اجارہ نہیں ہے۔ آنحضرتؐ کی مشہور حدیث ہے کہ ''علم کی جستجو کرو خواہ تمہیں اس کے حاصل کرنے کے لئے چین تک سیاحت کرنی پڑے۔''* ڈین نے اپنے مقالے مملکت مرئی و غیر مرئی (Visible and invisible) میں دینی

* اطلب العلم ولو کان بالصین

حکومتوں کے ان اچھے اور برے پہلوؤں کی تشریح کی ہے، جو کہ مختلف مذاہب اور تہذیبوں میں نشو و نما پاتے رہے۔ لیکن اسلام کی بابت اسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اسلام اس خصوص میں ایک استثنا ہے۔ دیگر اقوام اور ان کے رسم و رواج سے بربنائے مذہب نفرت و حقارت کا انداز دینی حکومتوں کے باشندوں کے لئے یہ تقریباً ناممکن بنا دیتا ہے کہ وہ دوسری قوموں سے کچھ سیکھیں۔ لیکن یہ چیز مسلمانوں پر منطبق نہیں ہوسکتی، جو قرون مظلمہ میں یونانی رومی تہذیب کو مغرب کی عیسائی اقوام سے زیادہ قبول کرنے کے لئے مستعد تھے۔

اسلام کے مخالف ناقدین اس آزاد خیالی اور ترقی پذیری کے اسباب روح اسلام کے بجائے دوسرے عناصر میں تلاش کرتے ہیں۔ بعض اس کے وجوہ عربی قومیت کی توسیع و اشاعت میں ڈھونڈتے ہیں اور بعض آج کل کے اشتمالیوں کی طرح ہر چیز کی توجیہہ معاشی عوامل سے کرنی چاہتے ہیں۔ اسلام پر ایم۔ این۔ رائے کا رسالہ محض معاشی عوامل کی تحقیق ہے۔ عیسائیت کے متعلق بھی اسی طرح پرتاویل کی جاتی ہے۔ جب وہ کسی خاص زمانہ میں مسلمان قوموں کے جمود و بے حسی کو دیکھتے ہیں تو دنیا کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہ اسلام کے دینی نظام کی سخت گیری ہے جسنے انہیں بے حس و حرکت بنا رکھا ہے۔ قدامت اور فرسودگی اسلام کے سر تھوپی جاتی ہے، اور اسلام کی ترقی پذیر اور تخلیقی صدیوں کے لئے اسلام کے علاوہ دیگر عوامل کا تفحص کیا جاتا ہے۔ ایک زبردست تہذیب کی خدمات کے جانچنے کا یہ یقیناً نہایت غیر منصفانہ طریقہ ہے، اور اسلام کے ساتھ یہ سخت ناانصافی ہے۔ اسلام کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ تمام سچے

مذاہب انسان کو آزادی بخشنا اور توہمات اور معاشری ناانصافی کے قید و بند توڑنا چاہتے ہیں ۔ امریکی اعلان آزادی کے تمہیدی بیان میں درحقیقت اسلام کے اس نظریہ کو دھرایا گیا ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے اور ہر جگہ وہ قید و بند میں جکڑا ہوا ہے ۔ ممتاز مسلمان صوفی مولانا روم کا قول ہے کہ انبیاء انسانوں کو آزادی عطا کرنے کے لئے مامور ہوتے ہیں ۔ اسلام تمام انسانی جبلتوں کی تحسین کرتا ہے ، لیکن وہ ان کے اعمال پر چند حدود عاید کرتا ہے ۔ اسی لئے قرآن میں اخلاقیت اور قانونیت کو حدود اللہ کا موزوں لقب دیا گیا ہے ، اور مذہب کی تعریف انسان کے لئے صحت بخش اسباب آسائش کا پیدا کرنے والا بتلائی گئی ہے ۔ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ دو متبادل صورتوں میں سے ایسی صورت کا انتخاب کیا جائے جو زیادہ آسان ہو ۔ بشرطیکہ وہ کوئی معصیت نہو* ۔ گذشتہ صدی کے دوران میں جنوبی افریقہ میں اسلام کی اشاعت کی بابت عیسائی مبلغین کا یہ بیان ہے کہ یہ افریقی اقوام کی قدیم تہذیبوں کے ساتھ موافقت کا نتیجہ ہے ۔ ایک ایسا مذہب جو دنیا کی اعلیٰ ترین تہذیبوں کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکتا ہو ، اور جو عجمی ، یونانی اور رومی دنیا کے ایک حصہ کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہو ، وہ کسی طرح سخت گیر اور ناسازگار مذہبی نظام سے متہم نہیں کیا جاسکتا ۔ اسلام کا خدا انسانیت کی تمام قسموں کے لئے نہایت فیاض ہے ، اور یہ چیز قابل تحسین ہے یا قابل نفرین ، اس کا تمامتر انحصار اس نقطہ خیال پر ہوتا ہے جو کوئی شخص اختیار کرتا ہے ۔ ڈیوسن (Deussen) زبردست جرمن مورخ اور فلسفہ اور

* اذا بتلیت ببلیتین فاختز ا ھونھما

سنسکرت کا متبحر عالم تھا جو ویدانتی اور بدھ متی مابعدالطبعیات پر ایمان لاچکا تھا - یہ شو پنہار کی طرح روح اسلام کو سمجھنے یا اس کی قدر پہچاننے سے قاصر رہا ، اور اسی کی طرح فریب ہستی کا خاتمہ کرنے کے لئے خواهش و اراده کے نفی و انکار کے اصول سے متاثر تھا - ڈیوسن اسلام کی بابت کہتا ہے کہ اسے مذهب سے تعبیر نہ کیا جائے ، کیونکہ یہ دنیا اور زندگی کے حقیقی ہونے کا دعویدار ہے اور انسانی وجدانات اور خواہشات کو جائز قرار دیتا ہے - حالانکہ اس کے خیال کے مطابق تمام سچے مذاہب یا مابعدالطبعیات کو چاہئے کہ وہ انسان کو ان سے دور رکھے - اس کے نزدیک اسلام مطلقاً کوئی مذہب نہ تھا ، کیونکہ یہ دنیا سے بہت زیادہ وابستہ تھا -

اسلامی اصول قانون کی دینی اساس سے کسی ترقی پزیر معقولی کو خوف زدہ نہ ہونا چاہئے جو واقعتاً معاشری عدل اور غیر طبقاتی معاشرہ کی تدریجی تخلیق کا آرزو مند ہوتا ہے - قرآن صرف اخلاقیت اور اجتماعی عمل کی تعلیم دیتا ہے ، اور بحیثیت ایک فرض کے ظلم و تعصب کے خلاف جنگ کرنے گا حکم دیتا ہے - قرآن اسلامی زندگی کی حقیقی اساس ہے اور اس کے اصلی قوانین نہایت محدود ہیں - مسلمان حسب ضرورت حق و انصاف کے جذبہ کے تحت قانون سازی میں آزاد ہے - قرآن میں یہ چند قوانین ایسے ہیں جو بیشتر جوازی ہیں ، اور ان میں یہ آزادی ہے کہ وہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ منطبق کئے جا سکتے ہیں - اس کے نظام حکومت کی دینی اساس ان غیر مسلموں کو مساوی شہری حقوق عطا کرتی ہے جو بحیثیت وفادار رعایا کے مسلمان مملکت میں رہتے ہیں - ان کے شخصی قوانین کا احترام کیا جاتا ہے - اور ایک مسلمان جج بھی

غیر مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ ان کے قوانین کے مطابق ھی کرتا ھے ، بشرطیکہ وہ اجتماعی عدل کے اصول کی خلاف ورزی نہ کریں ، جن پر تمام ضابطہ و قانون مبنی ھوتا ھے ۔

اسلام کے تصور کے مطابق مذھب چند ضروری امور میں اس مذھب سے مختلف ھے جس کی تشریح عام طور پر تقلید پرست کیا کرتے ھیں ۔ اسی طرح اس کے دینی نظام کی اساس بھی بالکل مختلف رنگ اختیار کرتی ھے ۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا ھے قرآن کے چند بنیادی قوانین ، اور آنحضرتؐ کے اس عمل کو جو آپنے اپنی زندگی میں حسب حالات اختیار فرمایا ، ملحوظ رکھ کر صحابہ نے نئے حالات کے لحاظ سے ، جن کی سابق میں کوئی نظیر نہیں تھی ، قانون سازی میں اپنی رائے کو استعمال کیا ۔ آنحضرتؐ کے بعد خلفاء کو جب کسی امر میں شبہ ھوتا تو وہ ان اصحاب کو جو اسلام کی روح کو صحیح طور پر سمجھے ، ھوئے تھے عام مشورہ کیلئے جمع کرتے تھے اور جو بہترین رائے ھوتی اسے قبول کیا جاتا تھا ، خواہ وہ ان کی رائے کے خلاف ھی کیوں نہ ھو ۔ شوریٰ کے ذریعہ حکومت کا اصول صاف طور پر قرآن میں بیان کیا گیا ھے ، اور آنحضرتؐ کو وحی کے ذریعہ حکم دیا گیا ھے کہ آپ اپنے صحابہ سے اھم معاملات میں مشورہ فرما لیا کریں ۔ آنحضرتؐ کو ، جو آمر بننے کے بہترین موقف میں تھے ، خدا کی طرف سے حکم دیا گیا کہ آپ تنہا کسی چیز پر عمل نہ فرمائیں ، خواہ آپ کتنے ھی دوسروں سے عقل و فراست میں ممتاز ھوں ۔ کیونکہ اس سے انسانیت کے لئے ایک اچھی مثال قائم نہ ھوتی اور یہ چیز عمومیت کے قیام میں مانع ھوتی ، جو اسلام کے خاص مقاصد میں سے ایک ھے ۔ خلفاء راشدین پر بعض

اوقات ایک معمولی عورت بھی حرف گیری کرتی اور انہیں درست کرتی تھی - ایسے بڑے فقہا یا ائمہ اربعہ ، جن کے نظامات فقہ بعد میں اہل سنت کے مذاہب بن گئے ، آزادانہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے - باوجود ان اختلافات کے انہیں وہ عزت حاصل ہوئی جس کے کہ وہ مستحق تھے - کیونکہ انہوں نے اپنی بصیرت کے مطابق اصول اسلام کو ان حالات سے منطبق کیا تھا جن سے کہ انہیں سابقہ پڑا تھا - آزادانہ قانون سازی کی گنجائش ان ضوابط و قوانین سے کہیں وسیع تر ہے جو قرآن و سنت میں پائے جاتے ہیں - قدیم قبائلی عربوں کی زندگی کے حالات میں آنحضرتؐ نے خود یہ محسوس فرمایا تھا کہ انسانوں کے روز بروز کے معاملات میں ایسی بہت سی چیزیں پیدا ہو سکتی ہیں جن کا احاطہ قرآن و سنت دونوں سے نہیں ہو سکتا - اس لئے آپ نے لوگوں کو نصیحت فرمائی کہ وہ ایسی صورتوں میں اپنی قوت تمیز کو استعمال کریں - اجتہاد کا دائرہ ایسا ہی غیر محدود ہے جیسا کہ انسان کی حالتوں کی تبدیلی یا موافقت غیر محدود ہے - یہ ملت اسلام کی ان تمام ضروریات کی تکمیل کی جستجو کرتا ہے جن کو قرآن و حدیث میں پورا نہ کیا گیا ہو - مجتہدین اسلام نے ان تقاضوں کو مختلف طریقوں سے پورا کرنے کی سعی کی ہے جو فنی اصطلاح میں قیاس ، استحسان اور استصلاح کے الفاظ سے مشہور ہیں - ان سب پر مقدم عمومیت کی زبردست بنیاد اجماع ہے یعنی ان لوگوں کی متفقہ رائے جو علم سے سر فراز کئے گئے ہیں - سروں کو گن کر فیصلہ کرنا جاہل اور بدکاروں کی رائے کو بھی یکساں اہمیت دینا ، ہر فرد کو تن واحد شمار کرنا اور کسی کی حیثیت ایک دوسرے سے زائد نہ سمجھنا ، ایسا اصول ہے کہ ضروری قوانین بنانے

کی حد تک اسلام میں اس کا کوئی مقام نہیں ۔ قانون کی نظر میں سب برابری کا درجہ رکھتے ہیں ، لیکن قانون سازی میں سب کی مساوی حیثیت نہیں ۔ عادلانہ قانون بنانے کا معاملہ اہل علم و دیانت کا حق اور فرض ہے اس کو سیاسی جماعت سازی کی دلیل نہ بنانا چاہئے، کیونکہ اس طرح قانون کی تجویز و مخالفت اپنی جماعت کی تقویت اور بر سر حکومت جماعت کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے کی جاتی ہے ۔ اسلامی فقہ میں اجماع یا اتفاق رائے ایک اہم اصول ہے ، لیکن کوئی جمہوریت جو اسلامی ہونے کی دعویدار ہو ، وہ نہ برطانوی نمونہ کی ہوگی اور نہ روسی۔ ان میں پہلی تو دو یا دو سے زائد جماعتوں کے تصادم پر مبنی ہے ، اور دوسری کی بناء صرف ایک جماعت کے اقتدار کی اجارہ داری ہے ، جو کسی اختلاف کو برداشت نہیں کر سکتی ۔ اگر کوئی اسلامی حکومت اسلامی اصول پر اسمبلی یا کسی پارلیمنٹ کی تشکیل دے تو اس کا مذہبی پیشواؤں کی انجمن بن جانے کا خطرہ نہیں ۔ کیونکہ اسلام کسی باضابطہ ملائیت کو تسلیم نہیں کرتا ۔ اسلامی معاشرہ ایک غیر طبقاتی معاشرہ ہے ۔ یہاں کوئی مذہبی انجمن اور طبقات خاص رعایات اور مفادات کے ساتھ نہیں ہیں ۔ لیکن اصحاب علم اور دانش و کردار میں سے اراکین مجلس کے انتخاب کا کوئی طریقہ ہونا چاہئے ۔ سیاسیات میں مال و دولت کو کوئی دخل نہ ہونا چاہئے ، ورنہ وہ برائے نام عمومیت اور عملی طور پر اہل ثروت کی سیادت ہوگی ۔ اسلامی عمومیت خود اپنے امتیازی نظام کی تخلیق کریگی ۔ کسی موجودہ نظام کی، جو عمومیت کی دعویدار ہو، غلامانہ اور اندھی تقلید روح اسلام کے ساتھ ہمرنگ نہ ہوگی ۔ افلاطون منصفانہ اور بے غرضانہ قانون سازی کے لئے ذہنی اور اخلاق

اشراف کی ایک جماعت تشکیل دینا چاھتا تھا۔ افلاطون کا یہ طبقہ معرض وجود میں نہ آسکا اور صرف اسکے تصور میں ایک معیاری نمونہ بن کر رہ گیا۔ صرف ایک نظام جو واقعی ذات پات کی تفریق کے ساتھ رو بہ عمل لایا گیا، ھندو نظام تھا، جس کی زبردست خرابیاں اجتماعی نا انصافی اور عدم مساوات کی صورت میں ظاھر ھوئیں، اور جو رو بہ تنزل ھو کر بدترین قسم کا طبقاتی تسلط اور انسانی حقوق کو پامال کرنے والا نظام ثابت ھوا۔ اسلام ذات پات کی تخلیق کا سخت مخالف تھا۔ یہ افراد میں وسیع اختلافات کو تسلیم کرتا تھا۔ اعلیٰ افراد کسی خاندان یا کسی جماعت میں بھی پیدا ھو سکتے تھے۔ روح کی دنیا میں کوئی توریث نہیں۔ نسیم روح جدھر چاھتی ھے گذر جاتی ھے۔ اسلامی جمہوریت میں جہاں اتفاق آراء سے معاشرہ کی قسمتوں کا انضباط ھونا چاھئے، صرف وہ اشخاص ھدایت اور قانون بنانے کا حق رکھتے ھیں جو صاحب علم اور صاحب کردار ھوتے ھیں۔ اس چیدہ جماعت کا انتخاب کس طرح پر ھو، یہ ایک مشکل مسئلہ ھے، جو دلدادگان عدل و انصاف کے قلوب میں ایک اضطراب پیدا کئے ھوئے ھے۔ مگر ابتک کوئی مسلم یا غیر مسلم قوم قابل عمل طریق کار دریافت کرنے میں کامیاب نہ ھو سکی۔ ملت اسلامی کے سیاسی مسائل کو معاشری، معاشی اور اخلاقی مسائل کے ساتھ آنحضرتؐ نے حل فرمایا تھا۔ آپ کی ذات والا صفات ایک زبردست تخلیقی قوت کی حامل تھی اور آپ کے بعد کچھ عرصہ تک وہ لوگ جو آپ کی ھدایت اور تربیت سے فیضیاب ھوئے تھے اور بالکلیہ اسلامی رنگ میں رنگے گئے تھے، اس طریق پر عمل پیرا رھے۔ لیکن مختلف مقامات اور مختلف تہذیبوں میں اسلام کی حیرت انگیز

اشاعت کے بعد جمہوری طریقہ پر حکومت کرنا اگر ناممکن نہیں تو انتہا درجہ دشوار ہوگیا ۔ اور اس کے بعد کوئی مسلمان مملکت ، خواہ اس کے تہذیبی کارنامے کتنے ہی شاندار رہے ہوں ، اس مسئلہ کو حل کرنے کے قابل نہ ہوسکی۔ مسلمانوں میں ہمیشہ یہ عقیدہ جاگزین رہا کہ صحیح اسلامی معاشرہ کو اشتراکی اور جمہوری ہونا چاہئے ، اور مطلق العنان شاہی غیر اسلامی حیثیت رکھتی ہے ۔ مگر اسلامی نصب العین کی سیاسی حیثیت سے عمل پذیری کے لئے زمانہ اس وقت تک تیار نہ تھا ۔ چنانچہ اسلام کے ابتدائی چند سال بطور ایک مقدس یادگار یا نصب العین کے دلوں میں پرورش پاتے رہے ، اور ان کی یاد اس موہوم امید کے ساتھ باقی رہی کہ کبھی نہ کبھی انسانیت بذریعہ ارتقاء یا انقلاب ان کی طرف پیش قدمی کریگی ۔

مامون جیسا زبردست خلیفہ بھی جو ہارون رشید کا بیٹا اور جانشین تھا ، اپنے دعوؤں کے جواز میں شک و شبہ رکھتا تھا ، جس کا اظہار اس کی زندگی کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے ۔ ایک بدوی عرب بلا کسی آداب کے سیدھا دربار میں چلا آیا ۔ جس وقت اسکو محافظین اور اہل دربار کی طرف سے روکا جا رہا تھا تو خلیفہ نے اس حالت میں اسے دیکھ لیا اور محافظین کو حکم دیا کہ اسے تخت تک آنے دیا جائے ۔ اس نے خلیفہ کو اس کے نام سے بلا کسی تعظیمی القاب کے مخاطب کیا اور بے اعتنائی کے ساتھ یہ کہا کہ وہ ایک سوال کا جواب چاہتا ہے ۔ مامون کے اجازت دینے پر اس نے کہا کہ تجھے کس نے صدر حکومت مقرر کیا ہے ۔ کیا تو اپنی خواہش سے تخت پر بیٹھا ہے یا مسلمان قوم کی اتفاق آراء سے منتخب ہوا ہے ؟ خلیفہ نے جو اپنی بردباری اور فلسفیانہ خیالات کے سبب مشہور

تھا یہ جواب دیا کہ ان دو میں سے کوئی چیز بھی واقعتاً نہیں ہوئی۔ خلیفہ نے کہا حقیقت حال یہ ہے کہ میرا باپ صدر حکومت تھا، اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس نے ایک وسیع سلطنت چھوڑی جس کا نظم و نسق ضروری تھا۔ قدرتاً ردائے خلافت میرے کندھوں پر ڈالی گئی، اور اتفاق رائے سے کسی کے منتخب ہونے تک یہ ذمہ داری مجھے اٹھانی پڑی۔ صحیح طریقہ علماء سے استشارہ کا ہے، لیکن اس کا حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ اب میں تجھے اس کام پر مقرر کرتا ہوں۔ کل سلطنت میں گھوم کر کسی کے حق میں اتفاق رائے حاصل کر، جو کوئی بھی ہو میں اس کے حق میں دست بردار ہو جاؤنگا۔ بدوی اس جواب سے مطمئن یا شاید متحیر ہو کر دربار سے چلا گیا، اور اسطرح یہ معاملہ ختم ہوگیا۔ دنیا نے اس حد تک ترقی نہیں کی تھی کہ وہ اشتراکی جمہوریت کے لئے سازگار حالات پیدا کر سکے اور اس نصب العین کو اس وقت تک معرض التواء میں رکھنا پڑا جبتک کہ تاریخ مختلف دوروں سے گذر نہ جائے۔ بعض مسلمان ممالک اس موقف میں ہیں کہ وہ اس کو بروئے کار لا سکیں۔ کیا وہ اسلامی نمونہ پر سلطنت بنا سکتے ہیں یا وہ ایسا کرینگے بھی؟ مستقبل بطن ایام میں ہے، اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا وجود میں لائیگا۔ مگر اسلام نے تھوڑے عرصہ کے لئے اس نمونہ کو پیش کر دیا اور اشتراکی جمہوریت کا ایک معیار قائم کر دیا۔ خلش آرزو موجود ہے، اور اسے ایک دائمی فیضان کی طرح بر سر عمل رہنا چاہئے۔

کہتے ہیں کہ مذہبی حکومتیں مستحکم نظم و ضبط پیدا کر کے بالآخر غیر ترقی پذیر اور تنگ خیال ہو جاتی ہیں۔ سوسائٹی کے لئے ایک خاص حد تک اور ایک خاص زمانہ کے

لئے قوانین ، رسوم اور روایات کا قیام ایک بہتر پشت پناہ ہوتا ہے ، لیکن بعد ازاں ان کی غیر تاثر پذیری اور سخت گیری تبدیلی اور ترقی میں موانع پیدا کردیتی ہے ۔ اس دعوے کی صداقت کے ثبوت میں تاریخ متعدد مثالیں پیش کرتی ہے ۔ ٹینی سن (Tennyson) نے کس خوبی سے قانون تغیر و ترقی کو اپنی ایک نظم کے اس بند میں پیش کیا ہے : "قدیم نظام بدل جاتے اور جدید نظام کو اپنی جگہ دیتے ہیں ۔ اور خالق کائینات مختلف طریقوں سے اپنا منشاء پورا کرتا ہے ، مبادا کوئی اچھا رواج دنیا کو خراب نہ کر دے" ۔ پھر وہ اپنی دوسری مشہور نظم In Memoriam کے تمہیدی بند میں تمام نظامات کی بے ثباتی پر اظہار خیال کرتا ہے ، "وہ اپنے دن گذار کر ختم ہو گئے ۔ وہ تیرے ہی شکستہ انوار تھے ، اور تو اے خدائے ذوالجلال ان سے کہیں برتر و فائق ہے" ۔ جمود تمام سر بستہ نظامات قانون کا انجام ہے ۔ جب مسلمان صدیوں کی جابرانہ نسلی حکومتوں اور عام بے امنی کے باعث غیر ترقی پذیر ہو گئے تو اسلام ان کے لئے ایک محدود نظام قانون بن گیا اور فقہاء کی تعظیم مبریٰ عن الخطاء اساقفہ کی طرح کی جانے لگی ، جو اسلام کے اقتضاء کی صریح خلاف ورزی تھی ، جس نے نہ صرف اس وقت اپنی آخذیت اور اثر پذیری کو ظاہر کیا تھا جبکہ وہ ترقی پسند اور تخلیقی تھا بلکہ اس نے وضع قانون کے ایسے اصول بنائے تھے جو مسلمان مملکتوں کو حالات کے ساتھ مطابقت پذیر اور تہذیب و شائستگی میں پیش رو بنائے رکھ سکتے تھے ۔

اجماع یا ان افراد کی رائے پر اظہار خیال کے بعد ، جن کی رائے علم و کردار کے سبب شمار کی جانی چاہئے اور جو قوم کے

اقتدار اعلیٰ کے لئے وسیع گنجائش پیدا کرتا ھے اب ھم قانون سازی کے دیگر ترقی پذیر اصول اختصار کے ساتھ بیان کرنا چاھتے ھیں اور قیاس سے آغاز کرتے ھیں ، جس کے معنی تقابلی فیصله کے ھیں ۔ اس کی تعریف عمل استخراج سے کی گئی ھے ، جس سے کسی آیت کا حکم حالات پر منطبق کیا جاتا ھے ، اگرچه که عبارت ان پر حاوی نہیں ھوتی مگر استدلال کے ذریعه آیت ان کا احاطه کرتی ھے ۔ قیاس عقلی فقه کی اس ضروری اصل کو که کوئی قانون بالذات قائم نہیں ره سکتا ، تسلیم کرتا ھے ۔ یه ایسی چیز نہیں جو اپنی آپ مثال ھو ، اور یه ھمیشه کسی علت یا محرک پر مبنی ھوتا ھے ۔ فقه اسلامی میں یه ایک فنی اصطلاح ھے جس کے معنی استدلال مبنی بر قیاس کے ھیں ۔ جب ایسی صورتیں پیش آئیں جن کا احاطه مقرره آیات سے نہوسکے تو قیاس کی بنیاد پر فیصله کیا جاتا ھے ۔ خواه کتنا ھی بڑا کوئی امام یا فقیہه ھو ، ایسے فیصلوں پر قطعیت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ۔ کوئی فقیہه بھی غلطی کر سکتا یا اختلاف کر سکتا ھے اور آئنده نسلوں کے لئے اس کی ھمیشه گنجائش رھتی ھے که وه قیاسی استخراج کو نئے حالات سے اس طرح تطبیق دیں جس کو که وه زیاده معقول سمجھتی ھوں ۔ فقہا باھم اتنا ھی اختلاف کر سکتے ھیں جتنا که دیگر علماء ، اور اسلام کسی ایسی مذھبی جماعت کو تسلیم نہیں کرتا جو کامل اطاعت اور خطا سے بری ھونے کی دعویدار ھو ۔ چنانچه یه ترقی پذیر قانون سازی کے لئے نہایت وسیع گنجائش عطا کرتا ھے ۔

فقه اسلامی کا دوسرا اصول استحسان ھے ، جس کے لغوی معنی کسی قاعده کو اس کی ظاھری خوبی یا انصاف کے سبب

ترجیح دینے کے ھیں - عام بھلائی اور عدل و انصاف کے تقاضے
قانون سازی کے اصول تسلیم کئے گئے ھیں - یہ وھی چیز ھے جس
کو برطانوی ماھر قانون بنتھم نے ھر قسم کے وضع قانون کے
لئے بطور بنیاد کے تسلیم کرنے پر زور دیا ھے - افادی اصول
کو تمام اسلامی قوانین کے لئے بطور ایک اساس کے فرض کیا گیا
ھے ، اور اسلام کسی ضابطہ کو بحیثیت قانون کے حکم دینے
سے قبل اس کے شخصی اور معاشری فوائد پر اکثر بحث کرتا
ھے - حنفی اصول کے بموجب اگر قیاسی استخراج ناواجبی تکلیف
اور ضرر کا باعث ھو تو انصاف کے تقاضوں کو اس کی جگہ لینی
چاھیئے - ایک فقیہ ایسے اصول کے اختیار کرنے میں آزاد ھوتا
ھے جو بہبود عامہ کے لئے ممد اور ان عام اصولوں کے موافق
ھو جو اسلام کی روح و جوھر ھیں - تقلید پرستوں نے یہ محسوس
کیا کہ اگر اس اصول کو آزادانہ استعمال کیا گیا تو قانون
سازی کی دینی اساس خطرہ میں پڑ جائیگی - امام ابو حنیفہ کا
طریقہ تمام اھل سنت کے فقہی طریقوں میں سب سے زیادہ
آزاد خیال ھے اور صرف یہی اس اصول کو تسلیم کرتا ھے ،
ورنہ دیگر بڑے فقہا اس اصول کو ماننے سے خائف ھیں -
لیکن حنفی طریقہ نے بھی اس کو اس آزادی سے استعمال نہیں کیا
جیسا کہ وہ کر سکتا تھا - شاید اس کا سبب یہ ھو کہ وہ نہایت
احتیاط سے آگے بڑھنے کی ضرورت محسوس کرتا ھے اور یہ بھی
ھو سکتا ھے کہ بعض دفعہ قانون کا استحکام ان میں ھر وقت
کی تبدیلیوں سے زیادہ اھم ھوتا ھے - لیکن اسلامی معاشرہ جب
زندگی کے تغیر پذیر حالات سے بخوبی واقف ھو جاتا ھے تو وہ اس
بہترین اصول کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے لگتا ھے جو
قرآن کے اقتضاء اور آنحضرت ؐ کے عمل کے عین مطابق ھے -

دوسرے زبردست فقیہ امام مالک اسی کے مماثل اصول کو استصلاح کے نام سے اختیار کرتے ھیں، جو لفظ استحسان کا قریب المعنی ھے۔ اس کا مطلب قانون کا ایسا استنباط ھے جو عوام کی فلاح و بہبود پر مبنی ھو۔ اس طرح پر یہ دونوں زبردست ائمہ اسلام کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کرتے ھیں کہ عام فلاح و بہبود اور باھمی انصاف قانون سازی کی بنیادیں ھیں۔

فقہ کا ایک اور اصول جس پر حنفی طریقہ میں خاص طور پر زور دیا گیا ھے، استدلال ھے، جس کے لغوی معنی قیاسی دلیل اور استنتاج کے ھیں۔ مگر فنی لحاظ سے یہ خاصکر ان رسوم و رواج کی شناخت تک محدود رھتا ھے جو قبل اسلام قوم میں رواج پذیر تھے، یا وہ قوانین جو اسلام سے قبل نازل شدہ مذاھب کے تھے۔ اسلام کا اولین مخاطب عرب کا علاقہ تھا جس کے رھنے والوں کی زندگی کا انضباط متعدد قدیم رسم و رواج سے کیا گیا تھا۔ کوئی انقلاب کسی قوم کے طریقہ ھائے زندگی کو بالکل بدل نہیں سکتا۔ اگر کسی انقلاب نے حتی الامکان اور قابل عمل حد تک قوم کے معاشری ورثہ کا بخوبی تجزیہ کیا ھے تو وہ اسلام ھے۔ اسلام کے بعد عرب قبائل کی زندگی اپنی اصلیت میں اس حد تک بدل چکی تھی کہ وہ قبل اسلام زمانہ کو دور جاھلیت سے تعبیر کرنے لگے، اور قدیم مسلمانوں کا یہ عام دستور تھا کہ وہ زندگی کے ان دونوں طریقوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ یہ اس لئے تھا کہ قوم کے تمام سابقہ طریقہ ھائے زندگی جن کو مصلحین مناسب یا قابل عمل سمجھتے تھے بدل دیتے تھے۔ ایسے رسوم و رواج اور طریقہ ھائے زندگی جو قوم کی معاشرت میں رچ گئے ھوں ان کا بالکلیہ خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ یہ مناسب

ہے کہ انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ اقوام تسلسل اور تغیر سے پھلتی پھولتی ہیں اور بعض صورتوں میں قدامت پرستی معاشری استحکام اور خوشحالی کے لئے ایسی ہی ضروری ہوتی ہے جیسا کہ تغیر و اصلاح ۔ جو کوئی اسلام کے قانون و رواج کا موازنہ اسلام سے قبل عرب کے طریقہ ہائے زندگی سے کرتا ہے وہ صاف طور پر یہ معلوم کر سکتا ہے کہ قبل اسلام عرب کی کتنی چیزیں مسلمانوں میں باقی و جاری رہیں۔ انتہائی بدکار اور جاہل معاشرہ کے بھی تمام رسوم و روایات برے نہیں ہوتے ۔ بعض رواج اچھے، بعض برے اور بعض بین بین ہوتے ہیں۔ کسی موثر اصلاح کو بری چیزوں کا استیصال کرنا پڑتا ہے، لیکن ساتھ ہی اچھی باتوں کو قائم رکھنا بلکہ انہیں تقویت پہنچانا ضروری ہوتا ہے۔ اور جو چیزیں نہ اچھی اور نہ بری ہوتی ہیں انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ فقہا یہ رائے رکھتے ہیں کہ جو رسم و رواج اسلام کے ظہور کے وقت عرب میں مروج تھے اور جو منسوخ نہیں ہوئے وہ قانونی حیثیت رکھتے ہیں۔ دیگر اقوام کے رسم و رواج کے متعلق یہ اصول اختیار کیا گیا تھا کہ جس چیز کی اسلام میں صریحاً ممانعت نہو وہ جائز اور مباح ہے ۔ مشہور فقہی قاعدہ کے بموجب اباحت اصل اصول ہے اور جس کی صریح ممانعت نہ ہو وہ قابل قبول ہے ۔ اس قسم کی منظوری کی بناء بالآخر اجماع پر ہوتی ہے ، اور اس کو بذریعہ قیاس حاصل شدہ قوانین پر ترجیح دی جاتی ہے ۔ حنفی مذہب کے پیش نظر غیر عرب قومیں تھیں اسی سبب سے اس مذہب میں اس اصول پر خاص زور دیا گیا ہے ۔

لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قبل اسلام عرب کے رسم و رواج اور دیگر اقوام جو بعد میں مشرف بہ اسلام

ہوئے ان کے رسم و رواج میں کیوں فرق و امتیاز کیا جائے؟
آنحضرتؐ نے اسلام کے اس بنیادی اصول کی خاص تاکید فرمائی تھی کہ اسلام کسی علاقہ اور قوم سے وابستہ نہیں ہے۔ آپ نے اپنے آخری خطبہ میں اس نکتہ کو پوری طرح واضح فرمایا تھا کہ کوئی عرب غیر عرب پر ذاتی فوقیت و برتری نہیں رکھتا۔ اگر یہ صحیح ہے تو عرب کے رواجات غیر عرب رسومات پر کوئی حقیقی ترجیح نہیں رکھتے۔ برتری یا کم تری صرف افراد کے کردار میں پائی جاتی ہے۔ اسلام کسی نسلی یا قومی تفوق کو تسلیم نہیں کرتا۔ اقوام میں رواداری کے اہم اصول کے مطابق تمام قوموں کے طریقہ ہائے زندگی اور رواجات کا احترام کرنا چاہئے، بشرطیکہ وہ اسلام کے بنیادی اصول کے معارض نہ ہوں۔ استدلال قومیت کے اصول کو صرف اس مفہوم میں تسلیم کرتا ہے جو اسلام کے نزدیک قابل پذیرائی ہیں۔

اسلامی مملکت اور اس کے فقیہانہ اساسی اصول کا جائزہ لینے کے بعد ہم دینی حکومت بمقابلہ دنیوی حکومت کے مسئلہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں، کہ غیر معین اصطلاحات کسی نتیجہ پر نہیں پہنچاتیں۔ دنیا میں ہر قسم کی دینی حکومتیں اور ہر رنگ کی دنیوی حکومتیں رہ چکی ہیں۔ اور ان کے اضافی تشخص کا انحصار بالآخر ان کے نظام فکر پر ہونا چاہئے۔ تقریباً تمام مملکتیں، صرف یونانی شہری مملکتوں کو مستثنیٰ کرکے، کسی نہ کسی نوعیت کی دینی مملکتیں تھیں۔ تمام ہندو تہذیب اور سیاست مذہبی نوعیت کی تھی۔ یہودی مملکت بھی دینی ریاست تھی۔ اگرچہ گوتم بدھ اور حضرت عیسیٰ کسی نے بھی مملکت کے قیام کیلئے کوئی اساس عطا

نہیں کی تھی لیکن اشوک نے اپنے طرز حکومت کی بنا بدھ متی اصول پر رکھی ، اور جب عیسائیوں کو دنیوی اقتدار حاصل ھوا تو انہوں نے ایک وسیع دینی مملکت کی بنا ڈالی ، جس میں روحانی اور دنیوی دو شمشیریں ایک ھی صاحب اقتدار ھستی کے دست تصرف میں فرض کی جاتی تھیں - تمام عیسائی سلاطین کو پوپ کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا تھا ، جو عیسائی قانون سازی کا نقائص سے مبرا ماخذ بن گیا تھا اور جو عیسائیوں کی زندگیوں سے لے کر ان کی طرز و روش کے جزئیات تک کے انضباط کا دعویدار تھا - مغرب میں مملکت اور مذھب کے درمیان آویزش کی ایک بوقلموں تاریخ رھی ھے - مذھب ایسا دشمن تحقیق اور رجعت پسند بن چکا تھا اور ایسی ناپاک تحریکات کا حامل رہ چکا تھا کہ اعتدال پسند انسانیت جو ضمیر کی آزادی اور باھمی انصاف کی متقاضی تھی ، اس دینی مملکت کے سخت گیر پنجوں سے مخلصی کی آرزو مند تھی - مذھبی غلبہ و تسلط کا دور اس عہد سے ھم زمان رھا ھے جسے قرون مظلمہ سے تعبیر کیا جاتا ھے - یورپ نے آزادی کا سانس اس وقت لینا شروع کیا جب مذھب کی مضبوط گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی - منظم مذاھب اور پجاری ، جو خود کو مذھبی انجمنوں اور استحقاق یافتہ پیشوایان مذھبی کی جماعتوں میں تشکیل دے چکے تھے ، ھمیشہ انسانیت کی آزادانہ ترقی میں ھارج ھوتے رھے - عقل کا پرستار یورپ اپنے علوم کی ترقی اور زندگی کی آزادانہ تنظیم اس وقت کر سکا جبکہ مذھب اور سلطنت میں جدائی پایۂ تکمیل کو پہنچی - انقلاب فرانس میں کلیسا کے خلاف شدید غیظ و غضب تھا اور عامۃالناس عقل اور اصول حریت ، اخوت اور مساوات کی حکمرانی چاھتے تھے - انقلاب

روس میں بھی ہم دہریت کا زور اور خدا کے خلاف ایک مہم کو سرگرم عمل دیکھتے ہیں۔ یہ تمام مخالف اثرات در اصل حق بجانب تھے، کیونکہ کلیسا ہمیشہ مطلق العنانی اور معاشری ناانصافی کا طرفدار رہا اور ایک طبقہ پر دوسرے طبقہ کے تسلط کی حمایت کرتا رہا۔ لیکن مذہب سے آزادی حاصل کرنے میں مغرب کے فائدے خالص خوبی ثابت نہ ہوئے۔ اٹھارویں صدی کی ترقی یافتہ قومیت نے کیتھولک مرکزیت اور کلیسا کے تسلط کی جگہ لے لی۔ مذہب نے ان سے کہا تھا کہ وہ آخرت پر نظر رکھیں اور اس دنیا کو دولت مندوں اور استحقاق یافتوں کے فائدے کے لئے چھوڑ دیں جن کو آسمانی سلطنت میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائیگی۔ لیکن اب قومیت نے اپنی دنیاداری میں مذہب کے غلط تصور کے بجائے دولت کے بت کی پرستش شروع کردی اور دولت کا دیوتا اس دیوتا سے بھی زیادہ خراب ثابت ہوا جسکی پرستش پر مذہب انہیں مجبور کرتا تھا۔ دنیوی مملکتیں اپنے مزدوروں کا خون چوسنے اور ان کے حقوق غصب کرنے کے لئے تجارتی مسابقت میں داخل ہوئیں، اور اس کے عوض انہیں معاشی استحصال اور تنخواہ دار غلامی کے ساتھ نام نہاد سیاسی عمومیت عطا کی۔ دنیویت نے کھل کھیل کر زر اور زور کی پرستش شروع کر دی۔ سائنس بنانے والے کو نفع پہنچائے بغیر صرف پیداوار میں اضافہ کرتی رہی۔ دنیوی مملکتوں کا نصب العین زیادہ منڈیاں، زیادہ مستعمرات، اشیائے خام اور ارزاں محنت کے لئے شور و پکار کرنا تھا۔ اخلاقیت کے دو معیار بن گئے۔ تمام اخلاقی اقدار اپنے محدود معاشری حلقوں میں صرف افراد کے لئے تھے۔ یہ مسابقت کرنے والے سرمایہ داروں یا سرمایہ

اور محنت کے درمیان معتبر نہ تھے - دنیوی مملکتیں معاشیات میں
عدم مداخلت کے اصول پر عمل پیرا تھیں - سرمایہ کی منفرد
سرمایہ دار اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں پرستش کرتے تھے ، اور
معاشی اقتدار جس کی پشت پر آلات حرب تھے ہر قسم کی دنیویت
کا قومی محرک اور خیر اعلیٰ بن گیا تھا - ریاستیں مذہب سے
چھٹکارا پا کر ، جو آزادانہ ترقی کی راہ میں روکاٹوں کا سر چشمہ
تھا ، طاغوتی ہوس اقتدار کا شکار ہو گئی تھیں - قومیت اور
وطنیت کو طبقات سے فائدہ اٹھانے یا مملکت کو تقویت دینے کی
غرض سے کام میں لایا جاتا تھا ، اور یہ خدا کے بجائے موضوع
پرستش بن چکی تھیں - علاج بیماری سے زیادہ مہلک ثابت ہوا -
اور مغربی اقوام رجعت پسندانہ دینی مملکت کی مصیبت سے نکل
کر اقتدار کی خاطر اقتدار ہی کی آتش فروزاں میں کود پڑیں -
جس مقام کو خدا نے چھوڑ دیا تھا وہاں طاغوت براجمان ہوگیا -

مملکت جس کو مراعات یافتہ جماعتیں بطور دھوکہ کی ٹٹی
کے استعمال کرتی تھیں ، اس کی پرستش کی تائید ہر قسم کے
نظریات اور تصورات سے کی گئی - ہیگل نے مملکت کو بڑھا
چڑھا کر ذات مطلق کا ایک اعلیٰ ظہور بتلایا - فشتے نے
جرمن قوم کے خدائی منصب کی تبلیغ کی - نٹشے نے اقتدار
کو بنیادی قدر بتلایا - ڈارو ینی ارتقائیت کو تنازع للبقاء اور
بقائے اصلح کے لئے بطور عقلی تائید کے ایک سہل نسخہ
ہاتھ آیا - افراد اور مملکت کے درمیان بے رحم و بے اصول
مسابقت کا پرچار نہ صرف بے بصر میکانی فطرت کے قانون کی
حیثیت سے کیا گیا بلکہ اس کو انسانیت کی اصلاح کے لئے خدائی
منصوبہ کے اصول کی طرح سمجھا گیا - کمزور سے فائدہ اٹھانا
جائز بن گیا - مملکتوں کے لئے طاقت ہی وہ چیز تھی جو تمام

حقوق پیدا کرتی تھی -

اقتدار کے اس شور و ھنگامہ میں مسلمان مملکتیں دب کر رہ گئیں - قومیت اور سرمایہ داری کا وجود مسلم سوسائٹی میں کبھی نہ تھا اور جو زبردست خلاف عقل محرکات ان کی بدولت انسانیت پر پھوٹ پڑے تھے وہ اسلام کے مزاج کے بالکل ناموافق تھے - مسلم مملکتوں میں مطلق العنان شاھیاں پوری طرح رو بہ تنزل ھو چکی تھیں - یہ غیراسلامی مملکتیں تھیں جو نہ تو اپنے آپکو اسلامی نمونہ پر ڈھال سکتی تھیں اور نہ عملی سائنس اور صنعتی نظام کے ذریعہ فائدہ اٹھا سکتی تھیں - یہ صرف ظاھری شکل اور زبانی دعوے میں مذھبی حکومتیں تھیں مگر فی الحقیقت جابرانہ اور غیر اسلامی تھیں - یہ نہ اسلامی مفہوم میں دینی حکومتیں تھیں اور نہ دنیوی مفہوم میں اقتدار پرست مملکتیں تھیں - انہیں دونو جہان میں خسران نصیب ھوا -

اس عام جمود میں عالم اسلامی کے اصحاب فکر و نظر حیران تھے - صدیوں تک یہ محض بے حسی کے بل پر زندگی گذارتے رہے لیکن اب وہ پوری طرح جھنجھوڑے جا چکے تھے - انہوں نے نہ تو دنیوی افکار کو طاقت و اقتدار کی اس مسابقت میں حصہ لینے کے لئے ترقی دی اور نہ یہ اسلامی اتحاد و یکجہتی کے حامل تھے جو ان میں اخلاقی قوت اور معاشری ارتباط پیدا کر سکے - ترقی پذیری میں اس کوتاھی کے سبب خود اسلام کو اس کے مخالف نکتہ چین متہم کرنے لگے - اسلامی مفکرین نےبھی اس مرض کی مختلف تشخیص کی اور مختلف علاج اس کے لئے تجویز کئے - بعض نے خیال کیا کہ مغرب کی اندھا دھند تقلید انہیں مغربی ممالک کے ساتھ ایک سطح پر لا کھڑا کریگی - ان کا خیال تھا کہ اسلامی

معاشیات اور سیاسیات میں چند بنیادی تبدیلیاں ضروری ہیں ، اور انہیں ترقی پسند قوموں کے دوش بدوش چلنا چاہئے ۔ انیسویں صدی کی سائنس کے مطابق مذہب کو عقلیت کا رنگ دینا چاہئے ۔ اور مملکتوں کو دینوی رنگ اختیار کرنا چاہئے ۔ دوسرے ایسے لوگ تھے جو مخلصانہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اسلام کے بنیادی اصول صحت پر مبنی ہیں اور ایک مستحکم مملکت اور انصاف پسند انسانیت کی تخلیق کے لئے ضروری ہیں ۔ اسلام نہ صرف حکمیاتی تحقیق اور زندگی پر اسے منطبق کرنے سے نہیں روکتا بلکہ اپنے اصلی مزاج کے لحاظ سے مسلمانوں پر کائینات کا مطالعہ فرض قرار دیتا ہے تاکہ وہ اس کو اپنے قابو میں لائیں ۔ یہ لوگ اس کا بھی یقین رکھتے تھے کہ قومیت اور سرمایہ داری میں کچھ نہ کچھ بالذات خرابی موجود ہے اور جن قوموں نے ان تصورات پر زندگی بسر کی وہ تباہی کی طرف بڑھتی رہیں ۔

مسلمان ریاستیں مغربی طاقتوں سے مغلوب ہو چکی تھیں اور یہ سب بالواسطہ یا بلا واسطہ ان کے اشاروں پر چل رہی تھیں ۔ داخلی انحطاط انہیں پہلے ہی سے کمزور کر چکا تھا ۔ بیرونی اقتدار سے ان کی قسمتوں کی وابستگی نے آزادی خیال و عمل پر مزید پابندی عائد کر دی تھی ۔ زبوں حال مذہبی حکومت ایک حد تک ان کی کمزوری کا باعث تھی ، مگر تمام و کمال یہی اس کا سبب نہ تھی ۔ یہ حقائق پر اپنی گرفت کھو چکے تھے ۔ دو عظیم جنگوں نے تمام دنیا کو بیخ و بنیاد سے ہلا دیا اور ایک عام بیداری کا امکان پیدا کردیا ۔ یورپین طاقتوں کے تصادم نے انہیں سانس لینے کا موقع دیا ، اور مقابلةً فکر و عمل کی آزادی ہاتھ آئی ۔ بعض مسلمان ریاستیں سیاسی

حیثیت سے آزاد ہو گئیں۔ بعض ریاستوں نے ایک حد تک اپنے معاملات پر قابو پا لیا ۔ اور بعض دیگر ریاستیں ہنوز سامراجی قوتوں سے مصروف کشاکش ہیں، جو کسی طرح اپنی گرفت ڈھیلی کرنے پر رضامند نہیں۔ لیکن لیک حد تک سیاسی اور معاشی لحاظ سے یہ ہنوز مغربی اقوام کی سیاسی کشمکش میں الجھی ہوئی ہیں ۔ صرف ترکی نے اپنے دنیوی حکومت ہونے کا اعلان کیا ہے اور دوسری ریاستیں دینی اور دنیوی میں باہم مصالحت کے لئے کوشاں ہیں۔

دو متصادم تصورات میں دنیا کی تقسیم نے ہر قوم کے لئے نئے مسائل پیدا کر دئے ہیں۔ ایک طرف سرمایہ دارانہ عمومیت ہے اور دوسری طرف اشتمالیت۔ اس وقت ہر مملکت کسی ایک کے انتخاب پر مجبور ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہر مملکت کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کسی ایک یا دوسرے گروہ کے ساتھ صف بستہ ہو جائے۔ تمام مسلمان ملکوں کے اصحاب فکر و نظر کو ان متبادل صورتوں کی بابت گہری فکر پیدا ہو گئی ہے۔ کیا مسلمان خود کو کسی ایک یا دوسرے کے ساتھ صف بستہ کرلیں، یا ان کے پاس خود اپنی کوئی تیسری متبادل صورت ہے؟ کیا اسلام مثل ایک بے زبان جانور کے ھنکایا جائے یا خود اس کی امتیازی سرشت میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو تیسرا طریق زندگی تجویز کر سکے؟ انگریزی۔ امریکی عمومتین عیسائی تصورات سے راہ یاب ہونے کی دعویدار ہیں۔ اور ان کے ممتاز قائدین نے حال ہی میں اس امر پر خاص زور دینا شروع کیا ہے تا کہ وہ اشتمالیت سے اس کا موازانہ کرسکیں۔ لیکن رہنمایان مغرب اذعانی اور غیر استدلالی عیسائیت پر ایمان لانا ترک کر چکے ہیں، اور جب وہ عیسائی تصورات کا

ذکر کرتے ہیں تو اُن کا مطلب صرف غیر معین محبت اور خیر خواہی کے اصول سے ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ اس کی تعریف بھی کرنی نہیں چاہتے۔ کیونکہ یہ چیز انہیں سخت مشکلات میں الجھا دیگی۔ تمام دوسرے افراد کی طرح یہ اس کو گول مول رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ ہر کوئی اپنی پسند کے مطابق اس کو معنوی رنگ دے سکے۔ یہ دینی مملکت ہونے کی تردید تو کرتے ہیں، کیونکہ مغرب میں دینی حکومت کافی بدنام اور رسوا ہو چکی ہے، لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی دنیوی عومتیں عیسائی تصورات سے فیضیاب ہیں۔

اشتمالیت بالکلیہ دنیوی اور علی الاعلان خدا کی منکر ہے۔ اس نے محنت کے ثمرات کو زیادہ مساوی طور پر تقسیم کرنے کے لئے ایک معاشی تعمیر نو کا پروگرام آغاز کیا، لیکن ابتداء ہی سے اس کا انداز مخالف مذہب رہا۔ روس میں مذہب زاریت کا رفیق اور شخصی حکومت اور طبقاتی مراعات کا حامی تھا۔ رجعت پسند عیسائی مذہب کے خلاف رد عمل نے عام مذاہب کے خلاف نفرت و بیزاری کی صورت اختیار کر لی۔ روس میں مذہب اس مفہوم میں آزاد ہے کہ عوام جو چاہے عقیدہ رکھ سکتے ہیں اور چرچ یا مسجد جانے میں آزاد ہیں، لیکن تعلیم کے رجحان اور حکومت کی تائید سے دھریت کی تلقین نے ایک ایسی نسل پیدا کر دی ہے جس کے لئے حقیقت صرف معاشیات اور عملی سائنس پر مشتمل ہے۔ پوری زندگی پیداوار اور تقسیم کے گرد گھوم رہی ہے۔ اور اشتمالیت کی مدافعت حقیقی اور امکانی دشمنوں کے خلاف کی جا رہی ہے۔ جن لوگوں کے دست نصرت میں عنان اقتدار ہے ان کی حقیقی زندگیوں میں مذہب کا کوئی مقام نہیں۔ اشتمالی جماعت حکومت

پر قابض ہے اور ایک پکے مذہبی آدمی کے لئے اس جماعت میں داخل ہونا ایسا ہی دشوار ہے جیسا کہ سوئی کے ناکہ سے اونٹ کا نکل جانا۔ اس طرح پر فی‌الواقع کوئی مذہبی آزادی نہیں ہے، اور اگر کوئی حکومت کے کاموں میں کسی اقتدار و اثر کا آرزو مند ہوتا ہے تو اسے تمام روحانی حقائق سے بے اعتقادی کا اعلان کرنا پڑتا ہے۔ اشتمالی معاشیات ایک ایسا محور بن چکی ہے، جس کے گرد تمام انسانی زندگی کو گھومنا پڑتا ہے۔ یہ ایک تاریخی سانحہ ہے کہ معاشی تعمیر نو اور معاشری عدل، جو ممکنہ حد تک اور زیادہ سے زیادہ مواقع کی برابری کے حامی رہے ہیں وہ اس طرح کاملاً خلاف مذہب نظریات سے گھل مل جائیں۔ کیا اشتمالی یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا پر، بقائے حیات پر اور ماورائے محسوسات پر ایمان لانے والے کے لئے اصلاً یہ ناممکن ہے کہ وہ معاشری عدل اور سب کے لئے یکساں مواقع فراہم کرسکے؟ کیا تمام انبیاء و اولیاء سرمایہ داری اور نظام جاگیری کے حامی تھے یا انہوں نے کبھی ایک جماعت پر دوسری جماعت کے تسلط کا پرچار کیا تھا؟ کیا وہ راہ حق میں جان دینے والے اور باہمی عدل اور عالم گیر انسانی محبت کے لئے لڑنے والے نہ تھے؟ اگر خدا پر ایمان، حق و انصاف میں مانع ہونے کے بجائے ظلم کے خلاف احتجاج کے لئے طاقت کا سر چشمہ تھا تو پھر دہریت باہمی عدل کے لئے ایک ناگزیر شرط کیوں سمجھی جائے۔

ان متصادم تصورات ہی کو دو متبادل صورتوں کی طرح دنیا کے روبرو پیش کیا گیا ہے۔ گویا کہ ان دونو نے باہم ملکر زندگی کے جملہ منصوبے ختم کردئے ہیں۔ لیکن اسلام دونوں میں سے کسی کو بھی پسند نہیں کر سکتا۔ وہ معاشی تعمیر نو اور معاشری عدل کا خود اپنا امتیازی منصوبہ رکھتا ہے۔

قرآن میں مسلمانوں کو امت وسطیٰ کہا گیا ہے جو ہمیشہ وسط یعنی خیرالامور کو پسند کرتے ہیں۔ اسلام سرمایہ داری کی تائید نہیں کرتا اور انفرادی ہاتھوں میں سرمایہ کے اکتناز کی ممانعت کرتا ہے۔ قانون کلانیت کو ممنوع قرار دیکر وہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد پر کاری ضرب لگاتا ہے جو جاگیروں کی تخلیق و تحفظ کرتا تھا۔ وہ سود پر زندگی بسر کرنے کی ممانعت کرتا ہے جو تمام سرمایہ داری کی اصل جڑ ہے۔ وہ مفاد عامہ کے امور، خواہ وہ تغیر پذیر حالات میں کوئی سی بھی شکل اختیار کریں، مملکت کے اختیار میں دیتا ہے۔ وہ شخصی حکومت کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ بحیثیت ملائی تنظیم کے کسی مذہبی انجمن کے قیام کا نقشہ ذہن میں نہیں لا سکتا۔ وہ عاقل و عادل اشخاص کی مجلس کے ذریعہ حکومت کا حکم دیتا ہے۔ وہ افراد کو اپنے طور پر راستبازانہ تجارت اور محنت کے ذریعہ روزی حاصل کرنے کی وسیع گنجائش عطا کرتا ہے۔ وہ حکومت کے ذریعہ تمام کاروبار اور تجارت کی اجارہ داری کو اپنے تصور و ذہن میں نہیں لاتا، اور نہ وہ حکومت کو ان تمام امور کو اپنے ہاتھ میں لینے سے روکتا ہے جو عام فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہوں۔ وہ سب کو ضمیر کی آزادی عطا کرتا ہے اور اختلاف رائے کو قدر کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ بلا امتیاز نسل و مذہب ایک مسلم مملکت کے تمام شہریوں کو مساوی حقوق عطا کرتا ہے۔ وہ فطری ناہمواریوں کو تسلیم کرتا ہے اور اس کا قول ہے کہ تمام انسان مساوی خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ایک درجہ میں پیدا نہیں کئے گئے، لیکن وہ ذات، طبقے، اور نسل کی حد بندیاں قائم نہیں کرتا۔ خیرات کے ذریعہ وہ ناداروں کو

مالداروں کی فاضل دولت کا ایک حصہ پیش کرنا چاھتا ھے۔
امت وسطیٰ اس مفہوم میں دینی حکومت نہیں ھے جس مفہوم
میں کبھی کسی مذھبی حکومت کا وجود رھا ھو۔ بلکہ وہ دینی
حکومت صرف اس مفہوم میں ھے کہ وہ خدا کو معاشری عدل
کا سر چشمہ اور کفیل یقین کرتی ھے، اور اس پر اعتقاد
رکھتی ھے کہ عدل و انصاف اور انفرادی و اجتماعی خوشحالی
کے بنیادی اصول اللہ کے بنائے ھوئے اور ابدی صداقت کے حامل
ھیں۔ قرآن ایک عادل خدا پر ایمان اور اساسی خوبیوں کی
اعمال نیک میں صورت پذیری لوازم مذھب قرار دیتا ھے۔
دیگر دینی حکومتیں رسومات اور مذھبی عقیدوں پر مبنی
ھیں اور شہری حقوق کے معاملہ میں ان لوگوں کے خلاف امتیاز
برتتی ھیں جو ان اعتقادات کو نہیں مانتے۔ تمام بڑی اسلامی
مملکتوں میں ھمیشہ ایسے غیر مسلم موجود رھے ھیں جو حکومت
میں متعدد اھم خدمات پر فائز تھے۔ ایک سچی مسلمان مملکت
دنیوی حکومت کے تمام اعلیٰ صفات، بجز جدید مفہوم میں
دنیوی ھونے کے، اپنے اندر رکھتی ھے۔ یہ بغیر کسی تنگ نظری
کے، جو بالعموم مذھبی حکومتوں کا خاصہ ھوا کرتی ھے، ایک
حکومت الٰہی ھوتی ھے۔ ایک حقیقی اسلامی مملکت مفید دنیویت
کو مذھبی حکومت کے ساتھ ملا دیتی ھے، جیسے کہ اسلام نے
مختلف اوصاف کو جنہیں دنیا متضاد اور بے جوڑ سمجھتی تھی،
بہم آمیز کیا تھا۔ اس دنیا اور آنے والی زندگی کے درمیان جو
خلاء تھا اسے اسلام نے کامیابی کے ساتھ پر کیا۔ مذھب کو
آسمان سے زمین پر اتارا گیا، اور زندگی کی تعریف یہاں اور
آخرت میں کھیت بونے اور کاٹنے کے مثل کی گئی۔ بطور
طریق زندگی کے محض آخرت پرستی سے انکار کیا گیا کیونکہ

پہلی خوشحالی و کامرانی یہاں اس دنیا کی زندگی میں حاصل کرنی ہے۔ تمام حقیقت ایک ہے، اور یہ دنیا اپنی تحت و فوق کی دنیاؤں سے از روئے حیات مربوط ہے، کیونکہ تمام عالموں کا صرف ایک خالق ہے۔ یہ تمام دنیائیں ایک دوسرے کے ساتھ اعتدال اور موزونیت کی سنہری زنجیر سے باہم مرتبط ہیں۔

فی الحقیقت تمام تصورات ایک مابعد الطبیعی پس منظر رکھتے ہیں۔ فطرت، یا مادیت، یا مسلک علوم طبیعی حقیقت اولیٰ کے بیان میں ایسے ہی مابعد الطبیعی ہیں جیسے کہ کوئی مذہب جسے آخرت پرست یا فوق العقل ہونے سے متہم کیا گیا ہو۔ صرف مذہب کو ایک دینی تصور پیدا کرنے کا الزام کیوں دیا جائے، جب ہم خود اپنی آنکھوں کے سامنے ان نظامات کو دیکھتے ہیں جن کا ظہور ہوس اقتدار، یا معاشی تعمیر نو، یا حکمیاتی بین مظہری تاویل و بیان میں ہوتا ہے، اور بالآخر جن کی تشکیل ایسے مذاہب میں ہوتی ہے، جو کل زندگی کی ہدایت و وضاحت کی جسارت کرتے ہیں۔ کوتاہ نظری ایسا عیب نہیں جو صرف دینی نظام سیاست سے پیدا ہوتا ہو۔ غیر مذہبی تصورات بھی جو موجودات کی آخری تشریحات مانے جاتے ہیں متشدد، متعصب، خلاف عقل اور تنگ نظر بن جاتے اور خود اپنے طور پر الزام لگانے اور سزائیں دینے لگتے ہیں۔ انسانی ترقی اور معاشری خوشحالی کا ضروری عنصر عقیدہ کی آزادی ہے۔ معاشرہ میں ایذا رسانی اور محض عقائد کے اختلافات کی بناء پر تعذیب نہ ہو۔ مغربی عمومیتوں نے تشدد کی مہم کا آغاز ان لوگوں کو اذیت پہنچانے کے لئے کیا تھا جو یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ معاشری

اس ابتری کو دور کرنے کے لئے اشتمالیت کسی نہ کسی صورت میں ضروری خدمات انجام دے سکتی ہے، جس میں کہ تمام مغربی عومتیں مبتلا ہیں۔ چنانچہ وہ اشتمالیت کو انسانی حقوق کا غصب کرنے والا اور اختلاف عقائد کو برداشت نہ کرنے والا عقیدہ ہونے کا اتہام لگاتے ہیں۔ یہ گویا اپنے عیوب کی پردہ پوشی کے لئے دوسروں کی عیب جوئی کرنا ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کے خوف سے سہمے ہوئے ہیں، اور اس سے مجنونانہ تعصب و تشدد پیدا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا اسلام ان دونوں صورتوں میں کسی کو بھی قبول نہیں کرتا۔ اگر وہ انسانیت کی کوئی حقیقی خدمت کرنی چاہتا ہے تو اس کو خود اپنے طریقوں کا تجربہ کرنا چاہیئے۔ اگر مسلمان مخلص اور مستعد ہیں تو بہتر طریقہ بتلا سکتے ہیں، کیونکہ انہیں ایک بہتر راستہ دکھلایا جا چکا ہے۔

اسلام کے تصورات نہایت سادہ اور انتہا درجہ عقلی ہیں۔ وہ نہ تو یہ چاہتا ہے کہ تمام انسانیت میکانی مادیت کو مانے جس کی قلبی ماہیت ایک قسم کی تصوریت کی صورت میں ہو رہی ہے یا جھجکتے ہوئے فلسفیانہ خدا پرستی کی طرف بڑھ رہی ہے، اور نہ وہ مارکس اور لینن کی منطقی مادیت کی حمایت کرنا چاہتا ہے، جو قدیم مذہبی حکومتوں کی طرح نہ صرف پیداوار اور تقسیم کے طریقوں میں تبدیلیوں کی توجیہ و تاویل کی جسارت کرتے تھے بلکہ ہر چیز علم کائنات، حیاتیات، علوم طبیعی، فنون اور اخلاقیات میں بھی دخل در معقولات کرتے تھے۔ مذہبی حکومتیں اکثر اس مفروضہ کے تحت علم کی ترقی میں مزاحم ہوتی رہیں کہ وہ کتاب پیدائش کے ذریعہ ثوابت و سیار کی سیر و گردش سے لیکر نباتات کی نمو و بالیدگی

کے قوانین تک سب کچھ جانتے تھے ، اور اس زعم میں مبتلا تھے کہ وہ انسانی زندگی کی ان پوری تفصیلات میں رہنمائی کر سکتے ہیں ۔ لیکن کیا غیر مذہبی خیال پرست بھی یہی چیز مختلف درجات میں نہیں کر رہے ہیں ۔ نازیت ، فاشیت ، اشتمالیت ، اور اہل ثروت کی عمومیت بھی ایسی ہی کٹر اور متشدد ہیں جیسے کہ کوئی ایسا مذہب جس نے طاقت کے ذریعہ انسانی حقوق کو کچلا ہو ۔ اسلام کا ایک معین نظریۂ حیات ہے ۔ اور اس کی صداقت پر اسے یقین کامل ہے ۔ لیکن وہ بزور و طاقت دیگر نظریات کو کچلنے کی ممانعت کرتا ہے ۔ تمام تاریخ میں شروع سے آخر تک، وحشی قبائل سے لیکر پوری طرح منظم تہذیبوں تک ، مذہب تقریباً زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی رہا ہے ۔ جب قرآن نے اس اصول کا اعلان کیا کہ مذہب میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہونا چاہئے تو اس نے فی الحقیقت ہر قوم اور ہر مذہب کے تمام طریقہ ہائے زندگی کو ایک منشور آزادی عطا کردیا تاکہ ایک دوسرے کے مذہب کا باہمی احترام کیا جائے ۔ ہم نے اس سے قبل قرآن کی آیات سے استناد کیا تھا جس میں کمزوروں اور مظلوموں کی مدافعت اور مذہبی ایذا رسانیوں کے خاتمہ کے لئے راستبازانہ جنگ کی ضرورت پر بحث کی گئی ہے ۔* ”لڑو ! یہانتک کہ ظلم و زیادتی کا خاتمہ ہو جائے“ ۔ ”عورتوں ، بچوں ، اور کمزوروں کی حفاظت کے لئے جہاد کرو“ ۔[۱] ”اگر خدا بعض لوگوں کو ظالموں سے لڑنے کے لئے نہ ابھارتا تو رہبانوں کی خانقاہیں ، گرجے ، صومعے ، اور مساجد جن میں

* ومالکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ و المستضعفین من الرجال و النساء والولدان — النساء ۔ ۷۸

کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے تباہ و برباد ہو جاتے"۔*
اگرچہ کہ مسلمانوں کو اسلام کی تعلیم دی گئی تھی لیکن مساجد کی حفاظت کا ذکر پہلے نہیں آخر میں کیا گیا۔ اس آیت میں ظلم و زیادتی کو کچلنے کے لئے جہاد کا صریح حکم دیا ہے، خواہ اس کا شکار دوسرے مذاہب ہی ہو رہے ہوں۔ کیونکہ کسی ایک مذہب پر ظلم و ستم کو اگر نہ روکا جائے تو تمام مذاہب کو ستانے کا سبب بن جائیگا۔ قرآن کہتا ہے کہ ظالم سے اس وقت تک لڑو کہ وہ شکست کھا جائے یا مطیع ہو جائے اور صلحنامہ کرکے دوسروں کے ساتھ با امن زندگی بسر کرے۔ اسلام کا بین الاقوامی نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ وہ مختلف تصورات کو اپنے طریقوں پر چلنے کی اس شرط پر اجازت دیتا ہے کہ ظلم و زیادتی نہ ہونے پائے۔ اسلام یہ ملحوظ رکھتا ہے کہ مختلف معاشی، معاشرتی اور مذہبی نظامات باہمد گر امن و عافیت سے زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ کسی مذہب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بزور شمشیر دوسروں کو مجبور کرے۔ حریت تمام مادی، عقلی، اخلاقی اور روحانی اقدار کی اساس ہے۔

یہ ہے اسلام کی مذہبی حکومت، جس کے معین نظریات و اصول ہیں جن سے زندگی کا انضباط ہوتا ہے۔ اس کے ایمان کی بنیاد ایک خدا پر ایمان ہے، جس کی یکتائی کا ظہور کائینات کی یک رنگی ہے۔ ہر علم آزاد ہے اور علم کی جستجو ایک فرض ہے۔ تمام علوم کی رہنمائی زیادہ سے زیادہ موجودات میں یکرنگیوں کی دریافت اور ان کے باہمی تعلقات اور عجائبات فطرت کے

* ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بیع و صلوات و مسجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا — الحج ۴۰

تصرفات کی طرف ہونی چاہئے۔ اس لئے اسلام نے حکمیاتی تحقیق کو مخلوقات میں خالق کی تلاش کے مماثل قرار دیا ہے۔ مافوق فطرت مداخلتوں سے خدا کی بہتر طریقہ پر جلوہ افروزی نہیں ہوتی۔ فطرت کے عام مظاہر، ان کے انضباط اور زندگی کے تحفظ و اصلاح کے لئے ان کے کام کو خدا کی زبردست نشانیاں بتلایا گیا ہے۔ بڑا روحانی انسان وہ ہے جو ان پر زیادہ غور کرتا ہے، کیونکہ اس طرح مطالعہ کرنے سے موجودات کے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ عام اور ظاہر چیزوں کو ان معجزات سے، جن کا کہ لوگ تقاضہ کرتے ہین، زیادہ یقین آفرین ہونا چاہئے۔ موجودات کو متحد اور ان کی حفاظت کرنے والی ذات پر ایمان، صرف یہی ایک اعتقاد ہے جس کو اسلام صداقت اور سچے مذھب کی روح سمجھتا ہے۔ اور فلاح اور بہبود کے اقل ترین تقاضہ کی حیثیت سے اس کو اعمال نیک کے ساتھ اکثر بیان کرتا ہے۔ لیکن نیکی بنیادی ایمان کے ساتھ بجائے خارجی طور پر پیوست ہونے کے اس کا ایک ضمنی نتیجہ ہے۔ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ خدا کی وحدانیت پر ایمان ایک انسان کی نجات کے لئے کافی ہے۔ اس پر آپ کے ایک صحابی حضرت ابوذر رض کو حیرت ہوئی تھی کہ مذھب اس قدر اقل ترین حد تک مختصر ہو سکتا ہے۔ اس سے آنحضرت صلعم کا مطلب ایمان کا وہ درجہ ہے جس کو سقراط نے نیکی کے علم صحیح اور معقول ہونے سے متصف کیا ہے اور جس کا ثمرہ اعمال نیک کی صورت میں ظاہر ہونا ضروری ہے، بشرطیکہ کوئی نفس بالکل اس رنگ میں رنگ جائے اور اس کے ساتھ گھل مل جائے۔ قرآن نے دل کھول کر دیگر مذاھب کے ان پیرووں کی تعریف کی ہے جو یہ لوازم رکھتے

ھیں ، اور جو ایک خدا پر ایمان لاتے ، اور اپنی زندگیوں میں انصاف پسند اور نیک ھیں - یہودی ، عیسائی اور صابی تک اس میں شامل ھیں اور اگر وہ یہ اوصاف رکھتے ھیں تو وہ نجات یافتہ اور خوف وحزن سے دور ھیں -

اس بنیادی اصول کو بیان کرکے اسلام مطمئن نہیں ھو جاتا بلکہ وہ اس اصول کو حقیقی زندگی پر منطبق کرتا ھے اور اس پر عمل کا طریقہ بتلاتا ھے - اسنے مسلمانوں کو معیاری مملکت کا تصور اشتراکی اور جمہوری طرز کا عطا کیا ھے ، لیکن اس کی اشتراکیت اور عمومیت مغربی عمومیتوں سے کئی اعتبارات میں مختلف قسم کی ھے - وہ منطقی مادیت کو تمام حقائق کے قطعی جواب اور خدا کے قائم مقام کے طور پر قبول نہیں کرتا - وہ معاشی حیثیت سے معاشرہ کو ایک سطح پر لانے کے لئے فاضل دولت کو حاصل کرتا اور تمام قوم پر اسے تقسیم کرتا ھے - وہ تمام شہریوں کو ، اگر وہ بنیادی اصول اور معاشری عدل کی خلاف ورزی نہ کریں ، ضمیر کی آزادی عطا کرتا اور ان کے طریقہ ھائے زندگی کا احترام کرتا ھے - وہ تمام علوم کو حاصل کرنے کی آزادی دیتا اور پیشہ ور مشائخ یا منظم مذھبی جماعت کو نہیں مانتا ، اس لئے مذھب اور حکومت میں اختلاف کے مسائل رونما نہیں ھو سکتے - قانون سازی کے لوازم تو قرآن کے بنیادی اصول اور سنت رسولؐ سے اخذ کئے جاتے ھیں، ورنہ قانون سازی کا وسیع میدان بے روک ٹوک کھلا چھوڑ دیا گیا ھے تاکہ اصحاب علم و رائے ، جو حالات کی حقیقتوں سے واقف اور اندازہ شناس ھوں ، انہیں صورت حال کے مطابق ڈھال سکیں - قانون سازی کو استدلالی اور تمثیلی استخراج کے اصول اور عوام کی فلاح و بہبود کے تقاضوں کے مطابق

ہونا چاہئے - لہٰذا علماء کی ایک مجلس تمام تغیر پذیر حالات کے تقاضوں کے مطابق ممکن العمل اجماع کے ذریعہ قانون سازی کرے گی - اور تمام فرقوں کے رسم و رواج ، اگر وہ اسلام کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی نہ کریں اور ضرر و ظلم کا سبب نہ ہوں تو وہ قانونی حیثیت رکھیں گے - تمام فرقے جو اسلامی مملکت میں رہتے ہیں انہیں مساوی شہری حقوق حاصل ہونگے- قانون کی حکومت صرف مخصوص اشخاص کا احترام کرنے والی نہوگی - تمام مراعات اور امتیازی حقوق برخاست کردئے جائیں گے- کوئی استحقاق یافتہ افراد یا طبقات نہونگے اور معاشرہ مخصوص یا غیر منصفانہ امتیازات کے ساتھ جماعتوں ، حقوق اور طبقات میں منقسم نہ ہوگا- یہ ہے اسلام کی مذہبی حکومت کا نقشہ جسکو کسی عہد کی بھی کسی دینی حکومت کے مماثل قرار نہیں دے سکتے - کوئی اپنی پسند کے مطابق خواہ اسے حکومت الٰہیہ سے تعبیر کرے یا دنیوی حکومت کہے ، یہ دونوں کی خوبیوں کی جامع اور ان کی ان برائیوں سے پاک ہے ، جن سے کہ وہ اکثر آلودہ ہوتی رہتی ہیں -

باب سیزدھم

نظامہائے فکر کا تقابلی مطالعہ

مارکسیت

پیروان مارکس ھی کے الفاظ میں مارکسیت کی حقیقت ملاحظہ ھو۔

(۱) کل موجودات ایک جدلیاتی مادیت کا طریق عمل ھے۔ یہ ھیگل کے مناظرۂ منطقی کا دعویٰ، جواب دعویٰ اور امتزاج ھے، جس کو حقیقت کا رنگ دیا گیا ھے۔ دعویٰ اور جواب دعویٰ کا تصادم یا بالفاظ دیگر کشمکش یا آویزش کائینات کی ایک ناگزیر حقیقت ھے۔ ان کا باھمی عمل اور رد عمل ایک امتزاج کی تخلیق کرتا ھے۔ اس طرح پر تمام کائینات باطنی اور خلقی تضادات کا نتیجہ ھے، جس کا ھر صورت حال میں نشو و نما پانا لازمی ھے۔ یہ تمام تعلیلی طریقہ ھائے عمل کی کامل تشریح ھے۔ یہ نفس نہیں ھے جو مادہ پر حکمران ھوتا، بلکہ خود مادہ ھی کی پیداوار ھے۔ یہ موثر علل کائینات کے خارجی حوادث ھیں۔ ھیگل کی تصوریت کو مادی وجودیت سے بدلنا ضروری ھے۔

(۲) اگرچہ کہ جدلیاتی مادیت ھر قسم کے مدرکات کی کامل تشریح کے لئے ایک جامع فرضیہ سمجھی جاتی ھے، مگر مادیت کا خاص تعلق معاشری قوانین اور طریقہ ھائے عمل پر اس کے انطباق سے ھے۔

(۳) اجتماعی دائرہ میں معاشی مظاھر، جو طریق

پیدائش کے عام تصور میں شامل ہیں، اصلاً تخلیقی اور قوی‌الاثر عوامل ہیں۔ مذہب، اخلاقیات، سیاسیات اور فنون اسی طریق پیدائش کے مشتقات اور شاخیں ہیں۔

(۴) تاریخ واردات اتفاق کی کوئی افراتفری نہیں ہے۔ اس بظاہر دیوانگی میں بھی ایک باقاعدگی ہے۔ یہ زندگی کے خارجی حالات مادی ذرائع کی تخلیق کے لئے انسان کی تمام تاریخی سرگرمیوں کی اساس بنتے ہیں۔ تاریخ کسی فلسفی یا مورخ سے سمجھی نہیں گئی، کیونکہ ان میں سے کسی کو بھی یہ گر معلوم نہ تھا۔ تاریخ کی تمام تصوری اور من جانب اللہ تشریحات گمراہ کن ہیں۔ اعیان و ادیان ذہن انسانی میں مادی دنیا کے منعکس ہونے کے سوائے اور کچھ نہیں ہیں۔ دنیا کی قوتوں کا بجز مادہ کی جدلیات کے کوئی دوسرا خالق و ناظم نہیں ہے۔ سیاسیات اور عدالتی نظامات، عدل و انصاف کے مجرد تصورات کے ثمرات نہیں بلکہ زندگی کی مادی کیفیات میں جاگزیں ہیں۔ شہری معاشرہ کا تجزیہ خود اس کی معاشیات کی ایک ضمنی پیداوار ہے۔ وجود کے مادی ذرائع کی پیداوار کا طریقہ تمام معاشری، سیاسی اور عقلی زندگی کے طریق عمل پر شرطیں عاید کرتا ہے۔ اجتماعی تغیرات، سیاسی انقلابات اور مذہبی اصلاحات، ابدی صداقت و عدل میں کسی ترقی کناں بصیرت کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کو متعلقہ دور کے معاشی حالات میں تلاش کرنا چاہئے۔ مارکس اور انگلز جرمن نظام فکر پر اپنے مشترکہ عمل کا خلاصہ حسب ذیل پیش کرتے ہیں:—

"جرمن فلسفہ کے علی الرغم، جس کا نزول آسمان سے زمین پر ہوتا ہے، یہاں زمین سے آسمان کی

طرف صعود کیا گیا ہے - یعنی ہم اس سے ابتداء نہیں
کرتے کہ لوگ کیا کہتے، خیال کرتے اور
سوچتے ہیں ، اور نہ اس سے آغاز کرتے ہیں کہ
انسان کا کس طرح بیان کیا گیا ، اس کے متعلق کیا
اور کیسا خیال کیا گیا یا سوچا اور تصور کیا گیا
ہے ، تاکہ اس مقام سے اور اس کے ذریعہ ہم
مادی انسان تک رسائی حاصل کریں - ہم حقیقی
عامل انسانوں اور ان کے عمل زندگی سے آغاز
کرینگے اور اس عمل زندگی کے اثرات اور پہلوؤں
کو تصوری ترقی میں بھی دکھلائینگے -''

غیر معاشی قوتوں کے عمل سے انکار نہیں کیا گیا ہے - جیسا
کہ انگلز نے کہا ہے تاریخ کے مادی تصور کی رو سے حقیقی
زندگی کی پیدائش اور اس کا اعادہ آخرالامر تاریخ کو متعین
کرنےوالی حقیقت بنتا ہے -

تجارتی اشیاء کی کل قدر و قیمت دماغی یا جسمانی محنت پر
مشتمل ہوتی ہے جو اسکی پیدائش میں صورت پذیر ہوتی ہے -
کسی جنس کی قدر و قیمت اس وجہ سے ہے کہ وہ اجتماعی
محنت کی محسوس شکل ہے - اجناس کی اضافی قیمتوں کا تعین
حسب ترتیب ان کی مقدار اور ان پر صرف شدہ محنت سے
ہوتا ہے - لیکن یہ صرف معاشری قابل قدر محنت ہی ہے جو
قیمت کا تعین کرتی ہے -

مارکس نے تمام پیشہ ورانہ ہنر مندی کے اصناف و درجات
کا تصور کیا اور معمولی مزدوری کے اوقات کے معیار کو
قابل انضباط بنایا - کیفیت کی قدر کا اندازہ بے ہنر محنت کی

کمیت سے کیا جا سکتا ہے۔ اجرتیں بحیثیت مجموعی ضروریات زندگی کی سطح سے قریبی طور پر وابستہ ہوتی ہیں۔

مارکس وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ اصل شاہی میں روزانہ کام کے اوقات ان اوقات سے زیادہ ہونے چاہئیں جس کے لئے ایک مزدور اپنی روزی حاصل کرنے کے لئے اوسط محنت کرتا ہے۔ ان زائد اوقات سے جو قیمت پیدا ہوتی ہے، وہ فاضل قیمت کی تشکیل کرتی ہے، یعنی وہ اقدار جن کو مزدور نے پیدا کیا ہے، لیکن جن کو وہ نہیں پاتا۔ مزدور کو اس کی حاجت سے زیادہ محنت کرائی جاتی ہے اور اس طرح جو زائد قدر پیدا ہوتی ہے اس سے آجر کے جیب و دامن مالامال ہوتے ہیں۔

فاضل قدر کی تخلیق اور غصب، سرمایہ دارانہ نظام کی ایک ناگزیر صورت ہے۔ مارکس کے نزدیک یہ چیز اس نظام کی روح رواں ہے۔ سرمایہ داری کے ابتدائی تاریخی درجات میں سرمایہ دار نے اپنی ذاتی اپج کو پیدائش دولت کی تنظیم میں استعمال کیا اور سرمایہ داری کے پختگی کے مراتب میں بھی اسنے دوسروں کو انتظام کار کے لئے کرایہ پر مقرر کرنے کا طریقہ جاری رکھا اور اپنے لئے مزدور کو ادا کرنے کے لئے رقم فراہم کرنے والے کی منفی حیثیت قائم رکھی۔ سرمایہ دار کا اور کوئی مطمح نظر بجز زائد قدر کے استحصال کے نہیں ہے۔ تمام فاضل قدر، خواہ وہ نفع سود، یا کرایہ کسی صورت میں ہو، حقیقت میں غیر اداء شدہ محنت کو محسوس شکل دیتی ہے۔

اصل کی جمع بندی کے عمل کو جاری کرنے کے بعد، یہ خود مزدوروں ہی کی محنت ہوتی ہے جو ان سے چھینی جاتی

ہے۔ یہ مزدوروں کو پیشگی دی جاتی ہے تاکہ وہ سرمایہ دار آجر کے لئے مزید فاضل قدر پیدا کریں۔ کام کرنے والوں کی محنت کا ثمرہ لازماً ان ہاتھوں میں جمع ہوتا ہے جو کام نہیں کرتے۔ اور یہ ان کے ہاتھوں میں مزدوروں کو غلام بنانے کا ایک طاقتور ذریعہ بن جاتا ہے جس کو خود مزدور پیدا کرتے یہ عمل کل سرمایہ دارانہ نظام میں بالذات موجود ہے۔

چونکہ یہ انسانی فلاح و بہبود کے خلاف اور داخلاً متناقض ہے۔ اسلئے اس کو ترک کر دینا چاہئے۔ معاشی قوتیں ہمیشہ ظالموں اور مظلوموں کے باہم معاندانہ طبقات پیدا کرتی رہتی ہیں۔

''جدید متوسط طبقہ جو جاگیری طبقہ کی بربادی سے پروان چڑھا ہے، طبقاتی عناد کو ختم نہ کر سکا۔ اس نے محض قدیم کی جگہ جدید طبقات، نئے مظالم کی نئی صورتیں اور کشمکش کی نئی شکلیں قائم کی ہیں۔'' معاشرہ اس وقت دو زبردست مخالف گروہوں میں بٹ چکا ہے، ایسے دو مخالف طبقات میں جو براہ راست ایک دوسرے کے بالمقابل ڈٹے ہوئے ہیں۔ یہ دو گروہ متوسط شہری طبقہ اور مزدور طبقہ ہیں۔

''مفادات کے اس ناقابل مصالحت تصادم کا احساس مزدوروں کے ذہن نشین کرنا چاہئے۔ ان کے طبقاتی شعور کی بیداری کے ساتھ طبقاتی آویزش رونماء ہوگی، اور یہ یقیناً سیاسی شکل اختیار کرے گی، جو سرمایہ داروں کو الٹ دینے کی تیاری اور نظام نو کے قائم کرنے میں پہلا قدم ہوگا۔''

اصل شاہی میں متوسط طبقہ غیر اداء شدہ محنت سے زائد نفع جمع کرتا رہے گا اور مزدور اپنی اجرتیں حاصل کرتا رہے گا، جو خود اسکی ضروریات کی تکمیل میں خرچ ہوتی رہیں گی۔

مارکس سود خواروں ، زمینداروں ، سرمایہ داروں ، اور تاجروں کی آمدنیوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ متوسط طبقہ کے اندر ان کے مفادات اور ان کے حیثیات میں کسی قسم کے حقیقی اختلافات نہیں ہیں۔ ان کی آمدنی مزدور کی پیدا کردہ زائد قدر کے حصول پر مشتمل ہے۔

متوسط طبقہ کے نچلے درجات ، چھوٹے تاجر ، دوکاندار ، کاریگر اور کسان رفتہ رفتہ مزدود طبقہ میں ضم ہو جائیں گے کیونکہ یہ بڑے سرمایہ داروں کے ساتھ مسابقت میں اپنا علیحدہ وجود برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔

متوسط طبقہ نے نہایت اہم ، اصلاحی اور عبوری کام انجام دیا ہے۔ اس نے جاگیری بندھنوں کو توڑنے اور محض ذاتی مفاد کو انسان اور انسان کے درمیان ایک تعلق کے طور پر قائم رکھنے میں ایک انقلابی پارٹ ادا کیا ہے۔ اس نے غرضانہ حساب شماری کے برفانی پانی میں تمام مذہبی جوش خود اور تصوری جذباتیت کو بھی غرق کر دیا۔اور صرف براہ راست بہیمانہ استحصال باقی رہ گیا ہے۔ اس کا نمایاں کارنامہ کسی سونچے سمجھے ہوئے ہمدردانہ محرک کے بغیر مختلف سمتوں میں انسانیت کی ترقی ہے۔ فطرت کی طاقتیں عملی سائینس کے تابع کر دی گئی ہیں ، اور دنیا کے مختلف حصوں میں قریبی ربط قائم ہو گیا ہے۔

لیکن مادیت کی ناگزیر منطقی جدل و بحث کی رو سے اس نے ایسی قوتوں کو حرکت دی ہے جو بالآخر اس کی تباہی کا موجب ہوں گے۔ اس نے منطقی تلازم کے طور پر مزدور

طبقہ کی تخلیق کی ہے - پرولتاریہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ ''یہ مزدوروں کا ایک ایسا طبقہ ہے جو اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک کہ کام ملتا رہے - اور ان کو کام اس وقت تک ملتا رہتا ہے جب تک کہ ان کی محنت سے سرمایہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے - یہ مزدور جو رفتہ رفتہ خود کو فروخت کر دیتے ہیں، دیگر سامان تجارت کی طرح اشیائے تجارت ہوتے ہیں، لہذا یہ مسابقت کے تمام انقلابات اور بازار کے اتار چڑھاؤ سے متاثر ہوتے ہیں -''

جب سے صنعتی طریقہ ہائے عمل نے مزدوروں کے جم غفیر کو ایک شہر میں اکھٹا کر دیا ہے تب سے مزدور طبقہ کو متوسط طبقہ کے خلاف جتھا بندی کا اچھا موقع مل گیا ہے - اب یہ باہم متحد ہو کر اپنی شرح اجرت کو برقرار رکھ سکتے ہیں اور رسل و رسائل کی ترقی سے بھی پرولتار زیادہ نفع اٹھا سکتے ہیں -

مملکت ظلم کا ایک ذریعہ ہے، جس پر متوسط طبقہ اپنے مفادات کو ترقی دینے کی خاطر متصرف ہے - ایک منظم سوسائٹی جس نے طبقاتی امتیازات کا استیصال کر دیا ہو، مملکت کی عدم موجودگی میں زندہ رہ سکتی ہے - تمام سیاسی قوت صرف ایک جماعت کی منظم قوت ہوتی ہے جو دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنے کے لئے ہے - جیسے جیسے اشتمالیت ترقی کرتی جائے گی، مملکت روبہ تنزل ہوگی -

سرمایہ دارانہ نظام میں دولت کا ارتکاز و اکتناز خود کو دوام و استحکام بخشتا ہے - سرمایہ داروں کی باہمی آویزشوں میں بڑے سرمایہ دار چھوٹے سرمایہ داروں کو ہڑپ کر

جاتے ہیں - سرمایہ داروں کی باہمی آزادانہ مسابقت رفتہ رفتہ عظیم‌الشان اجارہ داریوں کے لئے اپنی جگہ خالی کر دیگی - کسی واحد سرمایہ دار ملک کا راس المال حدود ملک سے باہر پہنچ کر سرمایہ دارانہ شہنشاہیت بن جاتا ہے -

سرمایہ داروں کے بین‌الاقوامی اجارہ کے اتحادات تشکیل پا چکے ہیں، جو دنیا کا بٹوارا کر رہے ہیں -

سامراجی قوتیں ان اجارہ داروں میں شرکت کے حق کے لئے، بازاروں اور راس المال کو نفع بخش کاموں میں لگانے کی جدو جہد میں باہم دست و گریباں ہیں - اس سے دنیا متحارب سرمایہ داروں کی جماعت کا ایک خونخوار مجموعہ بن جائے گی جو سرمایہ دارانہ غلامی کے نگران و محافظ ہوں گے - اور سرمایہ دارانہ پیداوار نے جو تناقضات پیدا کئے ہیں وہ بجائے قوم کے دنیا سے نفع حاصل کرینگے -

سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمہ پر پرولتاریہ کو اقتدار چھیننے کے لئے مستعد رہنا چاہئے، کیونکہ اندرونی تناقضات کے سبب ایسا ہونا ناگزیر ہے - پرولتاریہ کو اقتدار چھیننا پڑے گا - اور اپنی حکومت قائم کرکے ان تمام سرمایہ داروں آجروں اور ان کے طبقاتی تصورات کو پامال کرنا پڑیگا -

پہلے مرحلہ میں پرولتاری مملکت سرمایہ داروں کے خلاف ایک ظلم کا آلہ ہوگی - اشتمالیت کے عروج و کمال پر پہنچنے کے بعد، جبکہ ہر شخص اپنی پوری صلاحیتوں کو روبہ عمل لائیگا اور مشترک پیداوار سے اپنی حاجت کے مطابق صرف کریگا، پرولتاری مملکت بتدریج فنا ہو جائیگی -

یہ تبدیلی پر امن ارتقاء کے ذریعہ وقوع پذیر نہوگی -

معاشی جنگ کو سیاسی جنگ میں مبدل ہونا پڑیگا۔ متوسط طبقہ کی حکومت بغیر جنگ لڑے رام نہوگی۔ مارکس اور انگلز کے خیال کے مطابق قوت مطلق برائی کی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ نئے معاشرہ کو جنم دینے والے ہر پرانے معاشرہ کی دایہ گری کرتی ہے۔ ہر کامیاب انقلاب سے زبردست روحانی اور اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے۔

اصل شاہی سے اشتمالیت میں تبدیلی منطقی طور پر ناگزیر ہے، لیکن ایک شدید انقلاب اس مناظرۂ منطقی کی ایک لازمی منزل ہے۔ عبوری دور میں سیاسی اقتدار مقامات بدلتا رہیگا۔ متوسط طبقہ اس کو کھو دیگا اور پرولتاریہ اس کو حاصل کر لیگا۔ محکوم حاکم ہو جائیگا۔

ابتدائی منازل ارتقاء میں گو عالم گیر عمومیت نہوگی۔ جس طرح سابق میں صرف متوسط طبقہ کے لئے عمومیت تھی، اب یہ صرف مزدوروں کے لئے ہوگی۔ سرمایہ داری سے اشتمالیت کی طرف عبور و مرور کے وقت لوگوں پر ظلم کرنے والے اور ان سے نفع اٹھانے والے عمومیت سے خارج کر دئے جائیں گے۔

چونکہ ذرائع پیدائش تمام معاشرہ کی ملک ہونگے، اس لئے تمام شہری مملکت کے اجرت پانے والے ملازمین میں مبدل ہو جائیں گے۔

مزدور اجرت کیلئے کام کرینگے۔ ہر مزدور محنت کے مساوی پیداوار کی مساوی مقدار حاصل کریگا۔ 'جو محنت نہیں کریگا وہ بھوکا رہیگا'۔ اجرتوں میں اختلاف ہوگا لیکن استحصال نہوگا۔

مارکس کے نزدیک اشتمالیت کا مقصود یہ ہے کہ 'ہر ایک سے اس کی قابلیت کے مطابق کام لیا جائے اور ہر ایک

کو اس کی حاجت کے مطابق دیا جائے'۔ لیکن اشتمالیت کے کمال کا ظہور لازمی نہیں ہے۔ لینن کہتا ہے کہ "کسی اشتراکی کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ یہ وعدہ کرے کہ اشتمالیت آخری منزل پر پہنچ جائیگی"۔ (لینن بحوالۂ مارکس در 'مملکت و انقلاب')۔

لینن نے مزید اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کامل اشتمالیت رائج نہیں کی جا سکتی۔ کن مقامات اور کن عملی طریقوں سے انسانیت اس اعلیٰ مقصد کی طرف بڑھیگی، یہ نہ ہم جانتے ہیں اور نہ جان سکتے ہیں۔ "پورے اعتماد کے ساتھ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرمایہ داروں کی بے دخلی انسانی معاشرہ کی پیدا آور قوتوں کی عظیم الشان ترقی کی صورت میں ظاہر ہوگی"۔

غیر طبقاتی معاشرہ کا قیام اشتمالیت کا مطمح نظر ہے۔

فاشیت

اس اصلاح میں جرمنی اور اٹلی دونوں کے وہ معاشی نظامات داخل ہیں جو وہاں دوسری جنگ عظیم سے قبل قائم تھے۔ جرمنی میں اسے قومی اشتراکیت سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ فاشیت (Fascism) فاشیو (Fascio) سے مشتق ہے، جس کے معنی مجموعہ یا بنڈل کے ہیں۔ دونوں ملکوں میں یہ تحریک عمومیت پسندوں کے خلاف اختیار کی گئی، جو یہ امید رکھتے تھے کہ مصالحت کے ذریعہ تعاون عمل قومی تصادمات کی جگہ لے لیگا۔ پریزیڈنٹ ولسن اس جذبۂ عمومیت کا زبردست ترجمان تھا۔ لبرل تحریک نے قوم کی خود ارادیت کی تبلیغ بحیثیت ایک

دلپسند مقصود کے کی ۔ بڑی قوموں کی جارحانہ کارروائی سے چھوٹی قوموں کی حفاظت کی گئی اور اکثریت کی ظلم و زیادتی سے اقلیتوں کا تحفظ کیا گیا ۔ دستوری عمومیتوں میں ہر جگہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو حق رائے دھی عطا کیا گیا ۔ اسی طرح آجروں کی نفع اندوزی کے خلاف مزدوروں کی حفاظت کی گئی ۔ بین الاقوامی نزاعات کے تصفیہ کے لئے مجلس اقوام کا قیام عمل میں لایا گیا ، اور جنگ اور تلوار کے ذریعہ فیصلہ کو خارج کر دیا گیا ۔

ان میں کئی مقاصد سے اشتراکیوں اور اشتمالیوں کو اتفاق تھا ، لیکن ان کا یہ خیال تھا کہ جبتک صنعتی عمومیت ان کا ساتھ نہ دے سیاسی عمومیت تنہا ان مقاصد کو حاصل نہیں کرسکتی ۔ مثالی معاشی مساوات اور اجتماعی انصاف کو تشدد کے ذریعہ حاصل کرنا ضروری ہو جائیگا ۔ چونکہ صرف مزدوروں کی حکومتیں حقیقی اور دائمی بین الاقوامی ہم آہنگی حاصل کر سکتی ھیں اس لئے مزدوروں کی حکومت کا قیام اولین مقصد ہونا چاھئے۔

۱۹۲۲ ء میں فاشیت مسولینی کی قیادت میں حکومت اٹلی پر قابض ہوئی اور ان میں سے کئی مقاصد اور ان کے حصول کے مجوزہ طریقوں کو ترک کر دیا گیا ۔ فاشیت اس نتیجہ پر پہنچی کہ حریت پسند عمومیت اپنے دن دیکھ چکی ھے ، اور اب اس پر جو چیز فوقیت لے جائیگی وہ اشتراکیت یا اشتمالیت نہیں بلکہ کوئی بالکل مختلف چیز ہوگی ۔ لبرل عمومیت کے جملہ اقدار کی اس نے دوبارہ جانچ پڑتال شروع کی ۔ خفیہ رائے دھی کے ذریعہ اکثریت کی حکومت کو ناپسند کیا گیا ، اور پارلیمنٹ یا

حکومت میں مخالف جماعتوں کے تصور کو ایک طفلانہ جماعت سمجھ کر اس کا مضحکہ اڑایا گیا۔ اسی طرح آزادی خیال و تقریر کو مردود قرار دیا گیا۔ تاریخ کے مطالعہ نے انہیں یہ یقین دلایا کہ عظیم مملکتوں کی تخلیق اور ان پر حکومت چند افراد کے مجموعہ اور جنگجو اقلیتوں کے ذریعہ ہوئی ہے جو عوام کے صلاح مشورہ سے قانون سازی نہیں کرتے تھے۔ لبرل عمومیت ذاتی ملکیت کو آزادی کی اولین شرط قرار دیتی ہے اور قوت کے عدم توازن کو روک تھام اور برابری کے قابل احترام اصول سے درست کرتی ہے۔ فاشیت ذاتی ملکیت کا حق طالب اقتدار مملکت کے معینہ حدود کے اندر عطا کرتی ہے۔ اسی طرح مملکت ہی کے ذریعہ روک تھام اور توازن کی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں اور ان پر قابو حاصل کیا جاتا ہے۔ انفرادی آزادی کوئی مطلق حق نہیں ہے۔ اصل وجود مملکت کا ہے اور فرد کی حقیقت بجز مملکت کا ایک جزء ہونے کے اور کچھ نہیں۔ فاشیت بحیثیت مجموعی ذاتی زمین اور سرمایہ کو معاشرہ کے کاموں پر صرف کرنے کی مخالف ہے۔ مملکت کا اقتدار ذاتی ملکیت کو برخاست کرنے کی حد تک وسیع نہونا چاہئے، کیونکہ یہ چیز مملکت کو کمزور کر دیتی ہے۔ ہاں اگر مملکت کو شدید ضروریات لاحق ہوں تو وہ کسی حد تک بھی ان پر دست اندازی کر سکتی ہے۔ فاشیت ذرائع پیدائش پر مزدوروں کے اقتدار سے انکار کرتی ہے۔

اب ہم فاشیت کے اساسی تصورات کا خلاصہ بیان کرنے کی کوشش کرینگے۔

(۱) حکومت عام حق رائے دہی کے ذریعہ غلط ہے۔

قومی مصالح کے تعین کے لئے باشندوں کی اکثریت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں اپنے فرائض ادا کرنے کی تعلیم دی جائے لیکن اپنے حقوق کے لئے شور و ہنگامہ بپا کرنے کی اجازت نہ ہو۔ اصل حقیقت انسانوں کی عدم مساوات ہے، نہ کہ مصنوعی مساوات۔ مسولینی اس بات پر زور دیتا ہے کہ ''بنی نوع انسان کی نفع بخش اور نتیجہ خیز عدم مساوات، حق رائے دہی کی طرح کے محض میکانی عمل سے مستقل طور سے برابر نہیں کی جا سکتی''۔ فاشیت کے ایک شارح کے قول کے بموجب فاشیت اپنی توپوں کی نشانہ بندی تمام عمومی تصورات کے خلاف کرتی ہے۔ عمومی ریاستوں میں جمہور ہمیشہ اس عقیدہ سے گمراہ کئے جاتے ہیں کہ اقتدار اعلیٰ کے وہی حامل ہیں۔ حالانکہ اقتدار اعلیٰ ہمیشہ دوسروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو خود غرض اور ظالم ہوتے ہیں۔ مسولینی اپنے عقیدہ کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے کہ '' فاشیت تعداد کی اس حیثیت سے کہ وہ انسانی معاشرہ کا تعین کرنے والی عامل ہو سکے، انکار کرتی ہے اور موقتی مشورہ کے ذریعہ تعداد کے حکومت کرنے کے حق کو بھی وہ تسلیم نہیں کرتی''۔

ہٹلر کا بھی یہی خیال ہے۔ اس کی کتاب 'میری جد و جہد' کا یہاں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ ''قومی مملکت کو چاہئے کہ پوری حکومت کو درست کرنے کی انتھک کوشش کرے اور سیاسی قیادت اکثریت کے اقتدار کے اصول سے آزاد ہو۔ تا کہ وہاں جمہور کے بجائے فرد یعنی مقتدر قائد کا مسلمہ اقتدار قائم ہو سکے۔ فیصلہ صادر کرنے والی قوت کوئی اکثریت نہ ہو بلکہ وہ محض ذمہ دار اشخاص کی ایک جماعت

ہونی چاہئے۔ اس طرح لفظ 'کاؤنسل' اپنے قدیم مفہوم پر عود کر آئیگا۔ ہر آدمی کے ساتھ کونسلر ہوں گے، لیکن فیصلہ صرف ایک ہی آدمی دیا کریگا۔''

عمومیت کی متبادل صورت چند خودساختہ افراد کی حکومت ہے۔

فاشیت، اشتراکیت اور اشتمالیت سے اس خیال میں متفق ہے کہ مسابقتی معاشی نظامات، جو عدم مداخلت کے اصول پر مبنی ہیں، اپنے اندر باطنی تناقضات اور انتشار انگیز غیر سماجی رجحانات رکھتے ہیں۔

فاشیت حکومت کے زیر نگرانی سرمایہ دارانہ نظام کی موید ہے۔ غیر قابو یافتہ سرمایہ دارانہ نظام نہ استحکام حاصل کر سکتا ہے نہ روزگار فراہم کر سکتا ہے اور نہ وسائل سرمایہ سے پوری طرح استفادہ کر سکتا ہے۔ اگر مختلف معاشی گروہ حکومت کے ذریعہ متحد ہو جائیں تو ذاتی ملکیت کی خرابیاں دور ہو جائینگی اور بحیثیت ایک نفع بخش نظام کے ان سے کام لیا جائیگا۔ تمام معاشی زندگی کی، ذاتی ملکیت کے نقشہ میں رہ کر، قومی اصول پر رہنمائی ہونی چاہئے۔

فاشیت بالعموم دائمی امن کے امکان یا افادہ پر یقین نہیں رکھتی۔ مسولینی اپنے فلسفۂ امن و جنگ کو ان خطیبانہ جملوں میں پیش کرتا ہے کہ ''فاشیت امن پسندی کو، جو ایثار کے پردہ میں بزدلانہ تساہل پسندی و نفس کشی کا ایک حیلہ ہے، ترک کرتی ہے۔ جنگ انسان کی تمام توانائیوں کو ان کی انتہائی حد تک پہنچاتی ہے اور ان اشخاص پر مہر شرافت ثبت کرتی ہے جو مردانہ وار اس کا مقابلہ

کرتے ہیں۔ تمام دیگر آزمائشیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں، جو انسان کو موت و زیست کی متبادل صورتوں میں خود اپنے آپ سے مقابل نہیں ہونے دیتی۔ لہذا وہ تمام اصول جو بہر قیمت امن کے دعویدار ہیں وہ فاشیت کے ساتھ میل نہیں کھاتے۔ اور اس قسم کے تمام بین الاقوامی یا مجالسی ادارے بھی خواہ وہ خاص سیاسی صورت حال سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے کتنے ہی مفید تسلیم کئے جائیں، فاشیت کے اقتضا سے بیگانہ ہیں۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ جب کبھی قوموں کے ذہن و دماغ میں جذباتی، تصوری یا عملی لحاظات کا ہیجان ہؤا تو یہ ادارے زمیں دوز ہو گئے"۔ یہ مخالف امن رجحان فاشیت ہر فرد کی زندگی میں پیدا کرتی ہے۔ "میں مطلق پروا نہیں کرتا" (Me ne frego) ایک لڑنے والے دستہ کا مغرورانہ مقولہ تھا جس کو ایک زخمی نے اپنی پٹیوں پر لکھا تھا اور یہ محض فلسفیانہ رواقیت نہیں ہے بلکہ ایک ایسے عقیدہ کا خلاصہ ہے جو محض سیاسی عقیدہ نہیں، بلکہ ایسے جنگجویانہ جذبہ کی شہادت ہے جو تمام خطرات قبول کر لیتا ہے۔

"اس طرح کا تصور زندگی فاشیت کو اس عقیدہ کا سخت منکر بناتا ہے جو نام نہاد کلیاتی اور مارکسی اشتراکیت کی اساس ہے۔ یعنی تاریخی مادیت کا عقیدہ جو انسانیت کی تاریخ سے تمام دیگر چیزوں کو خارج کر کے پیدائش کے طریقوں اور ذرائع کی تبدیلیوں کو طبقاتی کشمکش کی اصطلاح میں بیان کرتا ہے۔"

فاشیت معاشی عوامل کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے، لیکن اس چیز کو نہیں مانتی کہ طبقاتی کشمکش معاشری

تغیرات میں ایک وقیع اور اہم عامل ہے۔

فاشیت اس لذت پرستانہ افادی عقیدہ سے انکار کرتی ہے کہ خیر اعلی زیاد، سے زیادہ تعداد کی انتہائی آسودہ حالی ہے اور آسودہ حالی سے مراد صرف مسرتوں کا مجموعہ ہے۔

اشتمالیت یہ پیش گوئی کرتی ہے کہ مملکت جو ہمیشہ ظلم و ستم کا آلہ رہی ہے بالآخر ختم ہو جائیگی۔ فاشیت کے نزدیک مملکت ایک فرد سے زیادہ حقیقی ہے اور افراد کے مجموعہ سے زیادہ موقر ہوتی ہے۔ مملکت کو طاقتور بنانا آخری مقصد ہونا چاہئے، جس کے لئے اگر ضرورت ہو تو انفرادی آزادی اور انفرادی خوشحالی قربان کی جا سکتی ہے۔

فاشیت قومیت کو ایک غیر متنازع فیہ نقطۂ آغاز سمجھتی ہے۔ اس کے معاملہ میں بین الاقوامیت ایک غیر موثر عارضی تدبیر ہے۔

''فاشستی مملکت ایک ہمہ گیری مملکت (Totalitarian State) ہے۔ مملکت کا اقتدار اعلیٰ کامل اور ناقابل تقسیم ہے اور جیسا کہ عموی مملکتوں میں ہوتا ہے، یہ باشندوں میں منقسم نہیں کیا جا سکتا۔ مسولینی کا مشہور قول اس رویہ کو پر زور طریقہ پر چند الفاظ میں یوں واضح کرتا ہے کہ ''ہر چیز مملکت میں ہے۔ کوئی چیز اس کے خلاف نہیں، اور کوئی چیز اس سے باہر نہیں۔ یہ ہمہ تواں، ہمہ جائی، اور ہمہ گیر ہے۔''

'' فاشستی مملکت معاشی میدان میں دوسری چیزوں سے کچھ کم دعویدار نہیں۔ یہ اپنے اثر کو امداد باھمی اور معاشری و تعلیمی اداروں کے ذریعہ مملکت کے طول و عرض

میں پھیلاتی ہے اور قوم کی تمام سیاسی ، معاشی اور روحانی طاقتیں اپنی جداگانہ انجمنوں کی شکل میں منظم رہ کر مملکت کے اندر گھومتی ہیں ۔''

چونکہ مملکت ایک مجرد وجود ہے اسلئے جو شخص بھی فی‌الواقع اس پر حکمران ہوتا ہے وہ اس کی قدرت کاملہ کا مظہر اور مادی پیکر ہوتا ہے ۔ اس کا صدر ایک رہنما کی حیثیت رکھتا ہے ، جو لوئی چہاردہم شاہ فرانس سے زیادہ صداقت کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ '' میں مملکت ہوں ''۔ اور بے چوں و چرا وفاداری اور غیر مشروط اطاعت کا مدعی ہوتا ہے ۔

قومی فخر و ناز کو قدیم روایات سے اور اگر ضرورت ہو تو افسانوں سے بھی فروغ دیا جائے ۔ دوسری قوموں کے استخفاف اور تذلیل سے قوم کی خوبیوں کو سراہا جائے ۔ منتخب اشخاص کے افسانے ایک نفسیاتی حقیقت بنائے جائیں اور عوامی حکومتوں کے خلاف زوال و انحطاط کا زور و شور سے پروپیگنڈا کیا جائے ۔ نازیوں نے نسلی برتری اور نسلی شرافت پر خصوصیت سے زور دیا تھا ۔

طاقت قوموں ، مملکتوں اور شہنشاہیتوں کی خالق ہے اور زمانہ موجودہ و آئندہ میں یہ اسی طرح قائم و جاری رہیگی ۔ طاقتور کمزور پر حکمران رہیگا ۔ اور ایسا کرنے میں کوئی شرم و ناانصافی نہیں ہے ۔

اشتمالیت محنت کش انسانیت کی ایک عالم گیر وحدت کے لئے کوشاں ہے ، جو قومیت کے قید و بند سے آزاد اور رنگ و نسل کے امتیازات سے ماوراء ہو ۔ فاشیت قومی

امتیازات کو ابھارتی اور دنیا کو پیدائشی آقاؤں اور پیدائشی غلاموں میں تقسیم کرتی ہے - اسکے نزدیک بین المملکتی اخلاقیت اس اخلاقیت سے مختلف ہونی چاہئے جو ایک ہی مملکت کے افراد میں ہوتی ہے - نسلیں اور قومیں ادنیٰ اور اعلیٰ قسم کی ہوتی ہیں - مساوات کے اصول پر نسلوں کو مخلوط کرنا یا کمزور و طاقتور کے اتحاد عمل کی کوشش کرنا حیاتیاتی ارتقاء کے عمل میں رجعت قہقری کے مماثل ہے، جس کا اساسی قانون فطری انتخاب اور بقائے اصلح ہے -

کلیت پسند فاشستی مملکت میں مملکت فرد پر فوقیت رکھتی ہے - حالانکہ لبرل عمومیتوں میں فرد مملکت پر مقدم ہوتا ہے اور اپنے حقوق دستور و آئین کے ذریعہ محفوظ رکھتا ہے -

جرمن عینیت پسند فشتے نے کہا ہے کہ تاریخ انسانیت حقوق کا ایک تدریجی ارتقاء ہے - مسولینی اور ایک زبردست فاشستی فلسفی جیوانی جنتیلے(Giovauni Gentile) تاریخ انسانیت کی اس تشریح کی تردید کرتے اور اس نظریہ کی حمایت کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ آزادی مملکت کی زیادہ سے زیادہ قوت پر منحصر ہوتی ہے - ''انسانی تہذیب کی تمام تاریخ، دور وحشت سے تمدن یا نام نہاد متمدن انسان تک، آزادی کی تدریجی حد بندی ہے'' -

چونکہ مملکت کا ایک رجحان اور ایک حکمت عملی ہے، اس لئے فیصلوں اور انکے نفاذ کے لئے ایک ہی جماعت کا ہونا ضروری ہے - چنانچہ قائدین کا اندرونی حلقہ قطعی فیصلے صادر کرتا ہے اور پھر عاملہ کو ہدایات جاری کی جاتی ہیں -

قیادت کی شکل مخروطی ہے - چوٹی پر ایک زبردست قائد ہوتا ہے، جس کا فیصلہ خطا سے بری اور جس کا ارادہ مطلق

ہوتا ہے۔

فاشیت منضبط اور زیر نگرانی سرمایہ دارانہ کفایت پر یقین رکھتی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی سرگرمیاں باقی رکھی جاتی ہیں۔ صرف حکومت ہی کسی بڑے کام کی کرنے والی یا آجر نہیں ہے، بلکہ وہ ان ہدایات پر عمل کراتی ہے جنکی پیدائش دولت میں ضرورت ہوتی ہے۔ اطالوی منشور مزدوران بابت ۱۹۲۶ء کی دفعہ آٹھ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''جماعتی مملکت پیدائش دولت میں انفرادی جد و جہد کو قوم کے فائدہ کے لئے نہایت مؤثر اور مفید ذریعہ تصور کرتی ہے''۔ آجر اور اجیر کو قوم کے فائدہ کے لئے ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنا چاہئے۔

ایک اشتراکی مملکت تخلیق کئے بغیر بھی چند اشتراکی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ نازیوں نے بے محنت کمائی ہوئی آمدنیوں کی موقوفی، منافع جنگ کی ضبطی، پیرانہ سالی کے وظیفوں کی وسیع ترویج، اوقاف کی قومی نگرانی، بڑے بڑے کاروبار کے منافع میں شرکت، اور ماں اور بچہ کی حفاظت کے ذریعہ صحت عامہ کی ترقی و اصلاح کی تجاویز پیش کی تھیں۔

فاشیت جماعتوں اور طبقوں کو برخاست کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ قومی تنظیم کو ایسا معاشی خاکہ بنانا چاہئے جس میں قوم کی یک جہتی جماعتوں کے مخالف مفادات کی جگہ لے لے اور آجر اور اجیر کی سندیکوں میں وسیع گروہ بندیاں طبقات کو ایک کارآمد تنظیم میں ڈھالنے کے لئے ایک عضوی کل کی شکل اختیار کریں۔

پیدائش دولت اور معاشی اشیاء کی کوئی مساوی تقسیم وہ شے نہیں ہے جو انسان کی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرتی اور

حرکت میں لاتی ہے - قوم کی قوت اور شوکت کو باشندوں کے قلب میں ایک کارفرما جذبہ بننا چاہئے - انفرادی آزادی کے بجائے قوم کو غیر متزلزل وفاداری کی تعلیم دی جائے - اگر قوم کی عظمت و شوکت کے حصول میں معیار زندگی کو پست کرنا بھی پڑے تو قوم کو خندہ پیشانی سے اسے قبول کرنا چاہئے - چنانچہ مسولینی نے ۱۹۳۴ء میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ''ہم غالباً انسانیت کے اس دور کی طرف جا رہے ہیں جو ایک پست تر معیار زندگی پر قانع رہا ہو - انسانیت تقشف کی ایسی صلاحیت رکھتی ہے جو شاید ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ ہو''۔

فاشیت معین اور منطقی طور پر کوئی منضبط فلسفہ نہیں رکھتی ، لیکن اس کے میلانات اور نقوش قدم کا پتہ اسکے عام نقطۂ نگاہ اور طریقوں سے لگایا جا سکتا ہے - ان رجحانات کی سلبی طریقہ پر بہترین صورت میں تعریف کی جا سکتی ہے -

فاشیت تمام جمہوری ، حریت پسند اور مساوات پسند فلسفوں کی مخالف ہے - فرانسیسی اور امریکی انقلابات کے فلسفیانہ اساس کی تردید کرتی ہے ، جن کا آغاز انسان کے فطری حقوق سے ہوتا ہے - یہ اصول عدم مداخلت کے فلسفیانہ معروضات کے بھی قطعاً خلاف ہے - اور عیسائیوں کے عہد نامۂ جدید کے انسانیت دوست نظریات بھی اس کے مناسب حال نہیں ہیں -

فاشیت طبقاتی کشمکش اور مزدور طبقہ پر اختیار رکھنے کے لئے تمام اصول باطل قرار دیتی ہے - یہ عقلیت کی مخالف ہے -

حق کی خاطر حق کی تلاش یا مشاہدہ ، تجربہ اور استخراجی اور استقرائی استدلال کی حیثیت انسانی زندگی میں ثانوی ھے - حکمیاتی اور فلسفیانہ صداقت کا اندازہ قوم کے مزاج اور زندگی پر اسکے اثرات سے کیا جانا چاھئے -

قومی عظمت کی خاطر باشندوں کی ایسی تربیت اور انکی ایسی کیفیت ھو کہ وہ چند خاص نظریات کو قبول اور دوسروں کو رد کر دیں -

عقلیت محض کسی سند کو بلا ثبوت کے تسلیم نہیں کرتی - فاشیت بےچون و چرا تسلیم و اطاعت کی طالب ھے - بہت سے فاشستی فخر سے عقل کے خلاف بغاوت کا اظہار کرتے ھیں اور نا معقولیت پر ناز کرتے ھیں - وہ خیال سے زیادہ ارادہ پر اور عقل سے زیادہ احساس پر زور دیتے ھیں - واقعیت پسندانہ استدلال کی جگہ پروپگنڈا لے لیتا ھے اور بحث و حجت پر قوت کو اس خاموش اعتقاد کے ساتھ ترجیح دی جاتی ھے کہ یہ قوت ھی ھے جو بالآخر حق کا رنگ اختیار کر لیتی ھے -

امن کا اثر تنزل پیدا کرتا ھے اور مسلسل امن قوموں کے انحطاط کا باعث ھوتا ھے - اس لئے نسلی اور قومی آویزش کی صورت میں جنگ و پیکار کی مدح سرائی کرنی چاھئے -

فاشستی فلسفہ کا پس منظر معلوم کرنے کے لئے کسی کو جرمن فلسفیوں ، فشٹے ، نٹشے اور ٹرائشکے کی طرف رجوع کرنا پڑیگا -

فشٹے نے جرمن قوم کے خدائی منصب پر فائز ھونے کی تبلیغ کی -

نٹشے نے محبت اور شرافت کو نظر حقارت سے دیکھا۔ اس کے نزدیک زندگی زیادہ سے زیادہ اقتدار کی ہوس میں اوپر کی طرف بڑھتی ہے۔ انسانوں کو ہمیشہ سے آقاؤں اور غلاموں میں تقسیم کیا جاتا رہا ہے۔ انسانیت کی کوئی عالم گیر اخلاقیت نہیں ہے اور صرف مالکانہ اخلاقیت اور غلامانہ اخلاقیت کا وجود ہے۔

یہ تمام اثرات جرمنوں اور اطالویوں پر کار فرما رہے ہونگے۔

مسولینی کے مقابلہ میں، جو ایک عالم و فاضل تھا، ہٹلر ایک کم علم متشدد آدمی تھا۔ مسولینی کے بعض سوانح نگاروں نے ایسے بہت سے مفکرین کے نام بتلائے ہیں جن کے فلسفوں کو مسولینی نے اپنے نظریات و تصورات میں شامل کر لیا تھا۔ وہ ولیم جیمز کے نظریۂ عملیت کا ثناخواں تھا، جس کا نظریۂ صداقت یہ تھا کہ سچائی وہ ہے جو عملاً صحیح ثابت ہو۔ مسولینی نے اس کی تشریح یوں کی تھی کہ "جو بھی عمل پیرا ہو وہ حق پر ہے"۔ برگسان ایک دوسرا مخالف معقولیت تھا جس کے تخلیقی ارتقاء نے یہ سکھلایا کہ ایلان وتال (Elan vital) یعنی زندگی کا قوی داعیہ جوں جوں ترقی کرتا جاتا ہے، وجود، صداقت اور اقدار کی تخلیق ہوتی جاتی ہے۔ کوئی ایسی صداقت نہیں جو حقیقت کے ابدی نمونہ کا انعکاس کرتی ہو۔

فاشیت کسی دوسرے سیاسی مفکر سے زیادہ میکیاویلی سے قریب تر معلوم ہوتی ہے اور مسولینی بحیثیت ایک اطالوی ہونے کے اس سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ مسولینی کے ایک سوانح نگار نے اس کے باپ کا یہ قصہ بیان کیا ہے کہ وہ اپنے

بیٹے مسولینی کو میکیاویلی کی کتاب پڑھ کر سناتا تھا۔ آمر بننے کے بعد مسولینی نے میکیاویلی پر ایک مقالہ لکھنا شروع کیا تھا جس کا صرف مقدمہ تکمیل پا سکا، جو شائع ہو چکا ہے۔ میکیاویلی نے یہ تعلیم دی تھی کہ مملکت کے اقتدار و افتخار کے لئے ہر چیز جائز ہے اور بین المملکت تعلقات میں مجرد انصاف اور اخلاقیت کے اصول پر کوئی توجہ نہ دینی چاہئے۔ انسان فطرتاً خود بین، اقتدار پسند اور نفس پرست ہوتا ہے۔ انصاف فرد کے لئے فطری چیز نہیں ہے اور اس کو ضرورت کے وقت قانون اور قوت کے آگے جھکایا جا سکتا ہے۔ آزادی صرف انتشار اور بد نظمی پیدا کرتی ہے۔ ایک مدبر صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کی فطری پستی اور بے رحمانہ خود غرضی کے مفروضہ پر اپنے کام کا آغاز کرے۔ یہ تصوریت نہیں بلکہ قوت ہے جو تمام انسانی تعلقات پر حکمران ہے۔

حاصل کلام یہ کہ فاشستی فلسفہ قوم پرستانہ کلیت پسند مملکت کے گرد گھومتا ہے، جو ایک عضوی تہذیبی اکائی کی طرح منظم، مستحکم، خود کفیل، اور جارحانہ ہو۔ یہ اجتماعی قومی انا کو تقویت پہنچانا چاہتا ہے۔

اسلام کا سیاسی اور معاشی تصور

اصل شاہی اور اشتمالی و فاشستی نظامات فکر پیش کرنے کے بعد اب ہم اس موقف میں ہیں کہ ان کا مقابلہ و موازنہ اسلام کے اساسی تصورات سے کریں۔ ان نظامات میں سے کوئی بھی بالکلیہ قبول یا رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جزوی صداقتوں اور حقائق پر زور دیتے ہیں، جن میں حیات کے متعلق بہت کچھ

باطل اور کمزور رجحانات مخلوط ھیں۔ صنعتی سرمایہ داری جو حریت پسند عمومی تحریکات کے ھمرکاب رھی ، آدم اسمتھ کے اصول عدم مداخلت پر مبنی تھی۔ اس نظام نے سرعت سے بڑی دولت پیدا کی اور جو قومیں اس پر عمل پیرا ھوئیں انھیں اس نے طاقتور اور مرفه الحال بنا دیا۔ مگر یه خوشحالی بڑی قیمت دیکر خریدی گئی تھی۔ عوام نے حق رائے دھی حاصل کیا ، لیکن رفته رفته وه اتنے بے بس ھوگئے که یه سیاسی آزادی انھیں کوئی فائده نه پہنچا سکی۔ ذرائع پیدائش زیاده سے زیاده گراں ھوگئے، جن کو صرف بڑے بڑے سرمایه دار ھی انفرادی یا اجتماعی طور پر رکھ سکتے تھے۔ ایک جانب دولت کے انبار جمع ھوئے اور دوسری طرف فلاکت رونما ھوئی۔ معاشره مالداروں اور ناداروں میں منقسم ھوگیا۔ ماضی میں جب یه آلات پیدائش ارزاں تھے تو کسان ، مزدور اور صناع آسانی سے انکو خرید سکتے تھے۔ اب آزاد صنعت کار اپنی آزادی کھو چکا تھا اور زبردست سرمایه دارانه مشین کا ایک پرزه بن چکا تھا۔ حریت پسند عمومیت نے اس کے لئے حق رائے دھی اور معاھده کی آزادی محفوظ کر دی تھی ، مگر اس میں اس قسم کے لین دین کی سکت نه تھی۔ ایک مسلسل کشمکش کے بعد مزدور رفته رفته ٹریڈ یونینوں میں باھم متحد ھوگئے اور آجروں کے خلاف اپنی ایک جماعت قائم کر لی۔ جیسے ایک آجر کو اپنا کارخانه بند کر دینے کا اختیار تھا ویسے ھی مزدور کو بھی یه حق حاصل تھا که ھڑتال کے ذریعه اپنی اجرتوں میں اضافه کرائے۔ سرمایه داری نے اپنے اندرونی تناقضات کو ترقی دی اور محض سیاسی عمومیت اجتماعی عدل و انصاف پیدا کرنے میں ناکام

رهی - سرمایه داری نے بهی استعماریت اور منڈیوں کے لئے کشمکش شروع کی - جب انسانیت کی معاشری عمارت هر جگه بوسیده هونا شروع هوئی تو مختلف اقوام نے اس سراسیمه تهذیب و تمدن کی بیماریوں کو دور کرنے کے لئے مختلف علاج اور اکسیر اعظم تجویز کئے -

یه بات بخوبی معلوم و مشهور هے که اسلام محض کوئی ما بعد الطبیعی عقیده نهیں هے ، بلکه وه زندگی کا ایسا نظام اور خاکه پیش کرتا هے جو ایک منطقی ربط کا حامل هے - هم اس کے نظریات کا ایک مختصر خاکه پیش کرنے کی کوشش کرینگے - هم دیکھینگے که وه هر بڑے منصوبه کے بعض اجزاء سے اتفاق کرتا هے اور بعض دیگر حصوں کو رد کر دیتا هے - هر منصوبه کا اس طرح مختصر بیان یه ظاهر کر دیگا که کوئی اهم خرابی یا تو اس کی بنیاد هی میں موجود هے یا وه عواقب جو ناگزیر طور پر اس سے رونما هوتے هیں ، اسے فاسد کر رهے هیں -

اصول عدم مداخلت پر مبنی سرمایه‌داری نے مجرد حریت اور مساوات کی تبلیغ کی ، مگر مملکت تنازع للبقاء میں غیر جانب دار ره کر اس کا تدارک نه کر سکی که ظالمانه عدم مساوات سر نه اٹھانے پائے - معاشره کو جاگیری اور شخصی حکومتوں کے ظلم و زیادتیوں سے آزادی دلا کر اس نے ایک قسم کی زر خرید غلامی کی ترویج کی - آزادانه معاهده اور آزاد رائے کا حق بے سود ثابت هوا - سیاسی عمومیت معاشی غلامی کے ساتھ متحد هو گئی - انگلستان اور امریکه جیسے ممالک میں سرمایه‌دارانه جماعت نے ان خرابیوں کو رفته رفته دور کرنے کی کوشش کی جو بے قید سرمایه‌داری سے صورت پذیر هوتی هیں ، لیکن

جو مشکلات اور دشواریاں اس نظام کے مزاج سے رونما ہوتی ہیں، وہ معاشری انتشار و تشتت پیدا کرنے لگیں۔

اسلام حریت، اخوت اور مساوات پر مبنی ہے اور اس کا فلسفیانہ نقطۂ نگاہ خدا پرستانہ ہے۔ زندگی کے تمام فلسفے اور وجود سے متعلق اساسی اندازے زبردست عملی نتائج رکھتے ہیں۔ راسخ الاعتقاد اشتمالیت کا فلسفہ مادہ پرستانہ اور ملحدانہ ہے۔ اس کے برعکس اسلام یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زندگی ایک روحانی ماخذ، ایک روحانی پس منظر، ایک روحانی مطمح نظر اور مقصد رکھتی ہے۔ کائنات پر بے بصر میکانکی قوتوں کی کار فرمائی نہیں ہے اور نہ وہ محض مادہ پرستانہ جدلیات کی تابع ہے۔ زندگی ایک مادی اساس بھی رکھتی ہے اور اس کی اس حیثیت کو اسلام نظر انداز نہیں کرتا۔ یہ اس حقیقت سے باخبر ہے کہ انسان کو روحانی طور پر آزاد رکھنے کی خاطر اسے مادی خوشحالی کا یقین دلایا جائے۔

ایک مہربان، ہمہ داں اور ہمہ تواں ہستی کی تخلیق کردہ کائنات اخلاق سے بے تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ سراسر خیر و خوبی ہے، جس کے طریقہ ہائے عمل چند دائمی اقدار کو وجود بخشتے ہیں۔

روح اور جسم کے درمیان یا دنیا اور آخرت میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ چونکہ خدا ایک ہے، اس لئے جملہ موجودات باہم مربوط ہیں۔ مسلمانوں کو دوسری دنیا کی خوشحالی سے قبل اس دنیا کی خوشحالی کے لئے دعا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اخلاقی علاقۂ علت و معلول یہاں اس دنیا میں جس طرح اپنے اثرات مترتب کرتا ہے، ایسے ہی وہ اپنے اس عمل

کو آخرت میں جاری رکھیگا۔ اشتمالیت تخلیق کے من جانب اللہ ہونے کی تردید کرتی ہے اور اس کی تمام تاریخ انسانیت کی تشریح تمام مادی مظاہر کی طرح سراسر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ صرف پیدائش دولت کے طریقے اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی اقدار پیدا کرتے ہیں۔ تاریخ کی قرآنی تشریح اسکے بالکل برعکس ہے۔ وہ دعوے کے ساتھ کہتا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال قوم کے اعتقادات اور سیرتوں میں تبدیلیوں کے سبب سے ہوتا ہے اور اسلام یہ یقین رکھتا ہے کہ "بصیرت سے محرومی کے باعث قومیں تباہ ہو جاتی ہیں"۔ قرآن کی رو سے حقیقی انقلاب کسی قوم کی زندگی میں واقع نہیں ہوتا جبتک کہ اس کے اخلاقی اور ذہنی نقطۂ نگاہ میں بھی تبدیلی نہ ہو۔ ان اللہ لایغیر ما بقوم حتی یغیر وما بانفسھم (انفال ۵۳)۔ "خدا کسی قوم کی زندگی میں اس وقت تک تبدیلی پیدا نہیں کرتا جبتک کہ ان کے نفوس کے انداز بدل نہیں جاتے"۔ قرآن مادی طور پر خوشحال قوموں کی مثالیں پیش کرتا ہے، جو مادہ پرستانہ تنگ نظری کے سبب تباہ ہوگئیں۔ قانون اخلاق کے ابدی حقائق پر ایمان نہ لانے سے وہ خود غرض اور ظالم بن گئیں۔ انہیں اپنی اصلاح کے لئے بڑی بڑی مہلتیں دی گئیں، لیکن جب انہوں نے خدا کی نشانیوں کی پروا نہ کی تو سزا کا دن ان پر آ پہنچا اور وہ تباہ ہو گئیں۔ "خدا نے خیر و شر کی میزان قائم کی ہے۔ یہ میزان ایسی حساس اور بے خطا ہے کہ ہر ذرہ اس میں وزن کیا جاتا ہے اور جس کا نتیجہ اپنے وقت پر ظاہر ہوتا ہے"۔ تاریخ کا اسلامی نظریہ اس کے خدا پرستانہ نقطۂ نگاہ سے پیدا ہوتا ہے اور تاریخ کا اشتمالی نظریہ اس کی مادیت سے رونما ہوتا ہے۔ یہ دو نظریات کلی طور پر

باہم ایسے مخالف ہیں کہ ایک خدا پرست مسلمان کے لئے ایک مارکسی اشتمالی بننا ناممکن ہوگیا ہے۔

فاشستیوں نے محض پیدائش دولت اور مساویانہ تقسیم کی پرستش کو مملکت کی پرستش سے مبدل کر دیا۔ مملکت کی پرستش بڑے پیمانہ پر قبائلیت کے سوا، جو دور وحشت کی تہذیب کی یادگار ہے، اور کچھ نہیں۔ ”حق ہو یا ناحق میں وطن کی حمایت کرونگا“۔ فاشیت ایک طاقتور مملکت کی تعمیر چاہتی ہے اور بطور فوق الفرد ہستی کے مملکت کی پرستش کی تلقین کرتی ہے۔ اسلام بھی ایک طاقتور مملکت کی تعمیر کی ضرورت محسوس کرتا ہے، جو قوم کے اساسی حقوق کا تحفظ کرے، باہر کے حملہ آوروں سے اپنا بچاؤ کرے اور طاقتور کے ظلم و زیادتی سے کمزور کی حفاظت کرے۔ اسلام ایک اجتماعی اور سیاسی مذہب ہے اور اس کے تمام آئین و دستور کا تعلق معاشری عدل اور معاشری اتحاد سے ہے۔ تاہم مملکت یا اس کے قائدین اور حکمرانوں کی غیر مشروط اطاعت واجب نہیں ہے۔ قانون اور نظم و ضبط کی خاطر بالادستوں کی اطاعت کی تعلیم دی گئی ہے، لیکن یہ اطاعت ہمیشہ احکام کے اخلاقی ہونے سے مشروط ہے۔ ”لا طاعۃ المخلوق فی معصیۃ الخالق“ اسلام کا اساسی اصول ہے۔ صدر حکومت تک کے اعمال و احکام پر ایک ادنیٰ ترین باشندۂ ملک برسر عام نکتہ چینی کر سکتا ہے۔

اسلام کے نزدیک قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ خود آنحضرتؐ نے لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ نے نادانستہ کسی کو کوئی نقصان پہنچایا ہے تو وہ اپنے انتقام کا حق خود آپکے خلاف استعمال کرسکتا ہے۔ فاروق اعظمؓ اور حضرت علیؓ

بلا رو رعایت داد خواہی کے لئے عدالت میں بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ کے بارہا حاضر ہوئے۔

اسلام مشاورت کے ذریعہ حکومت کی تعلیم دیتا ہے۔ آنحضرتؐ تقریباً ہر روز معاملات حکومت میں اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ قرآن مسلمانوں کے اوصاف حسنہ میں سے بطور خوبی کے اس وصف کا اظہار کرتا ہے کہ وہ مستبد اور آمر نہیں ہوتے بلکہ اجتماعی اہمیت کے تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔

قرآن میں مسلمانوں کو امت وسطیٰ کا خطاب دیا گیا ہے، جو دو انتہاؤں میں ہمیشہ خیرالامور اوسطہا پر عمل کرتے ہیں۔ یہ یونانیوں کے نظریۂ حیات کے مشابہ ہے جن کا قول تھا کہ "زیادتی میں کچھ بھی نہیں"۔ خیرالامور اوسطہا کا اصول ارسطاطالیسی اخلاقیات میں محوری نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کی یہ خصوصیت اسکی تمام تعلیمات اور عمل میں جاری ہے۔ اسلام کی جملہ اخلاقیات عملی اخلاقیات ہے، جس نے رینان کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ اسلام بنی نوع انسان کا مذہب ہے۔ یہ فرشتوں کے لئے نہیں ہے۔ ہر حکم میں انسان کی اصلی فطرت کو معہ اس کی تمام جبلتوں اور خواہشات کے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وجدانات اور جذبات زندگی کے لئے بطور آلات کے ہیں۔ یہ نظم و ضبط میں لانے کے لئے ہیں، فنا کرنے کے لئے نہیں۔ آنحضرتؐ کے ایک صحابی نے اپنے رنج و افسوس کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ "جب میں آپ کی صحبت میں رہتا ہوں تو میرا اخلاق رنگ نہایت بلند و برتر رہتا ہے۔ بلند خیالات اور معیارات میری شعوریت میں جاری و ساری رہتے ہیں، لیکن جب میں آپ سے دور رہتا ہوں تو میری اخلاقی سطح یکایک

پست ہو جاتی ہے اور میں اپنی حالت پر بہت افسوس کرتا ہوں" ۔ اس کو سن کر آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ " تم کو مایوس اور پست ہمت نہ ہونا چاہئے ، تم انسان ، ہو فرشتہ نہیں ہو ۔ اگر خدا یہ چاہتا کہ دنیا کو ایسی ہستیوں سے آباد کرے جو اخلاقی کشمکش سے آزاد ہوں ، تو ملائکہ کو یہاں بساتا ۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا ۔ تمہاری اخلاقی پشیمانی اور یہ بلندی اور پستی کا احساس ایمان کی علامت ہے" ۔ یہ سن کر آپؐ کے صحابی کو اطمینان حاصل ہوا ۔

انسانی اصلاح و ترقی کے لئے ایک عظیم لائحۂ عمل کا خاکہ مختلف اقوام کے حالیہ مفکرین ، قائدین اور مصلحین نے کھینچا ہے اور ان منصوبوں میں سے ہر ایک میں چند ایسے اصول ہیں جو اسلامی غیبیات کے اجزا ہیں ، لیکن ان سب میں جزوی صداقتوں پر دروغ بیانی کی حد تک مبالغہ آمیزی کی گئی ہے ۔ دیگر اجزاء کے اخفا کے ساتھ چند اجزاء پر متشددانہ تاکید نے انہیں بحیثیت مجموعی زندگی کے ساتھ سلوک میں ناکام و خاسر رکھا ہے ۔ حریت پسند عمومیت میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اسلام کی جزو لاینفک ہیں ۔ ہر ایک کو مساوی مواقع ملنے اور قانون کی نظر میں سب کے برابر ہونے کی تعلیم اسلام نے دی ہے ۔ نسلی اور قومی تعصبات حریت پسند عمومیت کے عقائد و اعمال کو ابتک فاسد کر رہے ہیں ۔ اسلئے اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ نظریہ کافی حریت پسندانہ نہیں ہے ۔ اسلام اس کے سرمایہ دارانہ نظام کی تائید بھی نہیں کر سکتا جس میں سود کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ دنیا کے حیطۂ خیال میں آنے سے قبل اسلام نے تمام علوم کی تحصیل کے ساتھ آزادی تقریر اور آزادی ضمیر کی تعلیم دی تھی ۔ " دین میں کوئی جبر و

اکراہ نہیں ہے،، یہ قرآن کے اساسی اصولوں میں سے ایک ہے۔ مغربی عمومیت شہری حقوق میں باشندوں کی مساوات کے اسلامی اصول کو تسلیم کرتی ہے، لیکن وہ باشندوں کی اکثریتوں اور اقلیتوں میں تقسیم کو ضروری اور مخالف جماعتوں کے وجود کو لازمی سمجھتی ہے، جن کا خاص مقصد حکومت کے معاملات میں تقریباً ہر چیز کی مخالفت کرنا ہوتا ہے۔ یہ مخالفت صرف مخالفت کی خاطر کی جاتی ہے، جس کا معین مقصد بے اعتبار کرنا اور بر سر اقتدار جماعت کو بالآخر بے دخل کرنا ہوتا ہے۔ اشتمالیوں اور فاشستیوں دونوں نے انتخابی جماعتوں کی سر پھٹول کو ترک کر دیا اور صرف ایک کار فرما جماعت قائم کی، جو افراد یا جماعتوں کی طرف سے کسی قسم کی مخالفت برداشت نہیں کرسکتی۔ اسلام کا سارا رجحان ان دونوں متبادل صورتوں کے خلاف ہے۔ ایک جماعت کی حکومت باشندوں کے آزادانہ احساسات کے اظہار کو سلب کر لیتی ہے۔ ایسی ایک جماعتی حکومتوں میں فرد کے لئے کوئی آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔ اس کو یا تو جماعت کے احکام کی موافقت کرنی پڑتی ہے یا اپنے ضروری حقوق سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح حریت پسند عمومیتوں کی جماعتی سیاسیات کے اقتدار کی جد و جہد میں صداقت اور عام خوشحالی بر طرف ہو جاتی یا نہایت ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ہر پارلیمان میں قوم کے نمائندوں کی گروہ بندی ہوتی ہے، ایک آزاد انسان پابند بن جاتا ہے، اس طریقہ میں ایک آزاد خیال انسان، اگر کبھی وہ منتخب بھی ہو جائے تو نکما سمجھا جاتا ہے، کیونکہ کوئی جماعت اس پر اعتماد نہیں کر سکتی۔ سچی اسلامی مجلس شوریٰ میں جیسا کہ حضرت عمرؓ اکثر طلب فرمایا کرتے تھے، اصحاب فہم و

کردار بغیر کسی آمرانہ جماعت کو ترتیب دئے یا اکثریت اور اقلیت میں منقسم ہوئے، باہم مجتمع ہوا کرتے تھے۔ اگر کوئی اسلامی مملکت مجالس یا مشاورتی جماعتوں کو مخصوص یا عام مسائل کے حل کرنے کے لئے طلب کرے تو ہر رکن ایک آزاد رکن ہونا چاہئے، جو خاص علاقوں یا خاص مفادات کی نمائندگی کرے، جو کسی پارٹی کے طریقہ پر منتخب نہوا ہو، اس کا انتخاب صرف اس کے علم اور قابلیت کی بنا پر ہوا ہو۔

اسلامی مملکت، فاشستی مملکت کے پیش نامہ کے بعض اجزاء کی، اس کے جملہ تصورات کی تائید کئے بغیر، توثیق کرتی ہے۔ فاشیت قوم کو ایک عضوی کل میں ڈھالنا چاہتی ہے، جس میں مفاد کی خاطر لڑائیوں کو اتنا کھل کھیلنے کا موقع نہ دیا جائے جس سے قومی یگانگت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس میں ذاتی ملکیت کے حق کو اسلام کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن آجر و اجیر کے تمام حقوق مملکت کی پوری نگرانی اور اختیار میں ہوتے ہیں۔ فاشستی پیش نامہ میں بہت کچھ ایسی چیزیں ہیں جو قابل تعریف ہیں، لیکن فاشستی مملکت کا اصلی محرک فاسد ہے۔ اس مملکت کا قیام نسلی یا قومی اساس پر ہوا ہے۔ مملکت ایک موضوع پرستش بن گئی ہے، جو خود اپنی ایک زندگی افراد کی زندگیوں کے علاوہ رکھتی ہے۔ یہ مابعدالطبیعی اور افسانوی وجود کسی قسم کے اخلاق مقاصد نہیں رکھتا، فرد کی اخلاقیت کا اس پر انطباق نہیں ہوتا۔ مملکت کا مقصد طاقت اور عظمت کو برقرار رکھنا اور باشندوں کو بے چون و چرا اور پر اسرار اطاعت

کی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ بین الاقوامیت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ عالم گیر انسانیت ایک بے حقیقت چیز سمجھی جاتی ہے، اور اس کے لئے تمام کوششیں منافقت سے موسوم کی جاتی ہیں۔ فاشیت کی رو سے قومی جماعتوں میں حیاتی تنازع للبقاء ہوتا ہے، جو برتر قوت کے ذریعہ بقا کے سوا اور کوئی قانون تسلیم نہیں کرتا، اس لئے جنگ کے لئے تیار رہنا ہر مملکت کا اولین فرض ہے اور امن پسندی ذلیل و خوار لوگوں کا مذہب و ایمان ہے۔ جبری ہم آہنگی کے طریقوں کو جاری کر کے، قوم کے اندرونی تصادمات کو رفع کرنے کے بعد، یہ مختلف مملکتوں کے درمیان آویزشوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ جیسے یک جماعتی آمریت کی بنا قوت ہے، ایسے ہی فاشستی مملکت کا اساسی تصور تصادم ہے۔ اسلام نسلی یا قومی حد بندیوں کو اہم اور قطعی تسلیم نہیں کرتا اور جملہ بین الاقوامی مساعئی امن کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ ان تمام مبادیات و اصول کی اساس پر جو مختلف مذاہب یا قومی جماعتوں میں باہم مشترک ہیں، اسلام نے پر امن تعاون عمل پر بڑا زور دیا ہے۔ قرآن میں یہودیوں اور عیسائیوں کو ان چیزوں کی طرف جو ان میں باہم مشترک ہیں، مسلمانوں کے ساتھ تعاون عمل کی دعوت دی گئی ہے۔ فاشیت نے مجلس اقوام کی اساس کا مضحکہ آڑایا۔ مجلس اِقوام اور اس کی جانشین اقوام متحدہ نے نہایت اعلیٰ نصب العین کا اعلان کیا، لیکن ان کو رو بہ عمل لانے میں بری طرح ناکام رہیں۔ بجائے امن کے قوت ان کے قلوب پر حکمران تھی اور اس ذہنی ساخت کے ساتھ بین الاقوامی انصاف کے دائرہ میں

کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرنے کی بہت کم اُمید ہو سکتی تھی۔ اولاً یہ کہ ان کے لئے انصاف کے ایک کھلے طریقہ پر متفق ہونا ہی دشوار تھا، پھر اگر اتفاق سے وہ راضی بھی ہو جائیں اور انہیں کوئی ایثار و قربانی کرنی پڑے تو نہ وہ اس کا عزم رکھتی ہیں اور نہ ان کے پاس اپنے فیصلہ کو رو بہ عمل لانے کی کوئی قوت ہے۔ مجلس اقوام پر فاشستی اعتراض اگرچہ اس کی عدم صلاحیت پر مبنی نہ تھا، لیکن سرے سے بین الاقوامی انصاف کے تصور ہی کو رد کر دیا گیا تھا۔ فاشستی تصور یہ ہے کہ طاقتور کا حق ہے کہ وہ قبضہ کرے اور تصرف میں رکھے، جہاں تک کہ ممکن ہو سکے، اور یہ کمزور کی قسمت ہے کہ وہ مغلوب، محکوم اور تباہ حال رہے۔ اگرچہ اندرون مملکت اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنے اور قومی یگانگت کو حاصل کرنے کے فاشستی طریقوں کی ستائش کی جاسکتی ہے لیکن ایک حقیقی اسلامی مملکت کے لئے اس کا اتباع ایک زبردست اخلاقی زیاں ہے، کیونکہ اسلام کا مقصد تمام نسلی اور قومی حد بندیوں سے ماوراء ہو کر عالم گیر امن و امان کا قیام ہے۔

قرآن نے اپنی اس تعلیم سے ایک حقیقی اور مؤثر انجمن اقوام کی اساس کا اعلان کیا ہے کہ اگر دو جماعتیں اپنے کسی اہم حق کے لئے آپس میں لڑ پڑیں تو غیر جانب دار جماعتوں کی طرف سے منصفانہ طریقہ پر اس قضیہ کے تصفیہ کی کوشش کی جانی چاہئے۔ فیصلہ صادر ہونے پر متخاصم جماعتوں پر اس کی پابندی لازمی ہوگی۔ اگر کوئی جماعت سرتابی کرے اور فیصلہ کے مطابق عمل کرنے سے انکار کرے تو تمام جماعتوں کو باہم ملکر قوت کے ذریعہ اس کو منوانا چاہئے۔

یہ ظاہر ہے کہ کوئی مجلس اقوام کبھی بااثر نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اس قرآنی حکم پر عمل پیرا نہ ہو۔

مملکت فلاح و خیر

جدید مملکتوں نے تدریجاً ایک مملکت فلاح و خیر کا تصور پیدا کیا ہے، مگر ایک سیاس و تاریخ داں کے لئے اس حقیقت سے انکار دشوار ہوگا کہ مملکت فلاح و خیر کو تشکیل دینے والے اور اس کو رو بہ عمل لانے والے پہلے مدبر آنحضرتؐ تھے۔ اس وقت بھی جب کہ انگلستان اپنے سیاسی اداروں کو کافی ترقی دے چکا تھا اور پارلیمانی حکومت ایک قابل عمل اساس پر استوار کرلی تھی تو اس کا زبردست فلسفی ھربرٹ اسپنسر اصول عدم مداخلت کی حامی ایسی مملکت کے تصور کی تائید کر رہا تھا، جو محض ایک پولیس والے کی طرح کارگذار ہو۔ ایسی انتظامی مملکت اپنے باشندوں سے محصول جمع کرتی ہے، تاکہ محصول ادا کنندوں کے لئے فوج اور پولیس رکھے اور حملہ آوروں اور قانون شکنوں کے خلاف باشندوں کی محافظت کرے۔ اس کا کام باشندوں کے قتل، ذاتی نقصان اور چوری یا فریب سے اھل ملک کی حفاظت کرنا ہے۔ اس کے علاوہ مملکت زیادہ سے زیادہ تعلیم اور صحت عامہ پر روپیہ خرچ کرسکتی ہے۔ قوم کی معاشی زندگی میں اسپنسر مملکت کی مداخلت کا خواہاں نہ تھا، جو صرف آزادانہ معاہدہ پر مبنی ہونی چاہئے۔ قانون طلب و رسد بطور خود توازن پیدا کردے گا۔ آدم اسمتھ نے جو معاشیات میں اصول عدم مداخلت کا باوا آدم ہے، حکومت کے اعمال کو صرف تین چیزوں تک محدود کیا ہے۔

اس کا قول ہے کہ ''فطری آزادی کے اصول کے بموجب بادشاہ کو صرف تین فرائض انجام دینے پڑتے ہیں۔ حقیقتاً زبردست اہمیت رکھنے والے تین فرائض جو فہم عامہ کے لئے سادہ اور آسان ہیں۔ اولاً معاشرہ کو دیگر آزاد معاشروں کے تشدد اور حملہ سے محفوظ رکھنا۔ ثانیاً سوسائٹی کے ہر رکن کی اس کے دیگر ارکان کے ظلم و تشدد سے تا حد امکان حفاظت کرنا یعنی صحیح عدل و انصاف قائم کرنا۔ اور ثالثاً چند قومی تعمیرات اور چند ادارہ جات کا قیام، جن کا قائم و برقرار رکھنا کسی فرد یا افراد کی قلیل تعداد کے مفاد کے مطابق نہیں ہو سکتا''۔ (دولت اقوام، کتاب چہارم، باب نہم)۔ مملکت کے یہ محدود فرائض آجروں اور سرمایہ داروں کو نفع اندوزی کی بے روک ٹوک آزادی عطا کرتے ہیں اور دولت کی غلط تقسیم معاشرہ کو دو متحارب گروہوں میں بانٹ دیتی ہے۔ مملکت کی طرف سے کوئی حل تجویز ہونے سے قبل مالداروں اور ناداروں کے درمیان خلیج وسیع ہو گئی۔ مزدوروں کی ہڑتال کے خلاف حکومت پولیس کے فرائض انجام دینے لگی۔ رفتہ رفتہ سیاست دان اور انسانیت دوست مفکرین نے مملکت کے فرائض میں وسعت دینے کی تحریک شروع کر دی۔ پہلا حل معاشری عدم مساوات کو جزوی طور پر ہموار کرنے کے لئے محصول کا ایک اصلاح شدہ نظام تجویز کیا گیا۔ سرمایہ دارانہ مملکتوں نے اپنے دائرۂ عمل کو وسیع کرنا شروع کیا۔ رہائش، بے روزگاری کا بیمہ، تندرستی کا بیمہ، وظیفۂ کہن سالی اور دیگر متعدد ہمدردانہ تدابیر رفتہ رفتہ تجویز کی گئیں، اور بعض ممالک نے انہیں ایک حد تک اختیار بھی کیا۔ آخر کار ہم

بیورج کے منصوبہ پر پہنچتے ہیں، جس نے ایک مکمل لائحۂ عمل ایک مملکت خیر کے لئے ترتیب دیا ہے - یہ رجحانات اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ دنیا کس طرح آزمائش و فروگذاشت کے طولانی عمل سے گذر کر درجہ بہ درجہ آنحضرتؐ کے تصور مملکت کی معقولیت اور صداقت دیکھنے کے لئے قریب آ رہی ہے -

سود کی بابت اسلامی نقطۂ نگاہ بہت واضح ہے - آنحضرتؐ اس پر مصر تھے کہ تمام معاشی معاملات میں سود کا خاتمہ ہو جانا چاہئے - اس وقت مغرب کے تمام بڑے معاشئین کسی قدر جھجکتے ہوئے اسی نظریہ کے قریب آ رہے ہیں کہ بنک کاری کو قومی بنانا چاہئے اور سود پر قابو حاصل کیا جائے - کینیس نے تو مملکتوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ وہ اس خصوص میں اخلاقی اور مذہبی تحدیدات عاید کریں - لیکن اب بھی معاشئین یہ خیال کرتے ہیں کہ سود کو مطلقاً موقوف کر دینا کوئی قابل عمل تجویز نہیں ہے - اس پر صرف قابو پانا اور پیدائش دولت کے کام میں آنے کے لئے اسکو انتہائی ادنیٰ سطح پر لے آنا چاہئے - اسلام سرمایہ کے مالک کو دولت آفرین مزدور کے ساتھ حصہ دار بننے کی اجازت دیتا ہے تاکہ سرمایہ پیدائش دولت کے ساتھ ناقابل شکست طور پر مربوط رہے اور تجارت کے نشیب و فراز میں دونوں شریک رہیں - جب سود پید آوری سے محروم ہو جاتا ہے تو مدیون تمام خطرات برداشت کرتا ہے در آں حالیکہ دائن کو حکومت کی طرف سے یہ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ وہ قانوناً اپنی سودی رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے - اسلامی نظام میں اس سرمایہ پر جو بیکار پڑا ہو، زکواۃ عاید کی گئی ہے -

اسلام پیدائش دولت اور تجارت کو فروغ دینے کا خواہاں ھے اور یہ چیز اکتناز کے خلاف اس کے تمام سخت احکام کی تشریح کرتی ھے۔ اندوختہ دولت کا ایک حصہ حکومت لے لیتی ھے اور اسے اجتماعی فلاح و بہبود خاص کر غریب طبقوں کو مدد دینے میں خرچ کرتی ھے۔ مملکت خیر و فلاح کو انسانی محنت اور قدرتی ذرائع سے نفع اٹھا کر پیدائش دولت کی ھمت افزائی کرنا پڑتی ھے۔ لیکن اس کو اس سے بھی باخبر رھنا پڑتا ھے کہ دولت ساری ھئیت اجتماعیہ میں گشت کر رھی ھے اور کسی ایک حصہ میں بے جا فراوانی اور کسی دوسرے حصہ میں بے انتہا کمی کا باعث نہیں بن رھی ھے۔ قرآن آگاہ کرتا ھے کہ "خبردار! دولت صرف مالداروں میں گردش نہ کرتی رھے"* - بے محنت کے کمائی ھوئی دولت زیادہ تر سود اور فاضلات کے اکتناز سے جمع ھوتی رھتی ھے۔ یہ وراثت کے غیر منصفانہ قوانین یا کسی ایک کو تمام جائیداد کی وصیت سے بھی جمع ھوتی ھے۔ حق ملکیت اور ذاتی جائداد کے اصول عطا کر کے اسلام نے ایک طرف ناواجبی دولت کے اکتناز اور دوسری طرف افلاس کے خلاف ضروری تحفظات کر دئے ھیں۔ تمام بڑے مذاھب نے ھمیشہ خیرات پر بہت زور دیا ھے اور بخیل و بے حس مالداروں کو مطعون کیا ھے۔ لیکن یہ اسلام ھی تھا جس نے منصفانہ تقسیم دولت کے مسئلہ کو کامیابی کے ساتھ عملی طریقہ پر حل کرنے کی کوشش کی۔ انسانی فطرت کا اندازہ کر کے اس نے یہ دریافت کر لیا کہ محض اخلاقی پند و موعظت سود مند نہ ھوگی جب تک کہ قوم کا معاشی نظام ضروری قوانین کے ذریعہ

---

* کیلا یکون دولة بین الاغنیاء — حشر — ۷۔

از سر نو ترتیب نہ دیا جائے ۔ مذہبی عقیدہ اور اس کا زبانی اقرار ناکافی ہے ۔ قرآن میں نیک لوگوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں ۔ اور نیک کاموں میں خیرات پر بحیثیت اصل نیکی کے زور دیا گیا ہے ۔ پھر خیرات کی ارادی اور جبری صورت میں تقسیم کی گئی ہے ۔ اپنی خوشی سے خیرات کرنے کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ نیکو کار اپنی ضرورت سے زائد کوئی چیز نہیں رکھتے ۔ وہ اندوختہ نہیں کرتے بلکہ اپنی زائد دولت کو خرچ کرتے ہیں ۔ زکواۃ جس کی وصولی کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے ، ہر قسم کی مصیبتوں میں امداد کے لئے ہے ۔ اسلام کے اہم ارکان میں سے یہ ایک ہے ، جس کا بیان قرآن میں اکثر نماز کے ساتھ اس تنبیہ سے کیا جاتا ہے کہ جو زکواۃ یا خیرات نہیں دیتے ان لوگوں کی عبادتیں خدا کے حضور بے اثر اور ناقابل قبول ہیں ۔ اپنے گرد و پیش کی معاشی زندگی پر نظر فرما کر آنحضرتؐ نے متعدد موقعوں پر اس امر کی صراحت فرمائی کہ کس مقدار سے اوپر فاضل دولت شمار کی جائے اور کس حد تک اس پر محصول عاید کیا جائے ۔ اگر معاشرہ کے معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں تو ہمیشہ منصوبہ کے اقتضا اور مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس کی جزئیات میں حالات کی مناسبت سے مطابقت دی جا سکتی ہے ۔ اسلام کی رو سے جمع شدہ فاضل دولت اخلاقی اور معاشی مضرت کا موجب ہوتی ہے اور غریب ، مفلوک الحال ، بے بس لوگوں کے اخلاق بگاڑ دیتی ہے ، جس سے پورا معاشری نظام فاسد ہو جاتا ہے ۔ زکواۃ کے معنی پاکیزگی ، افزونی اور بخشش و رحمت کے ہیں ۔

جو جماعت اس کی پابندی کرتی ھے وہ پاک ھوتی اور پھلتی پھولتی ھے، کیونکہ اصلی خوشحالی بجز اجتماعی صحت مندی کے اور کچھ نہیں۔ معاشی زندگی کی کارکردگی اور ترقی کا دار و مدار اسی پر ھے۔ یہ مسلمانوں کے بیت المال کا محور ھے۔ آنحضرتؐ کو تمول اور افلاس دونوں سے اندیشہ تھا۔ آپؐ نے غربت و افلاس کے انسداد کو اسلام کے اھم مقاصد میں سے بیان فرمایا ھے۔ متعدد دیگر مذاھب نے افلاس کی مدح سرائی کو روحانیت کی حد تک پہنچا دیا ھے۔ یہ انداز فکر افلاس اور سادہ زندگی میں خلط مبحث کا نتیجہ ھے۔ سادہ زندگی کی آنحضرتؐ نے توصیف فرمائی اور اس پر عمل کر کے دکھلایا، لیکن افلاس کے متعلق آپؐ نے خدا سے دعا فرمائی کہ اسے انسانوں سے دور رکھے چنانچہ آپ کا ارشاد ھے ''الفقر سواد الوجہ فی الدارین''۔ افلاس دونوں جہان میں باعث روسیاھی ھے، جس کے سبب بعض دفعہ ایمان سے بھی ھاتھ دھونا پڑتا ھے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ آپ دولت کی افزونی سے ھراساں تھے۔ ایک روایت ھے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''مسلمانو! مجھے تمہارے افلاس سے زیادہ تمہارے تمول سے اندیشہ ھے''۔ آپ کے بعد جب ایران فتح ھوا اور بیش قیمت مال غنیمت کے انبار حضرت عمرؓ کے سامنے لگائے گئے تو آپ کی آنکھیں اشکبار ھو گئیں۔ کسی نے دریافت کیا ''اے امیر المومنین! یہ محل شادمانی اور مسرت کا ھے نہ کہ غم و اندوہ کا۔'' اس پر خلیفہ نے ارشاد فرمایا کہ ''مجھے اندیشہ ھے کہ کہیں یہ اسلام کے لئے خطرہ نہ ثابت ھو''۔ یہ اظہار خیال اسلام کے ان مخالف اور جاھل نکتہ چینوں کی آنکھیں کھولے گا جو یہ کہتے ھوئے

نہیں شرماتے کہ مال غنیمت کی محبت سابقین اسلام کی جنگ آزمائیوں کی اصل محرک بنی ہوئی تھی ۔

زکواۃ کا آئین ، جو اسلامی فلاحی مملکت کا ایک محوری نقطہ ہے ، اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم اس کی مزید وضاحت کریں ۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے ، ” صرف زکواۃ کی ادائی ھی میں تمہارے اسلام کو پناہ مل سکتی ہے “ ۔ اپنے مال و دولت میں سے زکواۃ ادا کرو ، یہ تمہیں پاک و صاف بنائے گی اور تمہیں ان کا حق ادا کرنے کے قابل بنائے گی جو تمہارے رشتہ دار ہیں ۔ سائل ، ہمسایہ اور مسکین کے حقوق سے با خبر رہو اور فضول خرچی میں مبتلا نہ ہو “ ۔ ” جو قوم زکواۃ کو موقوف کر دیتی ہے ، وہ قحط و فلاکت سے ہم آغوش ہوتی ہے “ ۔ ”بغیر زکواۃ کے اللہ کے نزدیک نہ ایمان قابل قبول ہے نہ عبادت ۔“

کوئی مملکت اسلامی مملکت کہلانے کی مستحق نہیں اگر وہ زکواۃ کے احکام سے بے اعتنائی برتتی ہے ، کیونکہ اسلام کی رو سے مملکت کا مقصد بجز اجتماعی فلاح و بہبود کے اور کچھ نہیں اور اجتماعی فلاح بغیر زکواۃ کے ناممکن ہے ۔ اگر انفرادی حق قانون سازی اور ذاتی ملکیت کو انفرادی آزادی کے ایک ضروری عنصر کے طور پر عطا کیا جائے اور اگر یہ نظام بلا اصلاحی محاصل کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے ، تو بعض لوگ یقیناً اپنی حاجت سے زیادہ اس کو حاصل اور جمع کرلیں گے اور دوسرے بے نوائی اور افلاس میں چھوڑ دئے جائیں گے ، اس لئے طریقۂ تحصیل اور تقسیم دولت پر حکومت کا اختیار اور قابو ہونا چاہئے ۔ اسلام کی سیاسی

کامیابی کے بعد بعض عرب قبائل اسلامی مملکت کے حلقۂ اثر میں روح اسلام کو بخوبی سمجھے اور اخذ کئے بغیر بسرعت داخل ہونا شروع ہوئے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب وہ اقرار کریں کہ وہ ایمان لے آئے ہیں تو ان سے کہا جائے کہ انہوں نے صرف اسلام کی قوت کے آگے اپنا سر اطاعت جھکا دیا ہے، ایمان ایک قلبی وصولیابی کا معاملہ ہے۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد ایسے متعدد قبائل نے زکواۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا اور عدم ادائیگی محصول کی مہم شروع کر دی۔ آنحضرتؐ کے جانشین متحیر تھے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا کیا جائے جو خود کو مسلمان کہتے ہوں، خدا کی وحدانیت پر ایمان لاتے ہوں اور نماز ادا کرتے ہوں۔ ایک خلیفہ اہل ایمان کے خلاف کس طرح بر سر جنگ ہو سکتا ہے؟ ابتداً حضرت عمرؓ جیسے مضبوط ارادہ رکھنے والے لوگوں کا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن اس خصوص میں آنحضرتؐ کے خلیفہ اول حضرت ابو بکرؓ اسلام پر ایک صاف اور واضح مدبرانہ نظر رکھتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ بغیر زکواۃ کے ایمان نامکمل رہتا ہے۔ نمازیں ادا کرنا، لیکن بہبود عامہ میں حصہ نہ لینا اور اس کے لئے ایثار و قربانی نہ کرنا، فی الواقع ایمان کی نفی و انکار ہے۔ آپ نے فرمایا میں ان سے لڑوں گا جنہوں نے اس محصول کی ادائی سے انکار کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی آپ کی اعلٰی بصیرت اور اٹل فیصلہ کی داد دی اور واقعتاً ایک خوں ریز جنگ اس مقصد کے تحت لڑی گئی۔ مقام افسوس ہے کہ مابعد زمانوں میں یہ لازمی محصول، جو بہی خواہ مملکت کا سرمایۂ قوت تھا اور جس کی تحصیل و تقسیم

مملکت کے ذریعہ ہونی چاہئے تھی ، اختیاری بن کر رہ گیا ، اور اس کو ادا کرنے والے کے ضمیر و ایمان پر چھوڑ دیا گیا ۔ مغرب کی معاشیات عدم مداخلت نے معاشی توازن پیدا کرنے کے لئے افراد کی روشن خیال خود مطلبی پر اعتماد کیا تھا اور اب اس چیز کو دنیا جانتی ہے کہ انسانی وجدانات کے غلط مطالعہ نے کیا افراتفری برپا کر رکھی ہے ۔ خود مطلبی ایسی روشن خیال ثابت نہیں ہو سکتی کہ انفرادی اور اجتماعی مفادات کسی من جانب اللہ انتظام سے ایک دوسرے کے موافق ہو جائیں ۔ مسلمان مملکتوں نے جو زکواۃ کے معاملہ میں مسلمانوں کے ایمان پر اعتماد کیا تو وہ غلطی کی مرتکب ہوئیں ۔ حکومت کے اختیار و قابو سے نکل کر زائد سرمایہ بیت المال میں جمع نہ ہو سکا اور فلاح و بہبود کے بہت سے منصوبے بھی انفرادی ضمیر و ایمان پر چھوڑ دئے گئے ۔ اسلام نے پیدائش و تقسیم دولت کے انتظام کی ذمہ داری حکومت پر عائد کی تھی اور اسلامی حکومت کو ہمہ گیری نظام اختیار کئے بغیر اس کام کے کرنے کا حکم دیا گیا تھا ۔ قانون سازی کا اہم مسئلہ حکومت کی مداخلت اور فرد کی آزادی دونوں کے حدود کے تعین کے لئے ہے ۔ اسلام نے اس مسئلہ کو ایک دلپذیر اور سہل العمل طریقہ پر حل کیا ہے ۔ لیکن مسلمان مملکتوں نے خود اس تجویز کو غارت کر دیا ۔ زکواۃ ایک محصول ہے جو سرمایہ پر عاید کیا جاتا ہے ۔ یہ دولت کو ان حصوں میں گردش کراتا ہے جو اس کے زیادہ حاجت مند ہوتے ہیں ۔ زکواۃ دولت اور اجتماعی فلاح و بہبود میں ربط پیدا کرتی ہے ۔ اور اصول عدم مداخلت کی نقیض ہے ۔ مسلمان مفکرین اور مشہور عالمان دین ، اخلاقی پاکیزگی اور عام خوشحالی کے

لئے زکواۃ کی اھمیت کو تسلیم کر چکے ھیں۔ یہاں حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک عبارت پیش کی جاتی ھے جو اسلام کے ایک ولی صفت مفکر تھے۔ "اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی سوء فہم نہ ھونا چاھئے کہ زکواۃ کا حکم دو مقصدوں کی تکمیل کے لئے دیا گیا ھے۔ ایک تادیب نفس اور دوسرے بے نوائی کے خلاف فراھمئی اسباب۔ مال و دولت سے بخل، خود غرضی، باھمی عناد، نفرت اور اخلاقی تنزل پیدا ھوتے ھیں۔ ان خرابیوں کا بہترین علاج مال و زر کی فیاضانہ بخشش و عطا ھے۔ اس سے بخل کا استیصال اور خود غرضی کا علاج ھوتا ھے۔ یہ معاشی رخنوں کو پر کرتی اور اس کی جگہ جذبۂ رفاقت پیدا کرتی ھے۔ یہ رفاقت اعلیٰ اخلاقی کردار کا سنگ بنیاد بن جاتی ھے اور جب یہ نشو و نما پاتی ھے تو ایماندارانہ سلوک کے عادات کی پرورش کرتی ھے۔ آھستگی سے لیکن یقین کے ساتھ یہ شریفانہ اوصاف انسان کو اخلاقی برتری کا نمونۂ کمال بنا دیتے ھیں۔ اس کے معنی تادیب نفس کے ذریعہ اصلاح ذات کے ھیں۔

"زکواۃ قومی اور معاشری افلاس کے خلاف ایک نہایت مؤثر تدبیر ھے، کیونکہ معاشرہ کی بنیاد اس وقت تک محکم نہیں ھو سکتی جبتک کہ وہ کسی درست معاشی اساس پر قائم نہ ھو۔ ایک سوسائٹی اپنے معاشی نظام ھی کے ذریعہ اپنے محتاج اراکین کی ضرورتوں اور حاجتوں کا ان کی حیثیت کے مطابق انتظام کر سکتی ھے۔ وہ گداگری کو پھیلنے سے روکتی ھے کیونکہ نادار، معذور، اپاھج، یتیموں اور بیواؤں اور ایسے ھی محتاجوں کے دیگر تمام قبیل کی مناسب طریقہ پر نگہداشت کی جاتی ھے اور انہیں بھیک مانگنے کی ذلت اور

بے عزتی سے بچایا جاتا ہے۔ یہ مملکت ہی کا کام ہے، جس کو ان لوگوں کی پرورش و پرداخت کا کفیل ہونا چاہئے۔ مگر یہ بوجھل ذمہ داری اسی وقت قابل اطمینان طریقہ پر انجام دی جا سکتی ہے جبکہ حکومت کے معمولی ذرائع آمدنی کے ساتھ زکواۃ کی صورت میں ایک معتدبہ رقم دولت مندوں سے حاصل ہوتی رہے"۔

قرآن نے چند ایسے طبقوں کے نام گنائے ہیں جو زکواۃ کی رقم سے امداد و اعانت کے مستحق ہیں۔ انما الصدقات للفقرآء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفة قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل ط فریضة من اللہ ط واللہ علیم حکیم ○ (التوبہ، ۶۰) "خیرات غرباء ومساکین کے لئے ہے اور ان کے لئے جو اس کام پر مامور ہوں اور ان کے لئے جو جدید الایمان ہیں اور ان کے لئے جو غلامی اور قرض میں ہیں اور یہ راہ حق میں خرچ کرنے اور مسافروں کے لئے ہے، یہ خدا کا حکم ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت رکھنے والا ہے"۔ غریب اور محتاج یہ دو لفظ اس قدر جامع ہیں کہ ان تمام حالتوں کی ایک فہرست بنانا ناممکن ہو جائیگا جن میں انسان ضروریات زندگی کے لئے اعانت کا خواستگار ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے محتاجوں کی قبیل میں نہ صرف ملازمت کے نا اہل لوگوں کو بلکہ بے روزگاروں کو بھی شامل فرمایا ہے، یعنی ایسے لوگ جو کام کر سکتے ہیں لیکن جنہیں کام نہیں ملتا۔ ان میں سے ایک قسم خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ آنحضرتؐ انسانیت کو زبردست آزادی دلانے والے اور اس کے بہت آرزومند تھے کہ غلامی کے رواج کو منسوخ

کر دیا جائے - آپ کا ارشاد ہے کہ کسی غلام کو آزاد کرنا انتہا درجہ قابل قدر عمل ہے - چونکہ قدیم تہذیبوں کا جملہ معاشی نظام غلامی کے رواج پر قائم تھا اس لئے بیک جنبش قلم اس کو ختم کرنا ناممکن تھا - چند اعمال کے ارتکاب اور ترک فعل کے کفارہ میں بطور تدبیر کے غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا - غلاموں کے ساتھ رفق و ملاطفت کا سلوک کرنے کے لئے آقاؤں سے پر جوش اپیلیں کی گئیں - لیکن اس اصول کی رو سے کہ حکومت تمام اہم معاملات کو، مع افراد کے آزادانہ حق قانون سازی کے ، اپنے ہاتھ میں لے لے ، مملکت پر بھی یہ چیز لازم گردانی گئی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ غلاموں کی آزادی پر صرف کرے - حکومت کو اس شخص کی بھی اعانت کرنی چاہئے جو قرض میں گھرا ہوا ہو اور بدقسمتی سے اس حال زار میں مبتلا ہوگیا ہو - غیر مستحق کو قرض داری سے رہائی بخشنا بھی حکومت کا ایک فرض ہے - فی سبیل اللہ کی اصطلاح رفاہ عامہ کے تمام اعمال پر حاوی ہے -

یہ درست ہے کہ اجتماعی تحفظ کے ایسے وسیع منصوبہ کے لئے ایک رقم خطیر درکار ہوگی ، جو حکومت حاصل کرسکتی ہے - دولت کی تقسیم اور حصول مواقع کی یکسانی اسلامی نظام سیاست کے اساسی مقاصد ہیں - اگر زکواۃ کی رقم اور دوسری قومی آمدنیاں انسان کو مصائب سے نجات دلانے میں قاصر رہیں تو مملکت ان لوگوں سے مزید مطالبہ کر سکتی ہے جو اس کی استطاعت رکھتے ہیں - سرمایہ دارانہ ممالک میں اگر سرمایہ دار کو یکایک قیمتوں کے گر جانیکا اندیشہ ہو تو وہ اپنی فاضل پیداوار کو تلف کر سکتا ہے ، اور اس اتلاف میں

حکومت بھی اس کی دستگیری کرتی ہے، حالانکہ لاکھوں ایسے محتاج لوگ ہوتے ہیں جنہیں ان چیزوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ سرمایہ دار کہتے ہیں کہ حکومت کی مدد سے محتاجوں کی حاجت روائی دولت پیدا کرنے والوں کو غریب اور مفلس کر دیگی اور جو امداد پا رہے ہیں، ان کے اخلاق بگاڑ دیگی۔ آنحضرتؐ بھی اس حقیقت سے با خبر تھے کہ خیرات لینے والے کو ہر وقت اخلاق کے بگڑنے کا خطرہ لگا رہتا ہے اور اس لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپؐ ایک طرف تو لوگوں کو فیاض اور دریا دل ہونے کی نصیحت اور دوسری طرف گداگری کی روک تھام فرماتے ہیں۔

باب چہاردھم

تجدید و احیاء

یہ نظریہ تمام تصوری فلسفہ کے مسلمات اور جملہ خدا پرستی کے معتقدات کی اساس ہے کہ زندگی کے بنیادی اقدار ابدی اور کائیناتی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ عالم تغیر و انقلاب کے محکم حقائق ہیں۔ یہ محبت و صداقت اور حسن و خوبی کے اقدار جزوی طور افراد، اشیاء اور ہیئات اجتماعی میں جلوہ فرماء ہیں۔ ٹینی سن کے الفاظ میں: ''بار الہا! وہ تیرے ہی پراگندہ انوار ہیں، اور تیری تجلیات ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔'' جملہ زندگیاں ایک یا زیادہ اقدار کی صورت پذیری سے ترقی پاتی ہیں، اور ان کی خلاف ورزی سے جامد و بے حس یا فنا در آغوش ہو جاتی ہیں۔ ادنٰی درجہ پر صداقت کی قدر مادی کائینات میں بھی جلوہ فرما ہے، جس کی نوا میں فطرت کے ساتھ موافقت صداقت کی غیر تغیر پذیری کی آئینہ دار ہے۔ اسی وجہ سے افلاطون نے عالم مثال کی ہمیشگی اور غیر تبدل پذیری کی تعلیم و تفہیم میں ریاضی کو ایک تمہیدی حیثیت عطا کی ہے۔ وائٹ ہڈ (Whitehead) کے قول کے مطابق ''وہ عالم جو استمرار پر زور دیتا ہے، عالم اقدار ہے۔ قدر اپنی ماہیت میں لازمانی اور لامکانی ہے۔ اس کی اصلیت کسی عارضی حالت سے پیوست نہیں ہے۔ کسی فنا پذیر حالت کا اتصال صرف اس لئے گرانقدر ہے کہ وہ کسی لافانیت سے اشتراک رکھتا ہے۔'' خدا کا اسلامی تصور عالم اقدار کے دائمی ثبات اور غیر تغیر پذیری کا تصور ہے۔ فطرت اللہ قدر کی غیر تغیر

پذیر خاصیت کا نام ہے ۔ اس امر کا ذہنی شہود حکمت ہے ، جسے قران حکیم خیر کثیر سے تعبیر کرتا ہے ۔ یہ حکمت عمل میں جلوہ فرما ہو کر حیات طیبہ کی تشکیل کرتی ہے ۔ انسان اپنی عظیم امکانی قوت اور خلقی صلاحیت کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ اخلاق الٰہی سے تخلق پیدا کرکے ، جس کے مطابق اس کی فطرت کی تخلیق ہوئی ہے ، دیگر مخلوقات سے بلند ہوتا رہتا ہے ۔ قرآن کی رو سے مذہب حق کی اولین صفت اسی ابدی حقیقت کی یافت و شہود ہے ۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا ط لا تبدیل لخلق اللہ ط ذالک الدین القیم ق (الروم۔ ۳۰) ''اللہ کی فطرت جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ۔ اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی ، یہی سچا اور ٹھیک دین ہے ۔'' اس دین حق کو قرآن اسلام سے تعبیر کرتا ہے ۔ جس کے معنی خدا کے آگے سر نیاز جھکا کر داخلی و خارجی امن و سلامتی حاصل کرنے کے ہیں ۔ بالفاظ دیگر زندگی کو ابدی اقدار کے ساتھ ہم آہنگی میں تدریجاً ڈھالا جاتا ہے ۔ قرآن کائنات کے دو رخوں ، ''عالم امر'' اور ''عالم خلق'' کو پیش کرتا ہے ۔ 'عالم امر' ابدی اقدار کے لئے ''ام الکتاب'' کی حیثیت رکھتا ہے ۔ دنیوی تغیر و تبدل کے احکام ، جو کسی قدر کے حامل ہوتے ہیں ، ان کا اجراء اسی ''لوح محفوظ'' سے ہوتا ہے ۔ واقعات و حالات ، عالم تغیر میں ، تخلیقی و ارتقائی مقاصد کے تحت بدلے جاتے ہیں ، لیکن اقدار جن کی وصولیابی پیش نظر ہوتی ہے ، وہ اپنی اصلی و ابدی ماہیت نہیں بدلتے ۔ ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا ط (البقرہ۔ ۱۰۰) ''ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں ، یا فراموش ہو جانے

دیتے ھیں ، تو اس کی جگه اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کر دیتے ھیں۔" قرآن ایک طرف قوانین فطرت اور ابدی اقدار کے اٹل ھونے کو اور دوسری طرف دائمی ارتقائی تبدیلی کو ، بحیثیت فطرت الٰہی کے پیش کرتا ھے اور اس کی تعریف بطور دین حق کے کی گئی ھے جو کل کائینات ، بنی نوع انسان اور اس کی تحت وفوق مخلوقات کا مذھب ھے۔

عارضی واقعات کی فنا پزیر دنیا میں عالم ثبات و دوام کو مادی شکل میں بتدریج محسوس کیا جانے لگا ھے۔ تجربۂ قدر واقعات کی عارضی دنیا میں خود اپنی حقیقی لا فانیت کی ایک مثال پیش کرتا ھے۔ سائنس کا قانونِ فطرت اور انسانی انا کی شخصی انفرادیت ، اس طریق عمل کے نمایاں خد و خال ھیں۔

قرآن جملہ خدا پرست مذاھب کی تصدیق کرتا ھے۔ اس کی تعلیم یه ھے که انبیائے سابقین سے لے کر آنحضرتؐ تک اصول دین میں کوئی تبدیلی نہیں ھوئی۔ ابراھیمؑ ، موسیٰؑ ، عیسیٰؑ ، اور محمد صلعم ، اور وہ تمام نامعلوم اور فراموش شدہ پیغمبر جنھوں نے خالق کائینات کی وحدانیت کا اعلان کیا ، سب ایک ھی برادری کے افراد تھے۔ رسوم و عادات ، طریقه ھائے عبادت و رواج ، معاشری و معاشی سانچے ، سب حالات کے تحت تبدیل ھوتے رھے اور دین کی اصل حقیقت ان مختلف صورتوں میں اپنا ظھور کرتی رھی۔ انسانیت حقیقی اقدار کی دید و شہود سے محروم ھوکر بارھا خود اپنے آفریدہ وھم و گمان کی یا کسی مخلوق کو الوھیت کا درجه دے کر ان کی پرستش میں مبتلا ھوتی رھی۔ مذھبی عقائد ، رسوم اور رواج نے ھر دین میں مرکزی حیثیت اختیار کرلی اور بجائے روح و معنی کے لفظ و صورت کی پرستش کی جانے لگی۔ غیر ضروری

اختلافات پر شدت نے انسانیت کو متحارب مذہبی فرقوں میں منقسم کر دیا - سچے مذہب کی آفاقیت اور وسیع المشربی قبائلی ، فرقہ واری اور مقامی ہو کر رہ گئی - معتقدات استخوان بے مغز ہو کر رہ گئے - نفرت نے محبت کی جگہ لے لی ، اور باھمی حق و انصاف کے اصول کو بھلا دیا گیا - چند حکمران طبقے دین و مذہب کو اپنی جاگیر بنا بیٹھے - انبیاء کے قصص جس طرح سے قرآن میں بیان ہوئے ہیں ، ان میں اصلاح عقائد و رسوم کی تمام کوششوں کے خلاف مستقل مفادات رکھنے والی جماعتوں کی مخالفت و سرتابی کا بار بار ذکر کیا گیا ہے - ھندو مت ذات پات کے بے لوچ نظام کی صورت میں روبہ تنزل ہوگیا اور رسم و رواج کی پابندی مقصد وجود کی بابت کسی قسم کے ایمان سے زیادہ اھم بن گئی - ویدانتی برھمنیت اور بدھ مت نے اپنی فلسفیانہ پرواز میں عالم جاوید کو عالم تغیر سے جدا کرکے موخر الذکر کو بے حقیقت قرار دیا - عیسائیت بھی اپنے راھبانہ مسلک کے سبب آخرت پرست ہو کر متمدن اور مہذب دنیا سے کنارہ کش ہو گئی - پرستاران مسیح نے ان رشتوں کو قطع کر دیا ، جن کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا - انھوں نے ایک عظیم انسان کو الوھیت کا درجہ دے کر گناہ آدم اور فطری معصیت کے ذریعہ دیگر تمام انسانوں کی تذلیل کی - اس داغ مذلت کو کوئی پاکباز زندگی بھی دور نہیں کر سکتی تھی جبتک کہ وہ حلول ، کفارہ اور نیابتی عقوبت پر بے چون و چرا ایمان نہ لے آئے -

اسلام نے عالم قدر کو عالم تغیر کے ساتھ جوڑ کر تمام سچے ادیان کی حقیقی مماثلت کا اعلان کیا اور آزادانہ

ھستیوں میں منقطع کئے بغیر دینوی و اخروی کو وجود حقیقی کے دو رخوں کے طور پر ایک دوسرے سے متمائز کیا ۔ اسلام نے جو انقلاب پیدا کیا وہ اسی کلی نقطہ نگاہ کا رھن منت ھے ۔ اسی تعلیم کے سبب امت مسلمہ ایک محرک قوت بن گئی ۔ حیات نے ایک تحقیقی سفر کی صورت اختیار کرلی ، کیونکہ قرآن نے یہ تعلیم دی تھی کہ حق کی تلاش روحانی اور غیر روحانی طریقوں سے حاصل کی جائے ۔ انسانیت کے تمام معاصر اور متقدم علوم کی سرگرمانہ تلاش و تدوین کی گئی ، اور نئے نظریات پر جدید بالائی عمارتیں تعمیر کی گئیں ۔ انسان کی روح کو آزادی بخشی گئی اور خالق و مخلوق کے درمیان کوئی وسیلہ حائل نہ رھا ۔ باھمی حق و انصاف کے تصورات میں ترقیاں کی گئیں اور انھیں تمدنی اور معاشری زندگی میں روبہ عمل لایا گیا ۔ ایجاد و تخلیق کی صدیوں میں علما ، فقہا ، فنکار اور صوفیا اپنی تلاش و تحقیق اور زندگی کے تجربات میں آزاد تھے ۔

لیکن اس بے پناہ قوت عمل کی وسعت اور تہذیبی ترقی کے دور میں بھی چند واقعی اور امکانی رجعت پسند قوتیں غیر موجود نہ تھیں ۔ سیاسی عمومیت اور جمہوریت کی اساس پر دور افتادہ علاقے مطیع و منقاد نہیں رکھے جا سکتے تھے ۔ شاھیت نے خلافت کی جگہ لے لی اور ایک غیر منصوص قسم کی ملائیت نے علوم دین کی اجارہ داری حاصل کرلی ۔ زندگی کے سانچے بے حس اور فرسودہ ھونا شروع ھوئے ۔ انضباط و استحکام نے سکون و جمود کی صورت اختیار کرلی ۔ مطلق العنان پادشاھوں کے خلاف عوام خود کو بے بس و مجبور محسوس

کرنے لگے - بے مہر تقدیر، آزاد اور تخلیقی ارادہ پر غالب آ گئی - فقہاء کی قیاس آرائیوں نے مردہ و بے جان ہو کر شرع و قانون کی صورت اختیار کرلی اور عوام سے کہا گیا کہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے انضباط میں جزوی تفصیلات کے لئے ان سے استفادہ کریں - اس کے بعد وحشی تاتاریوں کا سیلاب آیا جو سیاسی، عمرانی اور ثقافتی قصر و ایوان کو، جو باوجود بوسیدگی کے ابتک قائم تھے، اپنی رو میں بہا لے گیا - ان وحشی لوگوں کی اولاد نے جب مفتوحہ علاقوں میں حکمرانی کے لئے بود و باش اختیار کی تو انہوں نے اسلام قبول کر لیا - کیونکہ جب انہوں نے خود کو علم سے سنوارنا چاہا تو ان کے معلم مفتوح مسلمان ہوئے جنہوں نے فوجی حیثیت سے شکست کھائی تھی، تہذیبی اعتبار سے نہیں - اسلام پر افتراء پردازی کرنے والے مکروہ حد تک بار بار اس امر کا اعادہ کرتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت بزور شمشیر ہوئی، مگر تاریخ شروع سے آخر تک انہیں جھٹلاتی رہی - جب پیغمبر اسلامؐ نے دین اسلام کی تبلیغ فرمائی اس وقت جن لوگوں نے تلوار چلائی وہ آپ اور آپکے متبعین نہیں تھے، بلکہ یہ مخالفین کی جماعت تھی - یہ سوال حل طلب ہے کہ اگر اسلام بزور شمشیر پھیلا تو ان شمشیر بازوں کا مذہب کس نے تبدیل کیا جو اس وقت تیغ آزمائی کر رہے تھے - مشرق وسطیٰ کی عملداری کے عین قلب میں عیسائی اکثریت کے علاقے اب تک موجود ہیں اور مصر میں عیسائی اقلیت مسلمانوں کے ساتھ لگاتار چودہ سو سال کے روابط و اثرات کے بعد بھی ہنوز قائم ہے - عربوں نے ہسپانیہ پر چھ صدیوں سے زیادہ سیاسی اور تہذیبی حیثیت سے حکمرانی کی، لیکن انہوں نے کبھی بزور شمشیر

اپنی اکثریت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی ، جس کا انجام یہ ہوا کہ جب انہوں نے اپنا سیاسی اقتدار کھو دیا تو ان کے سامنے تبدیل مذہب یا جلا وطنی دو ہی صورتیں پیش کی گئیں ۔ ترکوں نے مشرقی رومن امپائر کا بہترین علاقہ فتح کیا ، لیکن انہوں نے اپنی عیسائی رعایا کے تبدیل مذہب کی ایسے زمانہ میں بھی کوئی کوشش نہیں کی جب محض قوت کے ذریعہ ہر کام کی تکمیل کی جاسکتی تھی ۔ اسی قسم کے روا داروں نے ایک ہزار سالہ تسلط کے باوجود ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک اور تین کی نسبت کے ساتھ اقلیت میں رکھا ۔ سیاسی اقتدار کے نظریہ کو سامنے رکھ کر بعض مسلمان اس امر پر تاسف کرتے ہیں کہ ہم نے مشرقی و مغربی یورپ اور ہندوستان کے سارے ذیلی بر اعظم کو اسلامی دنیا میں شامل کرنے کے بہترین موقعے کھو دئے ۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ اسلام نے اس طرح سیاسی طاقت کھودی ، مگر اس نے اپنے نصب العین کو محفوظ رکھا جس کی بناء فی الاصل آزادئ ضمیر پر تھی ، اور مسلمان نہایت دینداری کے ساتھ قرآن کے اس عدیم المثال حکم پر کاربند رہے کہ مذہب کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر و اکراہ روا نہ رکھا جائے ۔ انسانی ضمیر کی آزادی کا تحفظ سیاسی تسلط سے کہیں زیادہ گرانقدر ہے ، جو دریا کے پانی کی طرح حادثات زمانہ کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے ۔

تاتاریوں اور ترکوں کے اسلام لانے کے بعد مسلمانوں نے اپنا سیاسی اقتدار دوبارہ حاصل کر لیا ۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد ترکان عثمانی ، یورپ میں خود کو مستحکم کرکے ، ویانا کے دروازے کھٹکٹانے لگے ، لیکن مسلمانوں کی تہذیبی تخلیقی قوت تیرھویں صدی کے بعد ماند پڑ گئی ۔ آخری غیر

معمولی ذہانت کا شخص جو انہوں نے پیدا کیا وہ ابن خلدون تھا ، جو عمرانیات اور فلسفۂ تاریخ کا باوا آدم مانا جاتا ہے ۔ اس کے بعد مسلمانوں کے افکار اور زندگی کے سانچے رسمی اور غیر متبدل ہو گئے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شاندار تہذیب اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر اپنا کام ختم کر چکی ہے ۔ اس کے بعد شارحین اور تبصرہ نگاروں کا دور شروع ہوا ۔ یہ یقین کر لیا گیا کہ تمام صداقتوں کو قبل ازیں دریافت کر لیا گیا ہے اور زندگی کی رہنمائی کے لئے دور گذشتہ میں صرف کسی موزوں ماخذ کی تلاش کافی ہے ۔ زندگی کے نمونے ، جو نسلاً بعد نسل ہمدست ہوئے تھے ، ان پر خدا کے مقرر کردہ نظامات کی مہر ثبت کر دی گئی ۔ تمام آزادانہ فقہی سرگرمیاں ، بجز غیر ضروری امور میں شارحین کی جدل و نزاع کے ، سرد پڑ گئیں ۔ قرآن اسلامی نظام فکر اور ضابطۂ و آئین کا آخری سرچشمہ تھا اور وہ معدودے چند قوانین پر مشتمل تھا ۔ اس کا نہایت اہم حصہ وضع قوانین کے چند بنیادی اصول تھے ، جو نہایت صاف ، وسیع اور ترقی پسند تھے ۔ قرآن کے بعد قانون سازی کا دوسرا ماخذ آنحضرتؐ کے اقوال و افعال تھے ۔ یہ ماخذ نہایت غیر یقینی اور بے ترتیب تھا جو چھ یا زائد نسلوں کی زبانی ترسیل و ارسال کے واسطوں سے پہنچا تھا ۔ جس کو جہالت ، تعصب ، مستقل ذاتی مفادات ، اور فرقہ داری نزاعات نے مسخ کر دیا تھا اور جو قطعی اور قابل اعتماد معیار عمل قرار نہیں دیا جا سکتا تھا ۔ صحیح و سقیم ، مستند و موضوع ، کی چھان بین میں بڑی کاوشیں کی گئیں ۔ بعض بڑے فقہا نے محدثین کی متابعت کی اور انفرادی و اجتماعی راہ عمل کے ضوابط ترتیب دئے ۔ لیکن چونکہ کوئی مستند معیار

نہیں تھا، اس لئے جزئیات اور اہم مسائل میں بھی باہم اختلاف رونما ہوا۔ شیعوں نے ایک جداگانہ مجموعۂ احادیث پر یقین کرکے خود اپنا ایک جداگانہ اصول قانون مستنبط کیا، جس کو اہل سنت و الجماعت کی اکثریت الحاد و زندقہ سمجھتی ہے۔ لیکن اہل سنت کی راسخ الاعتقادی بھی کوئی قابل یقین اور با اصول شکل میں نہیں تھی۔ مقلدین ائمہ اربعہ فقہی گروہ بندیوں میں بٹ گئے اور ایک چھوٹی سی اقلیت غیر مقلد اہل حدیث کی باقی رہ گئی، جو ان میں سے کسی ایک امام کی تقلید نہیں کرتے اور خود کو براہ راست کتاب و سنت سے استنباط مسائل میں آزاد سمجھتے ہیں۔ فقہاء جن کے فتوے وحی الہٰی کی طرح واجب التعظیم تسلیم نہیں کئے جاتے، وہ خود اسلام کے وسیع حدود کے اندر مسائل کے سمجھنے میں آزاد تھے۔ لیکن ان کے متبعین نے ہر معاملہ میں اپنے آپ کو جکڑ بند کر لیا۔ اصول ایمان کی طرح ان پارینہ فیصلوں کو قبول کرکے کسی قسم کا رد و بدل روا نہیں رکھا، اور تغیر پذیر حالات کے ساتھ تمام جدید مطابقتوں کا دروازہ یک لخت بند کر دیا گیا۔ یہ اجتہاد کے تصور سے گریز کرتے ہیں، حالانکہ اجتہاد کے معنی غور و فکر کے ذریعہ نتائج اخذ کرنے اور جدید حالات کے لئے جدید آئین و دستور ترتیب دینے کے ہیں۔

اس تمام سند پرستی کا مآل سیاسی، معاشری اور ثقافتی جمود کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسلام کے انقلابی کارناموں میں سے ایک مذہبی پیشوائیت کو برخاست کرنا تھا۔ اسلام نے نہ کسی ملایانہ جماعت کی حمایت کی اور نہ کوئی پیشہ ورانہ ملائیت قائم کی، لیکن ملائیت کی خرابیاں امت مسلمہ

میں خفیہ طریق پر داخل ہوگئیں ، اگرچہ کہ ان میں نہ کوئی مامور من اللہ پیشوا تھے اور نہ کلیسائی درجہ وار ترتیب تھی جس کی صدارت پر کوئی خطا سے مبرا پوپ براجمان ہو ۔ امت مسلمہ ان تمام مفسدات کا شکار ہوئی جن سے یورپ قرون مظلمہ اور از منۂ متوسط میں دو چار ہوا تھا ۔ تیرھویں صدی میں مسلمانوں پر جمود و بے حسی طاری تھی اور اس وقت یورپ ایک نئی زندگی کی کروٹ لے رہا تھا ۔ مغرب نے مسلمانوں کی میراث سے استفادہ کیا ، ان کے نمونوں پر یونیورسٹیاں قائم کیں اور عربی تصنیفات کا لاطینی میں ترجمہ کیا ۔ اس طرح پر جو چیز پہلے انہیں ملی ، وہ مسلم پیرایہ میں یونانی علوم کے اظہارات تھے ۔ سینٹ ٹامس اکوینیس (St. Thomas Acquinas) جو کتھولک چرچ کا فرشتہ خصال عالم تھا ، اپنے خیالات میں مسلمانوں کے دینیاتی اور فلسفیانہ افکار سے متاثر ہونے کی نمایاں علامتیں ظاہر کرتا ہے ۔ جس کسی نے اس کے پیشرو غزالی کا مطالعہ کیا ہے وہ اگر ان دو عالی دماغوں کا تقابل کرے ، تو وہ غزالی کے براہ راست اثرات کا اعتراف کرنے سے گریز نہیں کر سکتا ۔ صدہا سال تک ابن رشد کے متبعین اور مخالفین ایک لا متناہی جدل و نزاع کتھولک چرچ میں برپا کرتے رہے ۔ سمجھا جاتا ہے کہ یورپ کی نشاۃ جدیدہ یونانی علوم کے احیاء سے ہوئی ، مگر اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کے تہذیبی اثرات نے اس کے لئے زمین ہموار کی تھی ۔ عربی علوم مغرب کے حکمیاتی فکر و نظر کا نقطہ آغاز تھے ۔ عین سترھویں صدی تک مغربی علم طب ، اصول و عمل میں ، ابن سینا کی تصنیفات پر مبنی تھا ۔

نشاۃ جدیدہ کے بعد اصلاح و تجدید کا دور آیا ۔ چرچ کے

خلاف یہ بغاوت ، فرد کے ضمیر و ایمان سے براہ راست تخاطب ، اور بائیبل کے آزادانہ مطالعہ کے ذریعہ خدا اور مسیح کی بے قید تلاش و جستجو ، اسلامی افکار ھی کی آواز باز گشت تھی ۔ لوتھر کے بعض معاندین نے جب اس کو مسلمانوں کے اصول و عقائد کی تقلید سے متہم کیا تو یہ کسی خبث باطنی کے تحت نہیں کہا جا رہا تھا ۔

مغرب خواب غفلت سے بیدار ھو کر جادۂ ترقی پر گامزن ھوا ، کیونکہ جس زندگی کو نظام جاگیرداری اور کلیسائیت نے ایک عرصہ سے حلقہ بگوش کر رکھا تھا وہ اب بطور خود ان طوق و سلاسل کو نکال پھینک رہی تھی ۔ تجارت پیشہ متوسط شہری طبقہ کے بر سر عروج آنے سے نظام جاگیرداری کی بنیادیں ھل گئیں ۔ عمرانی فرائض کی بجا آوری میں ایک نئی سرگرمی پیدا ھوئی ۔ یہ رحجان سولھویں صدی کے بعد سے مغربی اور وسطی یورپ میں غلبہ پانے لگا ۔ دست کاری ، زراعت اور ھر قسم کے تجارتی لین دین میں انفرادی کار گذاری کو آزادی دلانے کا میلان موجود تھا ۔ عوام اپنے روایاتی حکمرانوں ، بادشاھوں ، پیشواؤں ، اور امیروں کی حماقتوں سے نجات پانے کے لئے کوشاں تھے ۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ معاشرہ فرداً فرداً اپنے اراکین کی پر امن مسابقت کے طریق پر چل رہا ھے ، اور مملکت مثل ثالث بالخیر کے قائم ھے ۔ عین ایسے وقت پر حسب معمول تعلقات میں انقطاع رونما ھوا ۔ اولاً جہد و سعی کے ذریعہ ، اور تجارت پیشہ متوسط طبقہ کے مفاد کی خاطر ، یہ خاص حقوق انگلستان اور فرانس میں حاصل کئے گئے ، یا یورپ میں جہاں کہیں یہ متوسط طبقہ اجتماعی زندگی کا خاص عنصر تھا ۔ امریکی ، فرانسیسی اور صنعتی انقلاب ،

وہ تمثیلی واقعات تھے ، جو اس نظام عمرانی کو قبول کرنے سے رونما ہوئے، اور محاربات نپولین کے بعد یورپ کی تعمیر نو ان ہی اصولوں کی رہنمائی میں ہوئی۔ اس معاشرت پسند انفرادیت کے غلبہ و تسلط سے زندگی زیادہ صحت بخش، پاکیزہ تر اور معین ہوگئی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مشینی صنعتی نظام کے بسرعت تمام ترقی کرنے کے ساتھ مغرب میں جدید میلانات کا نشؤ و ارتقاء ہوا۔ بے قید سوداگرانہ انفرادیت، جو اصول عدم مداخلت یا نظریۂ بقائے اصلح پر مبنی تھی ، اپنے آغاز ترقی ھی سے ایسی قوتوں کو وجود بخش رہی تھی جو خود اس کی حریف تھیں۔ نری سیاسی عمومیت ، جو اس تحریک سے حاصل ہوئی وہ معاشی عمومیت (یعنی ثقافتی اور معاشی مواقع کا تمام طبقوں کو یکساں اور بلا تفریق و امتیاز حاصل ہونا) کے بغیر ناکافی تصور کی گئی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ فی کس ایک رائے دینے کا حق ایک عام آدمی کی حالت کو اس حد تک سدھارنے کے قابل نہوسکا ، جس حد تک تیزی کے ساتھ بڑھنے والی مادی اشیاء کی پیدائش اس کو مستحق گردانتی تھی۔

مفکرین اور مصلحین کے قلب و دماغ گوناگوں اجتماعی نظریات کی جانب مبذول ہوئے۔ تمام سنجیدہ اور متین اہل فکر نے یہ محسوس کیا کہ بے قید معاشی انفرادیت پر یہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک کثیر تعداد کی زیادہ سے زیادہ خوشحالی پر منتج ہوگی۔ صنعتی نظام کے عفریت نے فرد کو بالکل دبوچ لیا ، اور یہ نظام جاگیرداری ، شاہیت اور کلیسائیت کے قید و بند سے رہائی پا کر دوبارہ پابند ، اور

فردیت و انسانیت سے محروم کردیا گیا ۔ نسل انسانی کو از سر نو اپنے ان نئے آقاؤں کی غارتگری سے چھٹکارا حاصل کرنا ھے ۔ ہر جگہ عوام نے اپنا اعتماد مجرد سیاسی عمومیت پر سے کھو دیا ۔ اطالیہ اور جرمنی میں پرستش و بندگی کا رخ فرد سے مملکت کی جانب پھر گیا ۔ ھمہ گیر (Totalitarian) آمریت نے ایک عامی سے، زیادہ سے زیادہ مادی و جسمانی تحفظ کا وعدہ اس شرط کے ساتھ کیا کہ وہ انفرادی آزادی کے تمام دعووں سے دست بردار ھو جائے ۔ فاشیت اور نازیت کا تو زبردست فوجی ھزیمتوں کے بعد قلع قمع ھو گیا، مگر اشتمالیت نے روس اور اس کی طفیلی مملکتوں میں پہلے سے زیادہ اپنے آپکو مستحکم کر لیا، نئے علاقوں کا الحاق ھوتا رھا، یہانتک کہ اس کی انتہا چین کے انقلاب پر ھوئی جو غالباً عصر حاضر کا نہایت مہتم بالشان واقعہ ھے ۔

جبکہ یہ تمام موثر تحریکیں نشو و نماء پا رھی تھیں، اور اپنے بحث و مناظرہ سے سلبی و ایجابی نتائج کی پردہ کشائی کر رھی تھیں، اور مختلف سیاسی معاشی، اور عمرانی نظامات کے اُدھیڑ بن میں لگا تار مصروف عمل تھیں، تو دنیائے اسلام اس وقت غفلت کی نیند سو رھی تھی ۔ مگر ظاھر ھے کہ زیادہ عرصہ تک یہ لوگ الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے ۔ مغرب کی صنعتی ترقی نے ایک ناقابل مقاومت فوجی قوت کی تخلیق کی ۔ صنعت کار قومیں اشیائے خام کے لئے منڈیاں اور اپنے مصنوعات کے لئے نکاسی کی خواھاں تھیں ۔ محض عسکری جوش اور انفرادی دلیری جدید اسلحہ اور معاشی نظامات کے مقابلہ میں بے بس تھے، جن کی پشت پر ایسی مملکتوں کی طاقت تھی جنھوں نے خود کو معاشی انتفاعی قوتوں کے ساتھ ھمرنگ

کر لیا تھا - سلطنت عثمانیہ ، جو تین بر اعظموں پر پھیلی ہوئی تھی - جدید اسلحہ کی قلت اور صنعتی ترقی میں پس ماندگی کے باعث ، جن سے اصل ذرائع جنگ مہیا ہوتے ہیں ، کوئی قوم موجودہ جنگ کامیابی کے ساتھ لڑ نہیں سکتی تھی - ترک جو یورپ کے مشرقی علاقوں پر حکمران تھے ، ان نئی طاقتوں کا اندازہ نہ کر سکے - زوال یافتہ شاہیت ، جس کی پشت پر ایسا ہی تنزل یافتہ دینی اقتدار تھا ، اپنی ایک ایسی زندگی کا سانچہ بدلنے کے لئے کوئی قوی سبب نہ پا سکی جس نے صدہا سال تک بخوبی کام انجام دیا تھا ، مگر اب جس کو سختی کے ساتھ جانچنے کی ضرورت تھی - زندگی کی بنیادوں کو بلا ہاتھ لگائے ہوئے صرف بالائی عمارت کی بے اعتنائی کے ساتھ لیپ تھوپ کر دی گئی - اقوام یورپ نظریاتی اور معاشی اعتبار سے بہتر ساز و سامان سے لیس ہو کر عالم اسلامی پر قبضہ و تصرف کا عزم کر چکی تھیں ، جس کی نسبت وہ جانتی تھیں کہ یہ کوئی کار گر مقاومت نہ کر سکے گا - بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل تک ، اور مراکش سے انڈونیشیا تک ، مسلم اقوام اور مملکتیں یا براہ راست مسخر و ملحق کی گئیں یا بالواسطہ مغربی اقتدار کے زیر تصرف لائی گئیں - انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ، دنیائے اسلام بالکلیہ شکست خوردہ ، بے دست و پا ، اور حلقہ بگوش ہو چکی تھی - یورپ کی طاقتور صنعتی مملکتوں کے حوصلے بے پناہ تھے اس لئے ایک باہمی تباہی و ہلاکت کا واقع ہونا یقینی تھا - ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کی عالم آشوب جنگ نے ربع مسکوں کو اس کی بنیادوں سے ہلا دیا - اتحادی سلطنتوں نے فوجی ضرورت سے مجبور ہو کر ، بطور مقصد جنگ ، تمام چھوٹی اور بڑی قوموں

کی آزادی کا اعلان کر دیا - انہوں نے اس امر کا اقرار کیا
کہ یہ جنگ آزمائی ہر قسم کی ضرب و پیکار کو ختم کرنے
اور دنیا کے لئے عمومیت کو محفوظ کر دینے کی غرض سے ھے - لیکن
جب انہوں نے کامرانی حاصل کی اور اپنے حریفوں کو کچل
دیا ، تو اپنے اعلٰی مقاصد فراموش کر گئے - ہزیمت خوردہ
سلطنتوں کے حصے بخرے نئے سامراجی منصوبوں کے مطابق
کر دئے گئے - عرب اقوام نے ، جنھیں اپنے سابقہ حکمرانوں کے
خلاف پس پشت خنجر زنی پر آمادہ کیا گیا تھا ، اپنے آپ کو
مکر و فریب کا شکار پایا - ان کے لئے یہ تغیر صرف آقاؤں
کی ایک تبدیلی تھی - ایک جدید منافقانہ سیاسی اصطلاح تراشی
گئی ، اور الحاق و انضمام کو انتداب کا نام دیا گیا - دنیائے
اسلام کے عین قلب میں ایک یہودی مملکت کی داغ بیل ڈالی
گئی - اس عالم گیر جنگ نے کمزور اقوام کو حریت و آزادی
نہیں بخشی تھی ، بلکہ انہیں بیدار اور خود آگاہ کر دیا تھا -
شخصی آزادی اور خود ارادیت کی تحریکات کو ہر جگہ تقویت
حاصل ہوئی - اس کے بعد ایک دوسری عالم گیر جنگ واقع
ہوئی ، جس نے تمام قدیمی سانچوں کو تباہ و برباد کرنے کے کام
کی تکمیل کردی - ترکوں نے مغربی قومی اساس پر اپنے ملک
کا نظم و نسق قائم کیا اور بحیثیت ایک چھوٹی طاقت کے
سابق سے زیادہ قوی و مستحکم ہو گئے ، جبکہ وہ اپنی توانائیاں
ایک وسیع مملکت کو سنبھالنے کے لئے بیرونی حملوں اور
اندرونی تخریبی کاروائیوں کی مدافعت میں صرف کرتے تھے -
عرب ہنوز آزادی کامل کے لئے مصروف جہد و عمل ہیں ،
لیکن بجائے یکسوئی کے مختلف سمتوں پر مسلسل جادہ پیما
ہیں - پاکستان اور انڈونیشیا جیسے وسیع اور کثیر آبادی

رکھنے والے ممالک کا ظہور ہوا ، جو زبردست قدرتی وسائل اور انسانی طاقت کے حامل ہیں۔ شمالی افریقہ میں لیبیا کی مملکت معرض وجود میں آئی ، اور طرابلس ، الجزائر ، اور مراکش کے علاقے فرانس کی غارتگرانہ شہنشاہیت سے گلو خلاصی کے لئے جد و جہد کرنے لگے۔ افریقہ کے نیم مہذب اور پس ماندہ علاقے بھی بیدار ہو رہے ہیں ، اور غارت گر سفید فام حکمرانوں کے لئے باعث تشویش بن رہے ہیں۔

بیرونی اقتدار سے آزادی ، تمام دیگر آزادیوں کے حصول کی اولین اور لازمی شرط ہے۔ اس وقت بعض مسلمان قومیں سیاسی حیثیت سے کاملاً آزاد ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کس سمت آگے بڑھ رہی ہیں اور وہ کیا نصب العین ہے جو انہوں نے اپنے پیش نظر رکھا ہے ؟ ترکوں نے ایک جمہوریہ تشکیل دیا ، جس کی بناء انیسویں صدی کی مغربی جمہوریت پسندی کے تصورات ہیں۔ اس امر کے تجربہ کے بعد کہ محض دینی رشتہ خاطر خواہ قوی محرک نہیں ہے ، انہوں نے اپنے آپ کو مغربی انداز کی نسلی قومیت کا پابند کر لیا اور ایک ظلمت پسند مذہبی اقتدار کے تلخ تجربہ کے بعد سیاسیات اور معاشیات کو دینیات سے جدا کرکے ایک لادینی حکومت ، مذہب کو بطور شخصی ایمان و ضمیر کے معاملہ کے برقرار رکھتے ہوئے ، مغربی نہج پر قائم کی۔ مذہب کے خلاف ایک عام انحراف ، جیسا کہ روس میں پیدا ہوا ، یہاں نہیں تھا ، بلکہ مولویوں کی گرفت سے چھٹکارا حاصل کیا گیا جو زندگی کے حقائق سے نا آشنا تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ

وہ اخلاق و روحانی امور سے تعلق رکھتا ہے، اور نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے قوانین اور رسوم و عادات میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ اسلام میں کسی مستقل مذہبی جماعت کا وجود نہیں، لیکن مسخ شدہ دینیات اور فقہیات موجود تھی۔ ترکی کی ذہین و دلیر سیاست دان خاتون اور "Turkey Faces West" کی مصنف خالدہ ادیب خانم نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ "ہم انقلابی ترک اسلام کے پروٹسٹنٹ ہیں"۔ عرب ممالک میں طرز زندگی قدیم بدوی نظام اور معاشرہ سے لے کر جزوی طور پر جدید وضع قطع تک مصر و شام جیسے علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ مغرب کے ساتھ تعلقات و روابط کے باعث عربوں کی قومیت پرستی اس امر کیلئے کوشاں ہے کہ عظیم تر اسلامی ملت میں رہ کر اتحاد عرب کو تقویت پہنچائی جائے۔ عربی، اسلامی تہذیب پر فخر و اعتماد کے ساتھ مغربی طرز و روش کو شعوری اور غیر شعوری طور پر بکثرت اختیار کیا جا رہا ہے۔ مصر و شام کے بلند پایہ مفکرین، محض عقلی اساس پر اسلامی اصولوں کی جدید توضیح و تشریح کر رہے ہیں۔ انڈونیشیا میں ایک زبردست مذہبی جماعت اپنی نو حاصل کردہ آزادی کی عمارت اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر کھڑی کر رہی ہے۔

عالم اسلامی میں ایک سرے سے دوسرے تک سیاسی اضطراب و ہیجان کے ساتھ ساتھ تہذیبی کشمکش بھی بر سر کار ہے۔ ہر جگہ کاملاً احساس و عمل، عروج و ترقی، احیا و تجدید کا تقاضہ موجود ہے۔ احیائے مذہب کی تحریکات مختلف نوعیت کی ہیں۔ تاہم ایک چیز ان میں مشترک ہے، وہ یہ اعتقاد ہے کہ روحانی فیضان و مثال کے لئے انہیں اسلام کی اولین تحریک

کی طرف رجوع ہونا چاہئے - اسلام کی اصلی خوبی کو ، ما بعد کے تمام حشو و زوائد اور گمراھیوں سے بے اعتنا ہو کر جنھوں نے اس کے اصل چہرہ پر غیر اسلامی تصورات و رسومات کے پردے ڈالدئے ہیں ، حاصل کرنا چاہئے - ہم یہاں تجدد پرستی کے مختلف مکاتب خیال پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں- ایک مکتب خیال اس امر کا مدعی ہے کہ اصل اسلام قرآن پر مشتمل ہے اس لئے صرف کتاب مقدس ہی سے ، بحیثیت مستند ماخذ کے ، رجوع کرنا چاہئے - لیکن قرآن زیادہ تر عام اصول کی تعلیم چند گنے چنے قوانین کی صورت میں دیتا ہے - چنانچہ اس مکتب خیال میں بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اس کتاب مقدس میں قوانین کا جس حیثیت سے اظہار ہوا ہے وہ ابدی اور اٹل ہیں ، لیکن دوسرے اس پر زور دیتے ہیں کہ قرآن میں جن معاشری حالات سے قوانین بحث کرتے ہیں وہ اس وقت کی صورت موجودہ کے لحاظ سے تھے اس لئے یہ قوانین نہیں ، بلکہ ان کے پس پردہ جو اساسی اصول کار فرما ہیں وہی مذہب کے ہمیشہ قائم رہنے والے اجزاء ہیں - حامیان تجدد کا دوسرا طبقہ یہ یقین رکھتا ہے کہ قرآن تفصیلی ہدایت و روشنی کے لئے بھی کافی ہے ، وہ اس طرح پر کہ اس کا تکملہ تعلیمات و سنت رسول سے ہوتا رہے - ان کے مخالفین یہ خیال کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے طریقوں اور فیصلوں کا پتہ چلانا دشوار ہے ، کیونکہ احادیث کا ذخیرہ بالکل واضح اور یکساں اصول پر مبنی نہیں ہے ، اور صریح اضافہ و الحاق کے علامات ظاہر کرتا ہے - اگر یہ تحقیق بھی ہو جائے کہ آنحضرت صلعم نے کسی خاص موقع پر کسی خاص طرح عمل فرمایا تھا ، تو اس کو صرف موقتی اہمیت

دی جائیگی اور کلیتاً تبدیل شدہ حالات میں ایک جدید فیصلہ ان اصحاب علم و اخلاق کی طرف سے دیا جائیگا جو اسلام کے اصل منشاء و مقتضاء کا درک و فہم رکھتے ہیں۔ بعض دیگر حامیان تجدید ان تمام فقہی مجموعوں کو ، جنہیں بڑے فقہاء نے ابتدائی صدیوں میں ترتیب دیا تھا ، اسلام کے غیر تغیر پذیر اجزاء کی طرح شمار کرتے ہیں۔ لیکن یہ فقہی مجموعے منو کے دھرم شاستر کی طرح صرف دیوانی اور فوجداری قوانین میں محدود نہیں ہیں۔ ایمان و اخلاق کے اصول شخصی زندگی کے تفصیلی ضوابط ، اور آداب معاشرت ان میں گھل مل گئے ہیں۔ یہ لوگ بجز ان معاملات کے ، جن کی تفصیل نہیں کی گئی ، قانون سازی کی آزادی یا انفرادی زندگی کی آزادانہ تنظیم کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ مشکل سے کوئی چیز نہایت اہم یا عارضی نوعیت کی ایسی ہوگی جس کے لئے یہ کوئی سند نہ تلاش کرتے ہوں۔ اس لئے عملی طور پر جملہ اجتماعی ، معاشی ، سیاسی اور شخصی زندگی کے نمونے رسمی اور غیر متبدل بن گئے ہیں۔ یہ متجددین گویا اسلام کے تلمودی (Talmudist) ہیں۔

اس موقع پر ہمیں پاکستان کی مثال لینی چاہئے جو ایک اسلامی مملکت بنانے کے لئے ہندوستان کے ذیلی بر اعظم سے جدا کیا گیا تھا ، اور جہاں مسلمان اسلامی طریق زندگی اختیار کرنے میں آزاد ہیں۔ اس مملکت کی تخلیق سے تقریباً ایک صدی پیشتر سے مسلمان اصول مذہب اور شرائط ایمان پر بحث کرتے رہے۔ چونکہ انہیں کوئی سیاسی اقتدار حاصل نہیں تھا اس لئے یہ مذہبی مباحثات نظری اور فرقہ پرستانہ سطح پر جاری رہے۔ علاوہ اس کے یہ کوئی قومی ذمہ داریاں بھی نہیں رکھتے

تھے اس لئے یہ مناظرات ، غیر ذمہ دارانہ دینیاتی ، اور تصوری نوعیت کے حامل تھے ۔ ایک ایسا سیاسی نظام ، جس میں وہ زندگی گذارنے پر مجبور تھے ، خود ان کا پیدا کردہ نہ تھا اور اس میں کسی قسم کا رد و بدل ان کے بس سے باہر تھا ۔ ایک مخصوص معاشی طرز زندگی بھی تاریخ کی منطق نے ان پر عائد کر دیا تھا ۔ ایک غیر ملکی حکومت کے ہاتھوں میں ان کے بین الاقوامی تعلقات تھے ، اور ان کی تعلیم بھی آزاد نہیں تھی ۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے ساتھ ہی وہ دفعتاً نہایت اہم مسائل اور ٹھوس حقائق سے دوچار ہوئے ۔ قرار داد مقاصد میں اسلامی نظام حیات پر انہوں نے اپنے ایمان و یقین کی توثیق کی اور اس امر کا اقرار کیا کہ وہ اپنے دستور ، قوانین ، اور ادارات کی قرآن و سنت پر تشکیل کرینگے ۔ مگر یہ الفاظ نہایت غیر معین تھے ، جن کی تشریح و توضیح ان کے بالکل بر خلاف بھی کی جا سکتی تھی ۔ دستور میں اس کو معین شکل دینے کے لئے بڑا شور و ہنگامہ رہا ۔ تقریباً چار سال تک سوچ بچار اور اظہار و اشتہار کے بعد اساسی اصول کا اعلان کیا گیا ، جن کے لئے ایک ہنگامہ برپا تھا ۔ اس میں یہ کوشش کی گئی کہ متعدد اور مختلف دعویداروں کو راضی کیا جائے ، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بھی مطمئن نہوسکا ۔ مختلف اسلامی فرقوں کو تسلیم کیا گیا تھا ، جنہوں نے اس امر کے اظہار میں بڑی پھرتی دکھلائی کہ وہ بجز اپنی ذات کے کسی اور کی تعبیر و تفسیر کے پابند نہیں ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام معاملہ کا ایک مضحکہ خیز ناکامی پر خاتمہ ہو گا ۔ کیونکہ دستور کی بناء اگر اسلام پر ہو ، اور اسلام کی توضیح بیسیوں فرقوں کی طرف سے ایک

دوسرے سے متضاد ہو، تو مشترک و متحد اساس کہاں ہوگی، جس کے بغیر کوئی اگلا قدم اٹھایا نہیں جا سکتا۔ زبانی دعووں اور نعروں سے گذر کر حقائق سے دوچار ہوتے ہی ایک تعطل سا رونما ہو گیا۔ حکومت کو زمیندار اور لگان دار کے تعلق اور مختلف نوعیت کے حق ملکیت زمین کے جواز و عدم جواز کی بابت تصفیہ کرنا ہے حکومت کو سرمایہ اور محنت کی بابت بھی فیصلہ صادر کرنا ہے۔ حکومت کو اپنے مالی نظام اور بنک کاری کی بابت بھی طے کرنا ہے جس کو راسخ الاعتقاد کافرانہ سمجھتے ہیں، کیونکہ اسلام میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ تصفیہ طلب ہے کہ آیا بنک کا سود اور کار و بار کا سود، دونوں مثل رباء کے ایک ہی ہیں، جس کی اسلام نے ممانعت کی ہے۔ موجودہ نظام زندگی میں عورت کے مرتبہ کا تعین کرنا ہے۔ ایک مسلمان مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق کی واضح طور پر تعریف کرنا ضروری ہے اور ایک عمومی مملکت میں ان تمام امتناعات کو رفع کرنا لازم ہے۔ جن کی بناء کسی جنس و عقیدہ پر ہو۔

اگر مسلمان اپنی ہم عہد اور آئندہ نسل انسانی کی زندگی میں کوئی با عزت مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ ایک ناقابل گریز حقیقت ہے کہ ان کی زندگی اپنی تمام صورتوں میں کاملاً اصلاح و تجدید کی محتاج ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام ایک فرسودہ مذہب ہے اور بطور ایک مانع ترقی مذہب کے اس کو ترک کر دینا چاہئے، یا ہمیں انسانیت کی مادی اور ذہنی ترقی کی روشنی میں اس کی جدید تفسیر کرنی چاہئے۔ کیا مسلمانوں کو ہر اعتبار سے مغرب کی ترقی پسند قوموں کی محض تقلید کرنی چاہئے، یا انہیں تخلیقی امتزاج کے ذریعہ

کچھ نہ کچھ خدمت سر انجام دینی چاہئے۔

اسلام کی اصل قوت ان تصورات کے دلیرانہ امتزاج کی رهین منت هے، جن کو مختلف قوموں کے غیر معمولی ذهن و دماغ اس سے قبل الگ الگ نشؤونما دیتے رهے۔ اس نے دنیوی اور اخروی زندگی اور دنیا اور خالق کائنات کو باهم مربوط کیا اور اس زندگی کی فلاح و بہبود کو ابدی اقدار کی وصولیابی کا زینہ قرار دیا۔ رهبانیت اور آخرت پرستی کی شکل میں سلبی روحانیت کو مردود ٹھہرایا، اور یہ تعلیم دی کہ اس دنیا کی زندگی کے جملہ معاملات کو راست بازانہ اور صحت بخش طرز و روش اختیار کر کے روحانی و مذهبی بنایا جائے۔ زاهد شب زندہ دار کو نہیں، بلکہ محنت کرنے والے کو حبیب اللہ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ ملائیت جو مستقل مذهبی مفادات کی اجارہ دار اور نگران کار کی حیثیت رکھتی تھی، وہ برخاست کردی گئی۔ غلاموں کو آزادی دلانا نیکوکاری اور اخلاقی خوبی کا زبردست عمل گردانا گیا۔ فطریت مافوق اور فطریت کے درمیان جو حد فاصل تھی وہ محو کردی گئی۔ دلدادگان خرق عادت سے کہا گیا کہ وہ خدا کی تلاش انفس کے مطالعہ کے ذریعہ کریں۔ اور مذهب کی تعریف فطرت الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کی گئی، جو روح انسانی میں پھونکی گئی هے۔ اخلاق اور روحانی زندگی کے لئے معاشی عدل کو ناگزیر شرط قرار دیا گیا۔ قانون وراثت کے ذریعہ نظام جاگیرداری کالعدم قرار دی گئی اور اس بات کی ممانعت کردی گئی کہ خلف اکبر غیر منقسم جائیداد کا وارث هوگا۔ نسلی امتیازات کی نفی کی گئی اور انسان کو قبائلیت کی پستی سے نکال کر آفاقیت

اور عالم گیر انسانیت کے درجہ پر سر بلند کیا گیا ۔ بادشاہت کو عمومی جمہوریت کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی ، جس میں قسمتوں کی رہنمائی کے لئے قوم کے بہترین فرد کا انتخاب بذریعہ اجماع امت کیا جاتا تھا ۔ مواقع کی یکساں فراہمی اور قانون کی نظر میں سب کی برابری ، اجتماعی اور شہری زندگی کی اساس قرار دی گئی ۔ تمام امتیازی حقوق پر خط نسخ پھیر دیا گیا ۔ عورت کو آزادانہ مالی حیثیت عطا کی گئی ، وہ ذاتی ملکیت رکھ سکتی تھی اور میراث میں منصفانہ حق پاتی تھی ۔ نکاح کو مقابل جنس کے دو آزاد اشخاص کے درمیان عقد معاشرت کی صورت دی گئی اور نکاح نامہ میں کوئی بھی جائز شرط داخل کی جاسکتی تھی ۔ علم کی جستجو کی ، بحیثیت ایک مذہبی عمل کے تاکید کی گئی ۔ یہ علم نہ دینیات کا تھا اور نہ مذہبی رسومات کا ، بلکہ یہ ایک غیر محدود زندگی کا علم تھا ، جو انسان کو ہر چہار طرف سے گھیرے ہوئے ہے ۔ یہی سبب ہے کہ یونانی عقلیت کو اسلامی تہذیب میں آسانی کے ساتھ سمو لیا گیا ۔ آزادی ضمیر کا شاندار اصول جزو ایمان قرار دیا گیا ۔

اصطلاحات کے جدید مفہوم کے لحاظ سے اصلی اسلام نہ کلیسائی ہے اور نہ لادینی ۔ مغرب میں لادینیت چرچ اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف ایک بغاوت تھی ۔ اسلام نے ان دونوں اداروں کو برخاست کردیا ، اس لئے دنیوی زندگی کو انحطاط یافتہ مذہبی حکومت کی گرفت سے آزادی دلانے کی یہاں کوئی ضرورت نہ تھی ۔ خالق اور مخلوق کے درمیان کسی وسیلہ کی حاجت نہ تھی ۔

ملت بیضا کی احیا و تجدید ، اور انسانوں کی از سرنو قیادت کے لئے اسلام کی حقیقی روح کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت

ھے ۔ لیکن اس کے لئے خذ ما صفا کے اصول پر کاربند ہو کر ان اچھی چیزوں کو لیتے ہوئے آگے بڑھنا چاھئے جو غیروں کے ھاتھوں نشؤونما پاتی ھیں ۔ اسلام میں کوئی جغرافی اور نسلی قومیت نہیں ھے ۔ وللّٰہ المشرق والمغرب ۔* ''اللہ ھی کے لئے مشرق و مغرب ھے''۔ کوئی چاھے تو اس میں یہ اضافہ کرسکتا ھے کہ اللہ ماضی ، حال اور استقبال ھے ، کیونکہ اللہ ھی زندگی کے دائمی اقدار کا مقصود اعلیٰ ھے ۔ مسلم تمدن نے اپنے دور اقبال و کامرانی میں گذشتہ تہذیبوں کے بہترین عناصر کو اپنے میں سمولیا ۔ ھندوؤں کی روحانیت ، عبرانیوں کی اخلاقی خدا پرستی ، معہ اس کے معراج کمال کے جو مسیح کے روح ھونے پر منتہی ھوئی اور جسے قرآن روح اللہ سے تعبیر کرتا ھے ، اور رومنوں کی قانونی ذھانت کو اپنا لیا ۔ ازمنۂ گذشتہ کی متعدد خداداد صلاحیتوں کی حامل قوموں کی خدمات کو مومن کی فراست نے اپنی آغوش تربیت میں لے لیا ۔ قرآن نے نسل انسانی کی یگانگت اور خدا کی وحدانیت کے ساتھ وحدت ادیان پر زور دیا ۔ اسلام نے مجرد فلسفیانہ وحدت کی تعلیم نہیں دی جس نے ھندو ویدانتیوں اور فلاطونیوں کو ایک بے صفت ذات مطلق کے فرض کرنے میں گمراہ کردیا تھا ۔ اسلام کی وحدانیت ایک وحدت در کثرت اور یکرنگی دربو قلمونی تھی ۔ اسلام کا خدا ظہور و نمود بھی ھے اور حقیقت و واقعیت بھی وہ بیک وقت مجرد بھی ھے اور محسوس و موجود بھی ۔ تمام موجودات ایک سالم کل کی حیثیت رکھتے ھیں جس میں مجرد وحدت وجود اور مجرد کثرت وجود ، دونوں محض تجریدات ذھنی کی طرح متصور ھوتے ھیں ۔ قدیم اصطلاح میں

---

* بقرہ — ۱۷۶

مذہب ، تمدن و تہذیب کے تمام دائرۂ عمل پر حاوی تھا ، اس
لئے قرآن جب وحدت ادیان پر زور دیتا ہے اور اس کو ایمان و
یقین کا مرکزی اصول قرار دیتا ہے تو اس کا مطلب تمام
انسانی تہذیبوں کی اساسی وحدت ہوتا ہے ۔ اسلام نے اس امر کی
تعلیم دی کہ روحانیت اور نجات کسی گروہ یا جماعت کی اجارہ داری
نہیں ہے ، جو بلا شرکت غیرے اپنے لئے اسکی دعویدار
ہو ۔ اس نے یہودیوں کے چہیتی قوم ہونے کے تصور کو رد
کر دیا ، جو خود کو خدا کے خاص فضل و عنایت کا مستحق
سمجھتے تھے اور اپنے لئے توفق و برتری کے امتیازی حق کو بہر حال
باقی رکھنا چاہتے تھے ۔ قرآن نے یہ تعلیم دی کہ کوئی گروہ یا
جماعت ہمیشہ کے لئے حق یافتہ نہیں ہے ۔ ہر ایک ملت نیک و
بد افراد پر مشتمل ہوتی ہے ۔ یہ نیکی ہی ہے کہ جب اس کا
پلہ کسی جماعت میں بھاری ہوتا ہے تو وہ اس کو برتری اور
قیادت کا حق عطا کرتی ہے ۔ بصورت دیگر ہر قسم کی نجات ،
انفرادی نجات کا حکم رکھتی ہے ۔ از روئے مذہب کوئی کِسی
دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا ۔ بلیٰ من اسلم وجھہ للّٰہ وھو
محسن فلہ اجرہ عند ربہ (البقرہ-١٠٦) ''ہاں! جس کسی نے
خدا کے آگے سر نیاز جھکا دیا اور نیک عمل بھی ہوا ، تو وہ
اپنے پروردگار سے اپنا اجرُ پائیگا''۔ دین ایک فطری قانون الٰہی
ہے ۔ جب کوئی قوم اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا
ترک کر دیتی ہے ، جو انسانی کی روحانی فطرت کا قانون ہے ،
تو تہذیب و تمدن کی شمع روشن رکھنے کیلئے یہ خدمت ان لوگوں
کے تفویض کر دی جاتی ہے جو اپنی صلاحیت کا ثبوت اعلیٰ
بصیرت اور برتر حیات سے دیتے ہیں ۔ اس طرح جماعتی تفوق و
برتری ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں منتقل ہوتی رہتی ہے ۔

تاریخ انسانیت میں مختلف قومیں ، مختلف زمانوں میں ، اپنی گوناگوں خدمات سے انسانی تہذیب و شائستگی کے سرمایہ میں اضافہ کرتی رہیں، لیکن اعلیٰ ترین تہذیبیں ترک و انقطاع سے نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ اخذ و اختیار کے ذریعہ پروان چڑھیں ، اور ترقی پذیر حیات کی کیمیا گری سے ان کی ماہیت تبدیل ہوتی رہی - خذ ما صفا ودع ما کدر ایک عام اسلامی اصول ہے۔ اسلام نے عبرانیت کی وہ تمام چیزیں برقرار رکھیں جو اخلاق و روحانی زندگی کو سہارنے کی صلاحیت رکھتی تھیں ، لیکن عبرانیوں کی تنگ نظری اور سخت گیری ترک کر دی گئی - اسی طرح اسلام نے بے لوث عیسائیت کے ہمیشہ قائم رہنے والے قابل قدر عناصر کو برقرار رکھا ، لیکن اس کی حد سے متجاوز رہبانیت اور آخرت پرستی کو رد کر دیا - اسی طرح مسلمان یونانیوں کے ذہنی کارناموں کے بھی وارث بنے، انہیں پروان چڑھایا اور آخر میں اپنا یہ سارا سرمایہ مغرب کو عطا کردیا - جب ہم اسلام کی ابتدائی چھ صدیوں کی تہذیبی لطافتوں کا جائزہ لیتے ہیں ، تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کی غیر معمولی ذہانت نے تمام تہذیبوں کے بہترین عناصر کو بہم آمیز کیا اور اس امتزاج کو ایک تخلیقی صورت عطا کی -

صدیوں کی غفلت و جمود کے بعد اب مسلمانوں کو اس تخلیقی جذب و انجذاب کی روح کو دوبارہ تسخیر کرنا ہے - گذشتہ تین صدیوں کے دوران میں ، جبکہ وہ غفلت کی نیند سو رہے تھے، مغرب مسلسل اور باقاعدہ طور پر مادی، اجتماعی، سیاسی اور ذہنی ترقی کرتا رہا - حکمیاتی دریافت و تحقیق کے محرک مسلمان ہی تھے ، مگر وہ اس جذبۂ عمل کو دوسروں کے سپرد کر کے خود بے نیاز حرکت و عمل ہو گئے - نشاۃ جدیدہ ،

دور اصلاح و تجدید ، صنعتی انقلاب ، فرانسیسی انقلاب اور حالیہ اشتراکی یا اشتمالی عظیم معاشری تغیرات نے سارے یورپ میں ایک ھیجان برپا کر دیا جس سے زندگی کے نئے تصورات اور جدید سانچے وجود میں آئے ۔ مسلمان بھی ان کے محض تماشائی نہ رہ سکے ۔ یہ تمام تحریکات ان کے قریب سے ہو کر گذریں اور بالآخر انہیں جالیا ، اور ہر چہار طرف سے گھیر کر سیاسی اور معاشی حیثیت سے اپنا دست نگر بنا لیا ۔ ان تحریکات سے جو اثرات پھیلے وہ اسقدر قوی تھے کہ شدید نقصان اٹھائے بغیر انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ جیسا کہ میں نے اس سے قبل کہا ھے کہ اسلام نے عروج و ترقی ، تقلید یا انتخابیت سے نہیں بلکہ تخلیقی اخذ و اختراع سے حاصل کی تھی ۔ مسلمان اپنی اس سابقہ روش کو اختیار کر کے پھر سے ایک نئی زندگی حاصل کر سکتے ھیں ۔ یہ کہنا بالکل عبث ھے کہ مغرب نے صرف مادی ترقی کی ھے ۔ زندگی ایک سالم کل ھے اور کسی خلاء میں مادی ترقی کا حصول محال ھے ، اور نہ یہ ترقی حیات کے دیگر پہلوؤں سے کنارہ کش رہ سکتی ھے ۔ مادہ و روح ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رھتے ھیں ۔ سائنس اور صنعتی علوم انسان کی درجہ بدرجہ آزادی کے ذریعہ فروغ پاتے ھیں ، اور ان میں انسانی زندگی کو اسطرح بدل ڈالنے کی صلاحیت ھے کہ وہ پہچانی بھی نہ جاسکے ۔ یہ علوم عمدہ اصول حفظان صحت ، بہتر تندرستی ، اعلیٰ معیار زندگی ، وسیع عام تعلیم اور انسان کے لئے ھمہ جہتی ترقی و استکمال نفس کے مواقع بہم پہنچا سکتے ھیں ۔ زندگی کی عظیم طاقتوں کی طرح ان کا بھی غلط استعمال کیا جا سکتا ھے ، اور ان کا غلط استعمال امن و جنگ دونوں حالتوں میں ہوتا رھتا ھے ۔ انسان کا فرض ھے کہ بجائے تخریبی کاموں کے انہیں تعمیری

کاموں میں لگائے۔ اس وقت مسلمانوں کو دوسروں سے سب کچھ سیکھنا ، اور ان سے بہتر طریق پر استفادہ کرنا ہے۔ صنعتی اعتبار سے پس ماندہ علاقوں کا مزدور پیشہ اور محکوم بن جانا اور جن قوموں کو علم نے قوت عطا کی ہے ان کی ادنیٰ خدمات انجام دینا ، ایک لا بدی امر ہے۔ ابتدائی اسلام نے سیاسی و معاشری میدان عمل میں یورپ کو جمہوریت کا اعلیٰ تصور عطا کیا جس میں سلاطین ، امراء اور حقوق یافتہ طبقات کی کوئی مسلمہ حیثیت نہ تھی ، اور مغرب کو معاشی زندگی میں ایسی تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ کیا جو قومی دولت کی گردش کو معدودے چند مالداروں میں محدود ہونے سے رو کدیں۔ خود مسلمانوں نے اس نصب العین کو بہت جلد نظرانداز کردیا اور دوبارہ اس کو حاصل کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔ یہ دوسرے لوگ تھے جنہوں نے اس نصب العین تک رسائی حاصل کرنے کی جہد و سعی کی ، اور اس کو دستوری ترمیموں کے ذریعہ روبہ عمل لانے کے وسائل و ذرائع سوچتے رہے۔ حریت ، اخوت اور مساوات کا نعرہ انقلاب فرانس سے بہت پہلے اصلاً مذہب اسلام کا ایک جزو رہا ہے۔ زائد دولت پر محصول عاید کرنا اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے ، مگر موجودہ اشتراکیت نے اس خدمت کو کسی اسلامی ملک سے زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دیا ہے۔ معاشی طبقات کو تسلیم نہ کرنا بھی اسلامی نمونہ کی زندگی کا ایک تکمیلی جزو تھا۔ حضرت ابوذر رض جو معاشی اور معاشری مساوات کے علم بردار تھے ، مارکس اور دیگر مساوات پسند افراد سے اس معاملہ میں ایک ہزار سالہ سبقت رکھتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی سرمایہ داروں نے ان کی مزاحمت کی اور حکومت کو ان پر

نگرانی رکھنے کی طرف توجہ دلائی ، لیکن یہ برابر ان کے خلاف احتجاج کرتے اور یہ حجت پیش کرتے رہے کہ قرآن و سنت کی تعلیم ایسی ہی ہے - مغرب میں نسلی اور قومی امتیازات پر زور دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہٹلر اور مسولینی کا ظہور ہوا - اس اعتبار سے تو اشتمالی امریکیوں اور برطانوی دولت مشترکہ سے بھی بہتر ہیں - لیکن مسلمان سیاسی عمومیت کھو کر بھی معاشری عمومیت پر عمل پیرا رہے - مسلمان کسی قسم کے بھی رنگ و نسل کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتے - آنحضرت ص کا ارشاد ہے کہ تم اپنے میں سے بہترین آدمی کا بطور اپنے قائد کے انتخاب کرو ، اور اس کی فرمانبرداری کرو خواہ وہ ایک حبشی نژاد ہی کیوں نہ ہو - حجۃ الوداع کے موقع پر ، جبکہ اس امر کا اندیشہ تھا کہ عرب قومی و نسلی فخر و غرور کے نشہ میں چور ہوجائینگے ،آپ نے آخری خطبہ میں یہ اعلان فرمایا کہ عرب کو غیر عرب پر کوئی حقیقی تفوق حاصل نہیں ہے ، اور نہ غیر عرب کسی عرب پر کوئی ذاتی برتری رکھتا ہے - آپ نے اس موقع پر خدا کوگواہ ٹھہرایا اور یہ فرمایا کہ تمام بنی نوع انسان مثل ایک خاندان کے ہیں ، اور کسی فرد کو بزرگی و برتری صرف اعلیٰ کردار سے حاصل ہوتی ہے - اسلام بجز اس کے کسی دوسرے معیار کو تسلیم نہیں کرتا - مشہور برطانوی مورخ ٹائن بی (Toynbee) کہتا ہے کہ اسلام کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ کسی دوسری تہذیب سے زیادہ اسلام نے اصولی انسانیت پر عمل کیا - نسل انسانی کے حال و استقبال کے لیے یہ سب سے زیادہ اہم کام ہے - یورپ کی حکومتیں لاتعداد افریقیوں کو کچل رہی ہیں اور ابتدائی حقوق اور شہری آزادیاں دینے سے انکار کر رہی ہیں -

جنوبی افریقہ کی یونین ، دولت مشترکہ کا ایک جزو ہے جس کا دنیا کے سامنے یہ اعلان ہے کہ وہ جمہوریت اور بنیادی انسانی حقوق کی پشت پناہ ہے ، لیکن اسکے باوجود جنوبی افریقہ ایک قسم کی فاشستی مملکت ہے ۔ فرانسیسیوں نے انقلاب فرانس کے ایک مکروہ قسم کی نعروں کو فراموش کر دیا ، اور معاشی انتفاع کے پیش نظر شمالی افریقہ اور انڈو چائنا کو اپنے زیر تصرف رکھنے کی جد و جہد کرتے رہے ۔ جب مسلمان بیدار ہو کر دوبارہ اٹھ کھڑے ہونگے تو ان تمام ریاکاریوں کا خاتمہ کردینگے ، کیونکہ یہ اسلام کی روح کے منافی ہیں ۔ مسلمانوں کو مغربی جمہوریتوں کے اصول فن کچھ نہ کچھ سیکھنے پڑینگے ، لیکن وہ پوری طرح ان کی تائید نہیں کر سکتے ۔ اس لئے کہ انہیں غلامانہ تقلید کی حاجت نہیں ، بلکہ انتخاب میں بڑی احتیاط اور ذوق سلیم سے کام لینے کی ضرورت ہے ۔ وہ قومیں جو عروج و ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہیں ، جب وہ بیدار ہوتی ہیں تو کئی باتوں میں سخت رکاوٹوں سے دو چار ہوتی ہیں ، مگر ایک لحاظ سے وہ فائدہ میں بھی رہتی ہیں ، اگر وہ کما حقہ اس سے استفادہ کریں ۔ ترقی یافتہ قومیں اب تک مختلف طریقوں کو آزما چکی ہیں اور اس تجربہ و آزمائش کی راہ میں ہر قدم جو اٹھایا گیا ، اس کا نفع و نقصان واضح ہو چکا ہے ۔ انہوں نے جس طرح اپنی دشواریوں کو حل کیا ، اور نئے مسائل سے دو چار ہوئے وہ ان لوگوں کے لئے جو بعد میں ان راہوں پر گامزن ہونا چاہتے ہیں ، ہدایت و انتباہ دونوں کا کام دیتے ہیں ۔ ایک ایسا ملک جو اس وقت صنعتی بننے کا آرزومند ہے اس کو برطانوی صنعتی انقلاب کے ابتدائی مدارج سے گذرنے کی حاجت نہیں ہے ، جو اپنی جلو میں ہزاروں مصائب و آلام لے کر آیا

تھا - صنعتی علوم کی ترقی کے لئے اب کوئی نیا ملک پہلے پہل گیس کی روشنی سے کام شووع کرنے کی بابت نہیں سونچتا، بلکہ وہ بے محابا برقی روشنی سے آغاز کرتا ہے، جو برقابی تنصیبات سے پیدا ہوتی ہے - ایک انتہائی پس ماندہ قوم بھی جدید ترین آلات خرید سکتی ہے -

تاریخ ایک فلسفہ ہے جس میں مثالوں کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے - کائنات میں کوئی چیز اپنے آپ کو بعینہ نہیں دھراتی اور تاریخ انسانیت کے واقعات میں تو ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے - لیکن تمام علوم علاقۂ علت و معلول کی مماثلتوں پر مبنی ہیں - فطرت انسانی اور اس کی حالتوں میں چند بنیادی یکرنگیاں ہیں، یہی وہ حقیقت ہے جس نے ماضی سے سبق حاصل کرنے اور دوسروں کے تجربات سے مستفید ہونے کو ممکن بنا دیا ہے - اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیسویں صدی ایک عالم گیر بیداری کی صدی ہے - دو عالم گیر جنگوں نے انسانی ادارات کو بیخ و بنیاد سے ہلا دیا ہے - یہ جنگیں محض فوجی اور معاشی آویزشیں نہیں تھیں، بلکہ یہ نظامات فکر کی باہمی پیکار بھی تھی - تصورات، جن کے لئے ایک قوم مصیبت جھیلتی اور جان پر کھیلتی ہے، جب ناقابل مقاومت طاقت بن جاتے ہیں تو ان کی غیر خون ریز علمی نظریات کی صورت باقی نہیں رہتی - اگر مسلمان ٹھنڈے دل سے اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے اسباب و علل کا جائزہ لیں تو وہ بہت کچھ اپنے گذشتہ واقعات سے سبق حاصل کر سکتے ہیں - لیکن وہ بلاد یورپ کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کئے بغیر نہ موجودہ دنیا کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ اپنے آپ کو اس کے مطابق کر سکتے ہیں - امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کو مغربی تاریخ کا ایک حصہ کہا

جاسکتا ہے - ان میں ہمیشہ باہمی تاثیر و تاثر، تعامل و تفاعل، اور رد عمل کار فرما رہا - یہ دور کئی صدیوں پر محیط رہا ہے، جو عربی اسلامی قوت کی پہلی ضرب سے شروع ہوتا اور مسلمانان اندلس کے شاندار دور، غیر مقدس صلیبی جنگوں، اور ترکوں کے ہاتھوں بحر روم کے مشرقی علاقوں کی فتح و تسخیر سے گذرتا ہوا مغربی قوتوں کے ابھرنے اور بلا واسطہ و بالواسطہ عالم اسلامی کے ایک بڑے حصہ کو مطیع و منقاد کرنے پر ختم ہوتا ہے - اس طرح مغرب اور دنیائے اسلام کی تاریخ ایک دوسرے سے وابستہ رہی ہے - بھلائی یا برائی کے لئے ان کا ایک دوسرے سے تصادم و تصارف عظیم نتائج کا حامل رہا ہے - دو ہولناک خونیں جنگوں کے دوران میں اور موجودہ اعصابی جنگ میں، مسلمان غیر جانب دار نہ رہ سکے اور طوعاً و کرھاً انہیں فریقین میں سے کسی ایک کی طرف داری کرنی پڑی -

موجودہ حالت میں مسلم ممالک و اقوام کے پاس بہت کم ایسی چیزیں باقی ہیں جنہیں تہذیبی نمونوں کی صورت میں دوسروں کو پیش کیا جا سکے - ان کے پاس صرف نصب العین رہ گئے ہیں، لیکن وہ بھی صدیوں کے مخالف اثرات کے سبب مبہم اور خلط ملط ہو چکے ہیں - بعض ممالک ہنوز سیاسی آزادی کے لئے سر گرم عمل ہیں، اور موجودہ حالت میں ان کا اولین مقصد بیرونی اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے - دوسرے ممالک ایسے ہیں جو اگرچہ سیاسی طور پر آزاد ہیں، تاہم وہ ابتک زبردست فوجی، سیاسی اور خارجی دباؤ کے زیر اثر ہیں - ان میں سے اکثر داخلی معاملات میں صعوبتوں اور سختیوں کا شکار ہیں، جو ایک نئی زندگی کے وجود میں آنے کے وقت پیش آتی ہیں - اسلام ایک سادہ اور عقلی مذہب ہے، جو

خدا پرستی اور ہمہ خیر پروردگاری پر مبنی ہے۔ یہ زندگی کے کل اطراف کی مکمل اور ہم آہنگ نشؤ و ارتقاء کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسا مذہب کبھی فرسودہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ ابدی اقدار کبھی نہیں بدلتے اور طبعی اور انسانی فطرت کے قوانین بھی غیر تغیر پذیر ہوتے۔ لیکن تمام بڑے مذاہب نے اپنے مرکزہ (Nucleus) کے گرد بہت سے قوانین، رسوم اور معمولات جمع کر لئے ہیں، اس لئے ان کی اصل روح، روایات کے انبار میں مفقود ہو گئی ہے۔ قدامت، قانون و آئین کو تقدس کا درجہ عطا کرتی ہے، اور ہر چیز جس پر مذہب کی مہر لگ جاتی ہے وہ واجب التعظیم بن کر ہر قسم کی اصلاح و ترقی کا مقابلہ کرتی ہے۔ ملوکیت کا ادارہ ایک غیر اسلامی ادارہ ہے۔ موروثی حکومت عین اساس اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن ہم اب تک بادشاہوں کو تقریباً مطلق العنان اختیارات کے ساتھ لوگوں پر حکمران پاتے ہیں، اور عوام ان کو اس لئے برداشت کرتے ہیں کہ کوئی قابل عمل متبادل صورت آسانی سے ہاتھ نہیں آتی۔ بایں ہمہ اسلامی جمہوریت کی روح، جہاں کہیں اس کو موقع ملتا ہے، اپنا ظہور کرتی ہے۔ مصر نے اپنے نا اہل بادشاہ کو نکال باہر کیا اور ایران بھی شاہی کو برخاست کرنے کی فکرمیں ہے۔ اگر وہاں بادشاہ رہے گا بھی تو اس کی حیثیت دستوری حکمران کی ہو گی۔ عربستان، جو اسلام کا گہوارہ ہے، بد قسمتی سے اسکی حالت ایسی ہے کہ وہاں مختصر و منتشر خانہ بدوش آبادی کے سبب جدید طرز کی جمہوریت کے لوازم کو فروغ دینا دشوار ہے، لیکن اپنے وقت پر یہاں بھی انقلاب کا ہونا ضروری ہے۔

بہت سے اسلامی ممالک ما قبل صنعت، زرعی تمدن کی زندگی

گذار رہے ہیں ، اس لئے یہاں جس خاص اصلاح کی ضرورت ہے وہ تنظیم دیہی کی از سر نو تعمیر ہے ۔ ایسے علاقوں میں زمینداری عملاً جاگیری نوعیت کی ہے ، تاہم اصولاً اس کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے ۔ آبادی کی اکثریت مزارعین پر مشتمل ہے ، جو بدقت تمام اپنا پیٹ بھر کر زندگی بسر کر رہے ہیں ، اور جو زمینداروں کے ہاتھوں لوٹے اور قدرت کی طرف سے ڈرائے جا رہے ہیں ۔ کسانوں کی حالت کو سدھارنے اور بہتر بنانے کی شدید ضرورت ہے ۔ چونکہ حصول معیشت کی کوئی دوسری راہ نہیں ہے ، اس لئے آبادی کا زیادہ دباؤ زمینوں کی طرف ہے ۔ زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے حق ملکیت زمین کو سختی کے ساتھ دوبارہ جانچنے کی ضرورت ہے ۔ بڑی گرما گرم بحثیں جاری ہیں کہ مسئلہ زمین کی بابت اسلام کیا رہنمائی کرتا ہے ۔ ترقی پسند مفکرین اور معاشری مصلحین یہ نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم زمین کو بنی نوع انسان کی مشترکہ ملکیت قرار دینا چاہتی ہے ۔ قرآن کہتا ہے زمین اللہ کی ملکیت ہے ، اور اسلامی فقہ میں اللہ کا لفظ عام رفاہیت و بہبودی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ لہذا حکومت ، حق ملکیت زمین کا اس طرح بندوبست کرے کہ زمین کی منصفانہ تقسیم کے ساتھ اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکے ۔ اسلام کا قانون وراثت کسی ایک فرد کے پاس کثیر املاک نہیں چھوڑتا ، اور زمین بالآخر ایسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے کہ جس سے نفع بخش کاشت موقوف ہو جاتی ہے ۔ اگر کسی کے پاس ایک ایکڑ زمین بھی ہوتی ہے تو وہ مختلف مقامات پر منتشر رہتی ہے ۔ عموماً بڑے زمیندار غائب باش

مالکان اراضی ہوتے ہیں، جنہیں صرف کاشتکار کی محنت اور گاڑھی کمائی سے نفع اٹھانے سے سروکار رہتا ہے۔ زمین کو بہتر بنانے اور ترقی دینے سے انکو بہت کم دلچسپی ہوتی ہے، لیکن ترقی کے ثمرات کا بڑا حصہ زمیندار کے بنک فاضلات یا تعیشات کے مدات میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ تلخ و تند مباحثہ اس بات پر جاری ہے کہ حق ملکیت زمین کی بابت پیغمبر اسلامؐ کا منشاء کیا تھا، اور آپ کے زبردست اور قابل جانشین حضرت عمرؓ نے اس خصوص میں کیا عمل فرمایا۔ جب عربوں نے زرخیز علاقوں کو فتح کیا تو انہوں نے خلیفہ سے اس کا مطالبہ کیا کہ مفتوحہ علاقے جاگیروں میں تقسیم کرکے فاتحین کو عطا کئے جائیں۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے حضرت عمرؓ نے مجلس شوریٰ طلب فرمائی۔ آپ کا یہ نظریہ تھا کہ اگر کاشتکار کو مثل زرعی غلاموں کے مالکان اراضی کے تحت دیدیا جائے تو یہ غیر دانشمندانہ اور غیر اسلامی عمل ہوگا۔ حریص اور خودغرض لوگوں کی زبردست مخالفت پر غالب آنے کے بعد آپ نے انہیں اس بات پر قائل کردیا کہ مفتوحہ اراضی کو خانگی جائیداد میں تقسیم کرنا بڑی غلطی و زیادتی ہوگی اور آپکا آخری فیصلہ، جس سے دوسروں نے بھی اتفاق کیا، یہ تھا کہ تمام مفتوحہ علاقہ قومی ملکیت قرار پائے۔ ایران، شام، عراق اور مصر کی جاگیریں جو گذشتہ دور میں ان علاقوں کے امراء کی ملکیت میں تھیں ضبط کرلی گئیں، لیکن زمینیں اصل کاشتکاروں کے قبضہ میں چھوڑ دی گئیں جو حکومت کی مقرر کردہ نہایت معمولی شرح لگان ادا کرتے تھے۔ آپ نے اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا کہ مسلمانوں کو ان علاقوں میں اراضی خریدنے کی ممانعت فرما دی۔ مسلمان زمیندار ان نظائر کا حوالہ دیتے ہیں،

جہاں آنحضرتؐ نے لوگوں کو اس امر کی اجازت عطا فرمائی تھی کہ وہ زمین کو اپنی ملکیت میں رکھ کر کاشتکار سے بٹائی پر نقد یا جنس کی صورت میں معاہدہ کریں ۔ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ آنحضرتؐ نے بٹائی کے طریقہ کو جائز رکھا مگر یہ بھی لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ یہ بہتر ہوگا کہ کوئی شخص اسی حد تک زمین اپنے پاس رکھے جس حد تک کہ وہ خود کاشت کرسکتا ہے اور باقی کو بلا کسی معاوضہ کے دوسروں کو کاشت کرنے کے لئے حوالہ کر دے ۔ یہ چیز اسلامی تعلیمات کے عین موافق ہوگی کہ زمین مثل پانی اور ہوا کے سب کو مفت میسر آئے اور صرف پیدا آوری اور باہمی حق و انصاف کے قیود کی تابع رہے ۔ اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ غیر مزروعہ اراضی پر قبضہ کا کوئی جواز نہیں ہے ۔ جب مسلم علاقے کاشتکار اور عوام کے نفع کی خاطر حق ملکیت زمین پر نظر ثانی کریں گے تو یہ معاشری عدل اور معاشی اصلاح کی طرف ایک زبردست قدم ہوگا ۔ غائب باش مالکان اراضی ، جو بڑی بڑی جائیدادوں پر متصرف ہیں ، رجعت پسند مولویوں سے اس امر کے ثبوت میں اعانت چاہ رہے ہیں کہ دوسری املاک کی‌طرح اراضی کے غیر محدود قبضہ کو از روئے اسلام جائز قرار دیں ۔ اس قسم کے زمینداروں اور ایسے مولویوں کی یہ ناپاک ملی بھگت ایسے حالات پیدا کرنے کا موجب ہوگی جس کی انتہا ایک شدید انقلاب کی صورت اختیار کریگی ۔ جنرل نجیب کے بر سر اقتدار آنے کے بعد مصر نے اس مسئلہ کے حل کرنے میں بہت کچھ کامیابی حاصل کی ہے ۔ شاہ ایران نے تالیف قلوب کی خاطر متعدد لگان داروں کو اپنے صرف خاص کی زمینوں پر مالکانہ حق عطا کیا ہے ۔

زمانہ کے آثار یہ بتلا رہے ہیں کہ شاہی کے بعد اب منفعت پیشہ غائب باش زمینداریت کا خاتمہ بھی قریب ہے۔ بڑے زمیندار اپنی املاک کے معاوضوں کا مطالبہ کر رہے ہیں، جو تفصیل سے جانچے جانے پر مشتبہ الاصل ثابت ہوتی ہیں۔ یہ زیادہ تر لوٹی کھسوٹی ہوئی جائیدادیں ہیں اور کسی بڑے زمیندار نے عرق ریزی یا راست معاملگی سے انہیں حاصل نہیں کیا ہے۔

پاکستان میں کسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے چند تدابیر اختیار کی گئی ہیں، لیکن پاکستان کے زعمائے ملت، اہل سیاست اور اصحاب حکومت کا ایک کثیر حصہ چونکہ بڑے زمینداروں پر مشتمل ہے، اس لئے بادل ناخواستہ اور ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ بعض اہل ہمت جو پاکستان کے معمار ہیں اور جن کے ہاتھوں میں عنان اقتدار ہے، اس مملکت میں عدل معاشری کے معیار کو بلند کرنے کے مخلصانہ آرزو مند ہیں اور اپنے اثرات کے ذریعہ خلوص دل سے اس کیلئے کوشاں ہیں، لیکن انہیں ایک قدیم مستحکم نظام کے جمود کو توڑنا اور ذی اثر مستقل مفادات رکھنے والوں کی مقاومت پر غالب آنا ہے۔ عوام کی فلاح و بہبود سے کافی حد تک نظریاتی اور تصوراتی دلچسپی لی جاتی ہے۔ ایک عام حرکت رونما ہو چکی ہے، مگر طریق کار کی سست رفتاری نے غریب طبقوں کو مضطرب و بے چین بنا رکھا ہے۔

اسلامی اصول قانون میں، کسی اور حریت پسند مگر عملی رحجان رکھنے والی سوسائٹی کے قانون کی طرح، حقوق بلا قید و غیر مشروط نہیں ہیں۔ حقوق، فرائض سے اور فرائض، حقوق سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی فرد کا حق اپنے استعمال سے عام

فلاح و بہبود کے قانون کے خلاف جائے تو فرد کا مفاد عام مفاد کی خاطر قربان کر دینا چاہئے ۔ غالب زمینداری والے علاقوں میں اصل ذریعہ معاش زمین ہوتی ہے اور وہاں کاشت کاری کے طریقے اور حق ملکیت زمین کے اصول خود اپنے طور پر درست ہونے کے لئے چھوڑے نہیں جا سکتے ۔ اصول عدم مداخلت تجارت اور صنعت و حرفت میں منظم و منضبط اجتماعی تنظیم کے لئے بتدریج جگہ خالی کر رہا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ زراعت کو ، جو کثیر و لا تعداد آبادی کا اصل ذریعہ معاش ہے ' قدیم روایات اور طریقوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اسلام نے ملکیت زمین کے کسی مخصوص نظام کی اشاعت نہیں کی ۔ مختلف مقامات اور جداگانہ حالات کے تحت طرح طرح کے نظامات عمل میں لائے اور روا رکھے گئے ۔ مختلف زرعی نظامات کو عام فلاح و بہبود اور عدل معاشری کے مطابق نئی تشکیل دینا ضروری ہے ۔

دنیا میں مشکل سے کوئی ملک ایسا ہوگا ' جو اشتمالیت کے تصادم و تصارف سے راست یا بالواسطہ متاثر نہ ہوا ہو ۔ ایشیائی ممالک میں عام باشندگان ملک اشتمالیت کے فلسفہ اور مسلک کی بابت نہ کچھ جانتے ہیں اور نہ انہیں اس کی کوئی فکر ہے ۔ اگر وہ روس کی کلیت پسندی و ہمہ گیری کا پورا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کریں تو یقیناً اس کے بہت سے تصورات اور طریقوں سے کانپ اٹھیں گے ۔ عام طور پر مسلمان عوام اور روشن خیال طبقہ ، سوا چند منتشر لا ادریوں (Agnostics) اور دھریوں کے سب اسلام پر کامل ایمان رکھنے والے ہیں ۔ ان میں سے بعض روایات پرست اصول پرست ' اور قدامت پرست ہیں ، جنکے نزدیک دائمی سانچے اور نمونے کسی بعید

ماضی میں بن چکے ہیں، اور بعض آزاد خیال خدا پرست ہیں، جو اسلام میں ایک خاطر خواہ تصور زندگی پاتے ہیں، اور اس کی جدید تفسیر و تعبیر کے آرزو مند ہیں جس کو وہ روح اسلام کے منافی نہیں سمجھتے، ان میں سے کوئی ملحد اور مادہ پرست نہیں ہے۔ اور ان کے لئے مارکسیت کوئی نظریاتی یا جذباتی دلکشی نہیں رکھتی۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ روس نے، جو غالب حیثیت سے ایک جاگیرداری اور زرعی ملک تھا، تھوڑے عرصہ میں منصوبہ بند اجتماعی تنظیم کے ذریعہ ترقی حاصل کی، پیداوار میں اضافہ ہوا اور وہاں کسان اچھا خاصہ معاوضہ پا رہا ہے، تو وہ اس کی طرف جھک پڑتے ہیں۔ روس نے اجتماعی کاشتکاری، نظام زمینداری کی مسدودی، اور چھوٹی چھوٹی پٹہ داریوں کی خرابیوں کے خاتمے سے اپنی زراعت کو ترقی دی ہے۔ ایک عام آدمی یہ یقین کرنے پر مجبور ہے کہ یہ طریق اس قدیم نظام سے کہیں بہتر ہے جو چند تباہ کار لوگوں کے سوا دوسروں کو فائدہ نہیں پہنچاتا۔ شہروں میں مزدور ہر وقت یہ سنتے رہتے ہیں کہ روس میں بے روزگاری نہیں ہے، تعلیم اور طبی امداد مفت اور عام ہے، اور غذا اور لباس و مکان کا معیار اگرچہ انگلستان یا امریکہ کے مقابلہ میں ادنٰی ہے، مگر ایشیا میں ایک عام آدمی کے لئے تشفی بخش اور قابل اطمینان ہے، تو وہ کمیونزم کی طرف نظریں دوڑاتا ہے اور اس کو تمام دکھوں کا مداوا سمجھنے لگتا ہے۔ کمیونزم جو غریب ملکوں کو اپنا شیدائی بناتا ہے، وہ ایسا کمیونزم ہے جس کی دلربائی محض افلاس و فاقہ کی پیدا کردہ ہے۔ اشتمالی چین نے روزانہ ایک

پیاله اناج هر باشندۂ ملک کے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔ فاشیت
نے بھی بالکل اسی طرح پر اطالویوں کی ایک کثیر تعداد
کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ مسولینی
سے قبل وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں روٹی کہاں سے ملے گی
اور یہ کہ آیا انہیں روٹی ملیگی بھی یا نہیں ، لیکن فاشیت کے
بعد وہ اس خصوص میں خود کو بے خطر محسوس کرنے
لگے۔ امریکہ اپنی غیر معمولی صنعتی ترقی ' زبردست قدرتی
ذرائع ، اور ہند و چین کے ، مقابلے میں محدود آبادی
کے سبب ، اپنے مزدوروں کو رئیسانہ اور شاندار اجرتیں ادا
کر سکتا ہے۔یہاں ایک نجار یا معمار کی ایک گھنٹہ کی اجرت
بہت سے دیگر ملکوں کی دو یا تین دن کی مزدوری سے زائد
ہوتی ہے۔ بڑے سرمایہ داروں کی مٹھی بھر جماعت کے پاس
بے حد و شمار دولت بنکوں میں جمع ہو سکتی ہے ، مگر
یہ چیز ایک عام آدمی کے معیار زندگی کو علی‌الرغم متاثر
کرتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی ، جس کے پاس خود اپنا برقی
چولھا ، ریفری جیریٹر اور ٹیلی ویژن سٹ ہوتا ہے اور بالعموم
ایک مستعملہ موٹر بھی سواری کے لئے رہتی ہے۔ برطانوی
مزدور بھی جو بیک وقت انفرادی اور اشتراکی ، دونوں ہوتا
ہے روس کی مثال میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتا۔ وہ
اپنی انفرادی آزادی کا حد سے زیادہ دلدادہ ہوتا ہے۔ مگر
مسلمان علاقے تہی دست و فرومایہ ہیں۔ انکی زرعی پیداوار
ناکافی و ادنیٰ اور صنعتی پیداوار ناقابل لحاظ ہے۔ ان ملکوں
میں صنعتی مزدوروں کا طبقہ نہیں ہے جن سے مارکس بغاوت اور
انقلاب کی امیدیں باندھے ہوئے تھا ' لیکن یہاں کثیر تعداد
میں کسان ہیں اسلئے ان ملکوں میں زرعی ترقی اور مزارعین کے

لئے ابتدائی حق و انصاف کی ضرورت ہے۔ اگر پر امن طریقوں سے انکو حقوق مل جائیں تو یہ اس کو زیادہ پسند کرینگے۔ اگر صلح و آشتی کے ذرائع مفید و کار آمد نہوئے اور برسر اقتدار منفعت پیشہ زمینداروں نے قوانین کے نفاذ میں ایثار و حق پسندی سے کام نہ لیا، تو فاقہ زدگی کی بے پناہ قوت ان مفلوک الحالوں کو بے جگری اور تشدد پر آمادہ کر دیگی۔ انہیں اس امر کا ایقان ہے کہ اگر اسلام کو صحیح طریقہ پر سمجھا جائے اور عمل کیا جائے تو وہ ان کی خاطر خواہ دستگیری کر سکتا ہے اور اسی خیال کے تحت وہ معاشری عدل کے لئے اپنی داد خواہی میں اسلام ہی سے داد خواہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر اسلام کی قدامت پرست اور رجعت پسند تفسیر ان کی راہ میں مزاحم ہوگی تو وہ مذہب ہی سے بد ظن ہو کر اسے خیر باد کہہ دینگے۔

روسی تجربہ یا چینی تجربہ نے اگر مفلوک الحال کسانوں کو بہتر مواقع عطا کئے ہیں تو انہیں حاصل کرنے کے لئے اسلام مسلمانوں کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ اگر مسلمان سائنسی اور صنعتی طریقے ان لوگوں سے سیکھتے ہیں جنہوں نے صبر آزما تحقیقات اور آزمائش و خطا کے طریقہ سے انہیں ترقی دی ہے، اور تدریجاً ایک عام آدمی کی حالت کو سدھارا ہے، تو ان کی زرعی تنظیم بھی منفعت پیشگی کے بجائے امداد باھمی کے اصول پر کیوں نہو؟

اسلام ایک جمہوریت پسند مذہب ہے، لیکن روحانی کمال کی طرح جمہوریت بھی ایک مثالی چیز ہے۔ یہ جو شکل اختیار کرتی ہے وہ عہد بہ عہد بدلتی رہتی ہے اور حالات، طبائع اور قوموں کے تدریجی پس منظر کے مطابق جو

اس کی تشکیل قوانین و ادارات میں کرتے ہیں، اس میں، تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ابتدا میں اسلام نے اس سمت میں بڑی اولوالعزمانہ پیش قدمی کی اور وہ سب کچھ کر دکھایا جسکی اس وقت کے حالات نے اجازت دی۔ اس نے بہت سے ایسے نظامات کو برداشت کیا جو نظریاتی لحاظ سے اس کی روح کے منافی تھے، لیکن جو کسی فرمان کے ذریعہ مٹائے نہیں جا سکتے تھے۔ مثال کے طور پر کوئی قدیم اخلاق اصول یا مسلک بالکلیہ غلامی کا استیصال نہ کر سکا، کیونکہ معیشت کی تمام تر عمارت اسی بنیاد پر استوار تھی۔ اسلام نے غلاموں کی حالت بہتر بنائی اور حسن سلوک کے لئے قوانین کا نفاذ کیا۔ غلاموں کو آزاد کرنے کی تلقین ایک زبردست مستحسن فعل کی طرح کی گئی اور حکومت کی طرف سے اس کام پر روپیہ خرچ کیا جانا ضروری قرار دیا۔ چنانچہ یہ کہنا بالکل نازیبا ہوگا کہ اسلام جمہوریت پسند نہیں تھا، کیونکہ اس نے غلامی کو روا رکھا اور بیک جنبش قلم اس کا انسداد نہیں کیا۔ اسلام کے معنی چند تصوری رجحانات کے ہیں جن کے مطابق انسانیت دائماً ترقی کرتی رہتی ہے۔ اسلام کے زبردست فلسفی شاعر اقبال کے الفاظ میں یہ تکمیل سے زیادہ تمنا کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس نے خود کو نظامات و آئین میں متشکل کیا، مگر یہ اس کی عارضی صورتیں ہیں۔ جب ترقی کناں زندگی اجازت دیتی ہے تو یہ جدید نظامات و ادارات میں صورت پذیر ہو سکتا ہے۔ اسلام کے ظہور کے وقت حق ملکیت زمین کے جو نظامات رائج تھے ان کی اصلاح عدل معاشری کے مفاد کی خاطر کی گئی۔ ان میں سے گو بعض کو روا رکھا گیا مگر انکو بطور معیار کے تصور نہیں کیا گیا۔ آبادی میں روز افزوں اضافہ

اور اراضیات پر کثیر ھجوم کے سبب بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ھے - یہ کام جزوی اصلاح سے نہیں ھو سکتا، بلکہ پورے سانچوں کو سختی کے ساتھ بدلنا پڑیگا - مثال کے طور پر مشینی آلات کے ذریعہ زراعت اس صدی سے قبل کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھی اور قطع نظر دیگر وجوھات کے یہ ترقی بجائے خود مشترکہ طور پر زراعت بر پیمانۂ کبیر کی طرف اشارہ کر رھی ھے -

جب یہ بات پوری طرح ذھن نشین ھو جائے کہ مسلمانوں کو اپنی موجودہ پس ماندگی میں ترقی یافتہ مغربی ممالک سے بہت کچھ سیکھنا ھے ، تو ساتھ ھی واضح طور پر یہ بھی سمجھ لینا چاھئے کہ انہیں اپنے نظریات میں کسی ھدایت اور رھبری کی حاجت نہیں ھے - انہیں خدا کی بابت اپنے تصور ' یا خدا اور انسان کے تعلق ' یا انسان اور کائینات کی باھمی نسبت کو ترقی دینے کے لئے مغرب کی طرف رخ کرنا نہیں ھے - ایسے ھی انہیں اخلاقیات کے کوئی جدید اصول سیکھنے کی ' اور نہ مغرب سے جمہوریت کے اساسی اصول حاصل کرنے کی ضرورت ھے - مسلمانوں کو یہ اصول سیکھنے کی نہیں بلکہ مابقی انسانیت کو سکھانے کی ضرورت ھے ' بشرطیکہ پہلے وہ خود اسلام کی اصلی روح اور اس کے اساسی میلانات سے انکو پھر حاصل کریں - ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں شاید دوسروں نے ان سے زیادہ بہتر کام انجام دیا ھے - اسلئے انہیں مغربی نظامات کا مطالعہ کرنا چاھئے - مگر ان میں سے کوئی بھی وہ نہ من حیث الکل اختیار کریں اور نہ ان کی کورانہ تقلید کریں - انہیں اپنے قومی ذوق اور منشائے اسلام کے مطابق ان میں تصرف کرنا پڑیگا - مغرب میں مختلف نوعیتوں کی جمہوریتیں

ھیں۔ برطانوی، فرانسیسی، اسکینڈی نیوی اور سوئیستانی جمہوریتیں سب کی سب اپنے امتیازی اوصاف رکھتی ھیں۔ اگر مسلمان ان میں سے کسی ایک نمونہ کی محض تقلید کرکے ترقی کرنا چاھیں، تو وہ اس کو کامیابی تک نہ پہنچا سکینگے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ تمام مسلم ممالک جغرافیائی، نسلی اور معاشی اختلافات کے سبب کسی ایک نمونہ کو اختیار نہیں کر سکتے۔ مثلاً خانہ بدوش اقوام کسی مہذب مملکت کے سکونت پذیر باشندوں کی طرح ایک ھی قسم کی جمہوریت اختیار نہیں کر سکتے۔ عالم اسلامی ایک نہایت وسیع دنیا ہے۔ اسلام کے عام تصورات ایک ھی ھیں، لیکن ان کی عملی صورت قوم بہ قوم اور ملک بہ ملک بدلتی رھتی ہے۔

اسلام ایک فطری مذھب ہے۔ قرآن اس کی اسی طرح تعریف کرتا ہے۔ مگر فطرت میکانی طور پر یکساں و یکرنگ نہیں۔ یہ ریاضیاتی طریق پر قابل پیمائش اور قابل غور مظاھر میں محدود نہیں۔ علاوہ طبیعی فطرت کے۔ فطرت انسانی اور فطرت الہی بھی اپنا وجود رکھتی ہے یہ کائنات روحانی ہے جو مادیات سے متمائز و مختلف ہے۔ مگر کل کائنات ایک مستقل اور ایسے ھی ایک متبدل پہلو رکھتی ہے۔ نوامیس فطرت نت نئے مظاھر سے، جو ان قوانین کے مطابق رونما ھوتے ھیں، زیادہ ثابت و راسخ ھوتے ھیں۔ خدا ھمیشہ یکساں و یکرنگ ہے، تاھم اس کا تخلیقی عمل کبھی ایک ھی طرز پر ھمرنگی کے ساتھ کسی فعل کا اعادہ نہیں کرتا۔ جب کوئی وجود اپنے مرتبہ میں ترقی کرتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ مطابقت پذیر ھوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ انسانیت

میں منطقی حرکت موجود ہے ' جو نہ مادہ پرستانہ ہے اور نہ عقل پرستانہ ۔ زندگی تنوع پیدا کرتی ہے ۔ اختلاف و اتحاد پہلو بہ پہلو ترقی کرتے ہیں ' جس سے زندگی تدریجاً سنورتی ہے ۔ انسانی ادارات کو چاہئے کہ وہ تمام موجودات کی اس بنیادی سرشت کو پیش نظر رکھے اور ثبات و تغیر اور نظم و بے نظمی کے درمیان ہمیشہ ایک جدید توازن قائم رکھے ۔ جبر و اختیار دونوں مساوی طور پر حقیقی ہیں ۔ مادہ کاملاً مجبور نہیں اور نہ روح کلیتاً مختار ہے ۔

جیسے جیسے زندگی ترقی کرتی ہے ، جدید تصورات پیدا ہوتے ہیں ، جو نئے تجربات کی توضیح کرتے ہیں ۔ قوانین و آئین کو بدلے ہوئے ماحول کے ساتھ جدید مطابقتوں کے وقت پیہم کوشش سے تشکیل دینا پڑتا ہے ۔ اسلامی مفکر ہر قسم کی زندگی کو سنوارنے والے توافقات سے بخوبی مالا مال ہے ۔ تمام تقلید پرستیاں جنہوں نے معنی سے زیادہ لفظ کی پرستش شروع کر دی اور ہر حالت اور ہر زمانہ میں زندگی کے طور طریقوں کے انضباط کے لئے تفصیلی قوانین وضع کئے ' وہ ایک ایسے مذہبی شعور کے متحجرات بن گئے جو کبھی زندگی کی برکتوں سے مالا مال تھا ۔ ایک فرانسیسی آزاد خیال روحانی نے اذعانی اصول کی بابت بالکل سچ کہا ہے کہ ''اذعانی اصول مردوں کا ایک ایسا زندہ مذہب ہے ، جو زندوں کے لئے ایک مردہ و بے جان مذہب بن چکا ہے'' ۔

کوئی مذہب زندہ رہنے سے اس وقت باز رہتا ہے جب اس کے تصورات و عادات اور رسوم و رواج ایسے بے لوچ ہو جاتے ہیں کہ تمام جدید تجربات و اختیارات سے خطرناک بدعات کی طرح اجتناب کیا جانے لگتا ہے ۔ ہندو مت غیر

متبدل ذات پات کی بندشوں کے سبب اپنی زندگی کھو بیٹھا۔ اس میں پیدائش سے موت تک زندگی کے ہر عمل کی کسی قدیم ضابطہ سے توثیق کرنی پڑتی تھی۔ یہودیوں نے اپنی روحانی زندگی اس وقت کھو دی جب یہودیت ظاہر پرستی اور فریسیت (Pharisaism) میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو گئی۔ غیر استدلالی عیسائیت کا دور دورہ قرون مظلمہ کے ساتھ ہم زمان رہا۔ اگر کوئی راسخ الاعتقادی مخلصانہ ہو تو وہ خدا کی رضا جوئی میں احترام اور طلب صادق سے وابستہ ہوتی ہے۔ مگر خاص موقعوں کے قوانین و احکام کو تمام زمانوں کے لئے ضابطہ کی صورت میں تبدیل کرنے سے وحی کی اصل حیثیت قائم نہیں رہتی، جس میں کہ اس کا نزول ہوا تھا۔ جیسا کہ ولیم ٹمپل نے اپنی تقاریر گفرڈ میں کہا تھا ''ایک ہی حکم سزا کے وہ سب مستوجب ہیں جو فریسی اصول کی پیروی میں غیر متبدل قاعدوں کے ذریعہ زندگی کا انضباط چاہتے ہیں۔ وحی کا نزول ایک زندہ تجربہ کی صورت میں ہوا ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ اس میں دائمی شہادت ہے ان کا بیان عقائد کی شکل میں نہیں کیا جا سکتا''۔ اسلام کے ظہور کے وقت یہودی فریسیوں کے زیر اثر تھے، اور عیسائی ظلمت پسند اور گمراہ کلیسائی اقتدار کے محکوم تھے۔ اسلام انسانی روح کو آزادی دلانے کی ایک تحریک تھی اور یہ اپنی حیرت انگیز کامیابی کیلئے اپنے آزادانہ نقطہ خیال کا رہین منت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن اور سنت نے مسلمانوں کو معدودے چند قوانین عطا کئے۔ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ دعونی ما ترکتکم، انما اھلک من قبلکم کثرۃ سوالھم و اختلافھم علی انبیائھم، فاذا نھیتکم

عن شیء فا جتنبوه واذا امرتکم بامر فاتوا منه ما استطعتم (متفق علیہ) ''مجھ کو چھوڑ دو جب میں تم کو چھوڑ دوں، بے شک اگلی امتوں کو کثرت سوال نے اور انبیاء کی مخالفت نے ہلاک کیا۔ جب تم کو کسی بات سے منع کروں تو اس سے باز رہو اور جس بات کا حکم دوں اس کو کرو، جتنی تم میں استطاعت ہو''۔ اسلام کسی مذھبی پیشوائیت کے قیام یا کسی مذھبی طبقہ کی تشکیل سے اندیشہ مند تھا، اس خوف سے کہ یہ لوگ خدا اور بندہ کے درمیان وسیلہ کے طور پر کام کرنے لگیں گے اور انسانی روح کی آزادی کو دبا دینگے۔ مسلم قوم میں عیسائی نوعیت کی مذھبی پیشوائیت کے فروغ پانے کا امکان نہیں اور نہ ھندؤں کی طرح کوئی پروھتی فرقہ وجود میں آسکتا ھے، لیکن مولویوں نے بتدریج فریسیت و ظاھر پرستی کو ترقی دی اور یہ غیر سرکاری دینی حکومت کا ایک طبقہ بن بیٹھے۔ اگرچہ کہ ان کی کوئی درجہ وار ترتیب نہ تھی، مگر تمام ضروری اور جدید ترقیوں کے کے خلاف مقاومت کی کافی قوت رکھتے تھے۔ آنحضرتؐ نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ایک زمانہ آئیگا جب مسلمانوں میں بھی غیر استدلالی انداز فکر ترقی پا جائیگا، جیسا کہ ظہور اسلام کے وقت یہودیوں اور عیسائیوں میں موجود تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان بھی نجات کی اجارہ داری کے دعویدار بن جائیں گے اور اپنی اخلاقی اور روحانی حیثیت کا لحاظ کئے بغیر خود کو ''چہیتی قوم'' سمجھنے لگیں گے۔ یہ فریسی نقطہ خیال کی مدح و ثنا کرینگے، زیادہ زور ظاھری پابندیوں پر دینگے اور لفظ و صورت کو روح و معنی پر ترجیح دیتے ہوئے پوست کی حفاظت میں مغز کو برباد کر دینگے۔ تمام

روشن خیال مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ واقعتاً یہ چیز رونما ہو چکی ہے اور مسلمان اس وقت اپنے خاص رنگ کی فریسیت کے زیر سایہ ، جسے ملائیت کہا جاتا ہے ، زندگی گذار رہے ہیں ۔ اس نے اسلام کی ترقی پذیر روح کا گلا گھونٹ دیا ہے ۔ اس وقت 'ملا' ابدی صداقتوں کا حامل اور نگہبان ہونے کا دعویدار ہے ۔ وہ ہر اہم مسئلہ کا ، کسی قدیم ماخذ کی بنیاد پر ، ایک تیار حل رکھتا ہے ۔ کوئی نیا مفکر و مصلح معتبر نہیں ہوتا کیونکہ آزاد خیالی تمام تقلید پرستوں کے نزدیک مردود قرار دیگئی ہے ۔ سیاسی اقتدار اعلیٰ کے معاملہ میں یہ بادشاہت کو جمہوریت پر ترجیح دیتے ہیں اور ایک فاسق و فاجر اور لا یعقل بادشاہ کو ظل اللہ کا خطاب دیتے ہیں جو حقوق ربانی کی بنا پر حکمرانی کرتا ہے ۔ یہ حق ملکیت زمین کی اصلاح یا امداد باہمی کے اصول پر زرعی ترقی کی طرف ایک قدم بھی بڑھانا نہیں چاہتے ۔ یہ بڑی زمینداریوں کی تائید میں نیک نیت اورپرجوش حامیوں کی طرح کمر بستہ رہتے ہیں ۔ یہ غلاموں کو آزادی دلانے اور اس غیر انسانی ادارہ کو برخاست کرنے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں ۔ اسلامی تعلیم عورت و مرد کے حقوق میں مساوات قائم کرنے کے لئے ہے ، مگر مولوی اس امر کی تبلیغ کرتے ہیں کہ عورت پر مرد کی حکومت قائم ہو ۔ نکاح و طلاق کی بابت اسلام کے معقول قوانین ، مرد کے مفاد کی خاطر مسخ کر دئے گئے ہیں ۔ اور یہ نہایت جسارت کے ساتھ اس امر کا ادعاء کرتے ہیں کہ تمام ترقی پذیر ، آزاد اور مطابقت پذیر قانون سازی کا دروازہ بند ہو چکا ہے ۔ ایک ہزارسال قبل کے فقہاء ، خدا اور اس کے رسول سے زیادہ قابل اعتبار اور مستند بن گئے ہیں ۔ اس رجعت پسند

تقلید پرستی کے اثر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام جامد اور ترقیوں کا مخالف ہو گیا ہے۔

اسلام صرف اسی صورت میں دوبارہ ترقی کر سکتا ہے کہ وہ اپنی دیرینہ وسعت نظر کو پھر سے حاصل کرے اور اپنے ابدی اقدار کو دوبارہ پیش کرے۔ مسلمانوں کو فرد کی آزادی اور احترام کا لحاظ کرتے ہوئے خدا پرستانہ جمہوریت کو فروغ دینا ہوگا۔ اصل اسلام ایک انسان کا دوسرے انسان کے ہاتھوں مذہبی، معاشری، سیاسی اور معاشی استحصال ختم کرنے کی ایک کامیاب کوشش تھی۔ مسلمان اس وقت تک ترقی کرتے رہے جبتک علم و صداقت کی جستجو ان کے نزدیک ایک مذہبی فرض کی شکل میں رہی۔ ذات پات کے نظامات اور طبقات کو ختم کر کے انہوں نے ایک انسانی برادری کی تخلیق کی۔ آزادی، ضمیر اور شہری حقوق میں مساوات ان کے ایمان کے بنیادی اصول تھے۔ ان تمام تہذیبی اثرات کو قبول کرنے کے لئے امت مسلمہ ہمیشہ تیار رہتی جو اسلام کے اساسی اصول کے منافی نہ ہوتے۔ اسلام کے بڑے بڑے فقہاء آزاد خیال اور وسیع النظر تھے۔ اسلامی تہذیب یونان کی ثقافتی خدمات سے بہت کچھ مستفید ہوئی۔ آنحضرت صلعم نے انہیں یہ تعلیم دی تھی کہ مہد سے لحد تک علم کی جستجو میں لگے رہیں خواہ اس کی تلاش میں انہیں چین کے دور افتادہ ملک تک سیاحت کرنا پڑے۔ مسلمان اب بھی ایسی ہی روش اختیار کر کے ترقی کر سکتے ہیں۔ وہ مغرب کی علمی و فنی ترقیوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ وہ مغرب کی اشتراکی تحریکات کے مطالعہ سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ اگر اسلام کی اصلی روح کے ساتھ وہ وفادار ہیں

تو کامیابی کے ساتھ اشتمالیت کی مبارزت طلبی کا مقابلہ کر سکتے ھیں - اشتمالیت میں ھر چیز نا حق اور ناروا نہیں ھے - یہ سرمایہ دارانہ منفعت پیشگی اور ظلمت پسند کلیسائی اقتدار کے خلاف ایک طرح کی بغاوت تھی - یہ قرآن تھا جس نے مارکس سے ایک زمانۂ دراز قبل معاشی عدل و انصاف کی تلقین اس طرح کی تھی کہ ، حتی لا یکون دولۃ بین الا غنیاء منکم ط (الحشر - ۷) (اپنی معاشی زندگی کی تنظیم اس طرح کرو کہ ''دولت چند مالداروں کے درمیان گھومتی نہ رھے''- جائز حدود کے اندر قانون سازی کی اجازت عطا کر کے اس نے استحصال کی جملہ راھیں مسدود کر دیں - زائد از ضرورت دولت قوم کے نادار افراد کی طرف لوٹائی گئی - پیغمبر اسلام نے مسلم مملکت کی بناء خیر و فلاح عامہ کے اصول پر ڈالی ھے - مسلمان ، اشتمالی معاشی منصوبہ بندی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ھیں - روسی اشتمالیت نے اپنے ذاتی اغراض کے حصول کے تحت فرد کے جائز حقوق پر بھی کاملاً قبضہ کر لیا ھے اور یہ چیز بڑی حد تک غیر اسلامی ھے - نیز مسلمان ، مارکسی و لینِنی نظریات کی ملحدانہ یا مادہ پرستانہ اساس بھی قبول نہیں کرسکتے - روس نے ایک عام آدمی کی مادی فلاح و بہبود کے لئے ، اور قدرتی ذرائع سے حکمیاتی طریق پر فائدہ اٹھانے کے بہت سے کام کئے ھیں - اور یہ قابل تعریف ھے - روس کی بابت یہ بالکل سچ کہا گیا ھے کہ جتنی اچھی باتیں اس کے متعلق کہی گئی ھیں وہ بھی درست ھیں ، اور جتنی بری باتیں اس سے منسوب کی گئی ھیں وہ بھی بالکل صحیح ھیں - یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ھے کہ روس کا اثر و نفوذ ایسے ممالک پر بھی ھے جو

اشتمالیت کے مخالف ہیں - مسلم علاقے بھی اس اثر و نفوذ سے نہیں بچ سکتے - اسلام اور جن باتوں کی اس نے حمایت کی ہے ان پر ، موثر غور و فکر کے ذریعہ مسلمان کامیابی کے ساتھ اشتمالیت کی مبارزت طلبی کا مقابلہ کر سکتے ہیں - اشتمالیت ایک قوت عمل رکھنے والی تحریک ہے ، جس میں تمام نادار اور غیر حق یافتہ طبقات کے لئے بڑی دلکشی ہے - ایک رسمی اور غیر متبدل اسلام اس للکار کا مقابلہ نہیں کر سکتا - اگر مسلمان حکومتیں کمزور و بے اصل رعایات و حقوق برخاست کرنے کے لئے کچھ نہ کریں گی ، اور ایک عامی کی مادی اصلاح و ترقی سے بے اعتنائی برتیں گی تو اشتمالیت کی جاذبیت کو کسی طرح کم نہ کیا جا سکے گا - اشتراکیت کا ایک بلند تر نمونہ ہی اس مبارزت طلبی کا مقابلہ کر سکتا ہے - انسان محض روٹی سے زندہ نہیں رہتا ، لیکن ایسے ہی یہ بھی سچ ہے کہ وہ بغیر روٹی کے بھی زندہ نہیں رہ سکتا - بحالت موجودہ ایک غریب آدمی آخرت کے اجر و ثواب کے وعدوں پر مطمئن رہنے کے لئے آمادہ نہیں ہے - مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس زندگی کی فلاح و بہبود اور نیز آخرت کے لئے دعا مانگا کریں - اسلام نے معاشری ، سیاسی اور معاشی اصلاح کی کوشش کو صحت بخش اخلاقی و روحانی زندگی کے لئے بطور شرط اولیں کے قرار دیا ہے - اسلام نے اس امر کو فراموش نہیں کیا کہ انسانی زندگی مادی اساس بھی رکھتی ہے ، اس لئے جسمانی ضرورتوں سے بے اعتنائی ، خود روحانی زندگی کو خطرہ میں ڈالے بغیر ، نہیں کی جا سکتی - اسلام کے نزدیک زندگی کا تصور مثل ایک غیر تقسیم پذیر وجود کے ہے - اخروی روحانیت اور ایسے ہی دنیوی مادیت دونوں انتزاعات اور تجریدات ہیں ،

جنہیں اگر قائم بالذات وجود تسلیم کیا جائے تو وہ زندگی کو انقراض و زوال کی طرف لے جائیگی۔ زندگی اس عالم میں اس طرح بسر کی جائے کہ ہستی کے روحانی پس منظر کی لامتناہیت سے ہر عمل کی تقدیس و تطہیر ہوتی رہے اور زندگی مثل ایک سالم کل اور بحیثیت ایک عظیم تنوع رکھنے والی روحانی وحدت کے فروغ پائے۔ مذہبی تصورات و ادارات جب نئے ماحول کے حقائق سے بے تعلقی برتتے ہیں تو زندگی کو سنوارنے والی قوتوں سے تہی دامن ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی مادی زندگی روحانی اساس سے بے تعلق ہو کر اپنی آپ تردید کرتی اور جامد ہو جاتی ہے جس کا سبب ذات واجب الوجود سے انقطاع و مہجوری ہے۔

مسلمانوں کی زندگی کی اصلاح و تعمیر، اپنی تمام شکلوں میں، مذہب کے اس وسیع نقطہ خیال پر کی جانی چاہئے جس کو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ مذہب و مملکت اور دنیا دار اور دیندار کی تقسیمیں مغرب کی سیاسی اور مذہبی تاریخ کے تقاضوں سے بطور نتیجہ کے پیدا ہوئی ہیں۔ کوئی مسلمان جو اسلام کے منشاء سے آگہی رکھتا ہو، وہ نسل انسانی کی مختلف خانوں میں تقسیم کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ ایک فرد کے لئے مذہب کو بطور معیار عمل کے ہونا چاہئے، تاکہ وہ اپنی روحانی، اخلاقی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو تا حد امکان درجۂ کمال تک پہنچا سکے۔ اس کا فرض منصبی ہے کہ خالق و مخلوق، اور انسان اور ابنائے جنس کے باہمی ربط و تعلق کو ہم آہنگ و برقرار رکھے، اس کے علاوہ دنیا کے متعلق جس میں کہ انسان اپنی زندگی بسر کرتا ہے، ایک صحیح انداز فکر عطا کرے۔

رجعت پسند مذہبی اقتدار سے تنگ آ کر، جہاں روحانی اجارہ داروں کا ایک طبقہ انسان کی شخصی خصوصیتوں کی آزادانہ نشو و نما میں حارج ہوتا رہا، عوام ایک دوسری انتہا لادینی کی طرف جھک پڑے جو مادہ پرستانہ عقلیت کے ساتھ ہمرنگ ہو گئی تھی۔ جب مذہب نے زندگی کی راہ روکنی شروع کی تو سیاسیات کو ایسے تنگ نظر مذہب سے کنارہ کش ہو جانا پڑا۔ ذہنی آزادی کو بھی مذہبی معتقدات اور فقہیات سے علیحدہ ہو کر حاصل کرنا تھا۔ تاریخ کی منطقی حرکت میں یہ تضاد پیدا ہونا ہی تھا جو کہ بجائے خود قائم نہیں رہتا بلکہ ایک نئے نظریہ کی طرف گریز کرتا ہے۔ اگر انسان ان رشتوں کو قطع کر دے جن کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے، تو مقطوعہ اجزاء پژمردہ ہونے لگتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جوابی دعویٰ بھی باوجود اپنے یک رخے پن کے چند کار آمد اقدار کو فروغ دیتا ہے۔ زندگی کو ہر قدم پر کچھ نہ کچھ تردید کرنی پڑتی ہے، تاکہ ایک بیش قدر و لطیف تر تصدیق کی طرف پیش قدمی کر سکے۔ مغرب کی حکمیاتی اور معاشی مادہ پرستی نے زندگی کی چند ایسی شکلوں کو فروغ دیا ہے جن کی نشو و نما مذہبی تقلید پرستیوں اور مولویوں کے مستقل مفادات کے حدود میں رہ کر نہیں ہو سکتی۔ جب مسلمانوں کی ترقی موقوف ہو گئی تو انکی قوت عمل مغربی اقوام میں منتقل ہو گئی۔ مغرب کی عملی سرگرمیوں کی تین صدیوں کے دوران میں تمام عالم اسلامی بے حس و حرکت اور غفلت کی نیند سوتا رہا۔ بیسویں صدی ایک عام بیداری کی صدی تھی۔ دو عالم گیر جنگوں نے، جو مادہ پرستانہ ترقی کا ناگزیر

نتیجہ تھیں ، تمام اجتماعی اور نظریاتی ڈھانچوں کو ھلا دیا ۔
ہر جگہ انسان اپنے مسلمہ اقدار کو دوبارہ جانچنے پر مجبور
ہوا ۔ ایسے علاقوں میں بھی ، جہاں اس انقلابی اکھاڑ پچھاڑ
کا راست اثر نہیں پڑا تھا ، بالواسطہ ذہنی انقلاب رونما
ہوا اور جدید تصورات ، جملہ ادارات کی از سر نو تشکیل
کرنے لگے ۔ ہر جگہ ایک ہل چل مچی ہوئی ہے ۔ قدیم
خیالات اور مستحکم مستقل مفادات ایک طرح کی پس پائی جنگ
لڑ رہے ہیں ۔ سائنس اور صنعتی علوم نے بُعد و مسافت کا
خاتمہ کر کے تمام دنیا کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے ۔ اس
وقت کوئی قوم دوسروں سے جدا رہ کر سیاسی ، معاشی ،
یا ذہنی علیحدگی اختیار نہیں کر سکتی ۔ اگر کوئی قوت دنیا
کے کسی خطہ میں بر سر عمل ہو تو اس کی صدائے
باز گشت سے سارا عالم گونج اٹھتا ہے ۔ پوری دنیا اسوقت ایک
عضویت بن چکی ہے ، اگرچہ عالم گیر اتحاد ابھی تک محض
خواب و خیال اور ایک موہوم و دور دراز منزل مقصود
ہے ۔ عالم اسلامی کے لئے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ وہ وحدت
انسانیت کے حصول میں اپنی اہم خدمت انجام دے ۔ مراکش
سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمان ایک مرکزی منطقہ پر قبضہ
کئے ہوئے ہیں ۔ یہ مشرق و مغرب دونوں سے وابستہ ہیں ۔
قرآن نے انہیں امت وسطی کے خطاب سے سرفراز کیا ہے ۔
اسلام جغرافی اور تہذیبی حیثیت سے ایسا ہی تھا ۔ بیدار و
باخبر اسلام اب پھر وہی کام انجام دے سکتا ہے ۔
مسلمان اسلام کے تکمیلی منشاء کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک
عظیم الشان امتزاج حاصل کرنے کے بہترین موقف میں
ہیں ۔ ابھی مسلمانوں کو جمود و بے حسی پر غلبہ پانا ہے ۔ بہت
کچھ علوم و فنون حاصل کرنا ہے ۔ اور مغربی شہنشاہیت کی

باقی ماندہ یادگاروں سے سیاسی آزادی کی لڑائیاں لڑنی ھیں۔ صدیوں کے جمود کو توڑنے کے لئے متعدد داخلی ھنگاموں کی ضرورت ھے۔ خود اسلام کے مفاد کی خاطر انھیں اپنی تقلید پسندی کو تمام غیر اسلامی اضافوں سے پاک کرنا ھے۔ دائمی اقدار اور ابدی صداقتوں کو بہت سی ایسی ریاکاریوں اور نقالیوں سے پاک صاف کرنا ھے جنھوں نے مذھب کا روپ اختیار کر لیا ھے۔ اسلام کو اب بھی ایک خدا کی پرستش کی اساس پر انسان کو متحد کرنے کا فرض انجام دینا ھے۔ عالم اسلامی ملحدانہ اور شدید مادہ پرست قوتوں کے خلاف ایک بہترین پناہ گاہ بن سکتا ھے۔ ایک عالم گیر مسلم برادری کی بنا ڈالنے کے علاوہ قرآن نے تمام خدا پرستوں کی ایک وسیع برادری پر بھی غور کیا ھے۔ اسلام کے ایک زبردست فلسفی اور مبصر اقبال نے اپنے خطبات ''اسلام میں مذھبی افکار کی تشکیل جدید'' میں یہ کہا ھے کہ ''عہد حاضر کے مسلمان کو چاھئے کہ وہ اپنی حیثیت کا بخوبی اندازہ کرے۔ اساسی اصول کی روشنی میں اپنی معاشری زندگی کی اصلاح کرے اور اسلام کے اس وقت تک منکشف شدہ مقاصد سے یہ استنباط کرے کہ روحانی جمہوریت کا قیام اسلام کا آخری نصب العین ھے''۔

باب پانزدهم

پیغمبر اسلام اور حریت انسانی

جب دور جدید کا کوئی مفکر، انسانی خوشحالی کے لوازم کی بابت غور کرتا ہے، تو وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جو چیزیں مطلوب ہیں وہ حریت، اخوت اور مساوات ہیں۔ فطری یا منطقی طور پر وہ حریت کو اولین ضرورت قرار دیتا ہے۔ انسان نہ محض مادی وجود ہے، جو مادہ کی بے رحمانہ جبریت کے قوانین کا تابع ہو، اور نہ وہ نباتی دنیا سے متعلق ہے، جو صرف قوانین بالیدگی اور پژمردگی کی پابند ہوتی ہے اور نہ یہ محض حیوان ہے جس کی زندگی بے خطا جبلتوں سے رہنمائی حاصل کرتی ہے، جو حفظ ذات اور افزائش نسل کے حیاتی ذرائع کے طور پر عمل کرتی ہیں۔ اگرچہ مادہ سے لے کر حیوانات کی زندگی تک جبریت موجود ہے، تاہم ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں بتدریج زیادہ آزادی حاصل ہونے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ درخت ایک غیر نامی مادہ سے اس مفہوم میں زیادہ آزاد ہے کہ وہ خود کو محض مادی ترکیب سے آزاد کر چکا ہے اور اپنے حیاتی محرکات سے ہدایت پاتا ہے۔ اسی طرح ایک حیوان ایک درخت سے زیادہ آزاد ہے کیونکہ وہ حرکت اور ابتدائی شعور سے سرفراز کیا گیا ہے، جو اس کے انتخاب کے دائرہ عمل کو زیادہ وسیع کر دیتا ہے۔ یہ اپنے گرد و پیش کے ساتھ مطابقت کی بہت زیادہ صلاحیت رکھتا ہے اور ایک حد تک اپنے ماحول کو اپنی زندگی کے مقاصد کے

مطابق ڈھال لیتا ھے - جب ھم انسان پر پہنچتے ھیں تو زندگی
کا ایک نیا مظہر ابھرتا ھے - یہ علاوہ وجدان کے عقل سے
سرفراز کیا گیا ھے - اگرچہ یہ وجدان بہت کچھ اعلیٰ حیوان
کے ساتھ مشترک ھے لیکن اعلیٰ حیوانات محض شعور رکھتے
ھیں اور انسان خود آگاہ ھے - علم و آگہی کو وسعت دینا
گویا عقل کی طرف بڑھنا ھے - اس کے پہلو بہ پہلو آزادی کی
گنجائش بھی بڑھتی جاتی ھے - یہ ظاھر ھے کہ حیات کا تدریجی
ارتقاء شعور و عقل کی ترقی کے ساتھ ھی آزادی کو آگے بڑھاتا
ھے - یونانی فلاسفہ نے انسان کو حیوان ناطق کا نام دیا ھے -
ان کے نزدیک اختیار و ارادہ کا مسئلہ وہ اھمیت حاصل نہ کر
سکا تھا جس کو ھم بعد میں عیسائیت اور اسلام میں پاتے ھیں -
یونانیوں کے نزدیک مختلف متبادل صورتوں میں انتخاب کی
آزادی عقل کے ساتھ بے عقلی کی آمیزش کے مترادف ھے - جس
کسی نے یہ معلوم کیا کہ انسان آزاد پیدا ھؤا تھا لیکن ھر
جگہ وہ قید و بند میں رھا ، اس نے در حقیقت انسان کی بابت
اصلی صداقت کا اظہار کیا -

انسانی آزادی کے اسلامی تصور کے مطالعہ کا آغاز قرآن سے
کرنا چاھیئے - مخالفین کی طرف سے مسلمانوں پر قسمت ، نصیب یا
تقدیر پر ایمان لانے کا اتہام لگایا جاتا ھے - یہ محض ایک جزوی
اور اس لئے دین اسلام کا ایک گمراہ کن تصور ھے - اس میں شک
نہیں کہ اس تعلیم کی رو سے خدا کل موجودات کا سر چشمہ اور
علت العلل ھے[۱] - جو کچھ بھی موجود ھے ، اس کا وجود اس کی
مشیت کے سبب سے ھے - وہ خالق ، نگہبان ، اور ھادی ھے -
اگر وہ ارادہ کرتا تو کوئی شخص خطا نہ کرتا - اگر اس کی

مشیت ایسی ہوتی تو وہ انسانوں کو فرشتوں کی طرح نیک بناتا ، جن میں غلط راہ اختیار کرنے کی اہلیت نہ ہوتی ۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کی مشیت نے ایسا نہیں چاہا ۔ اس نے ایسا نہیں چاہا کیونکہ وہ انسانوں کو محض نیکی کرنے والی بے شعور و بے ارادہ مخلوق بنانا نہیں چاہتا تھا ۔ خلاصۂ کائنات بالجبر نیک نہیں بنایا جا سکتا تھا ۔ نیکی کا جوہر آزادی ہے ۔ جہاں اختیار نہیں ہوتا وہاں فرشتوں جیسی نیکی ، یا انسان سے کمتر درجہ والی مخلوقات کی خوبی جیسے کہ حیوان یا اشجار کی موزونیت یا حسن و خوشنمائی ، تو ہو سکتی ہے لیکن وہ شئے نہیں ہوتی جسے ہم اخلاق خوبی سمجھتے ہیں ۔

از روئے اسلام خدا کی ذات مطلق ہے ۔ علی الاطلاق آزادی صرف اس کو حاصل ہے ۔ وہ جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے ۔ ارباب دانش یہ دریافت کرتے ہیں کہ کیا یہ ہمہ توانائی دیگر تمام آزادیوں کو گھیر نہیں لیتی ۔ لیکن اگر ہم خدا اور انسان سے اس کے تعلق کا اسلامی تصور اختیار کریں تو یہ مسئلہ نہایت آسانی سے بطریق دیگر حل ہو سکتا ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان کی روح خود روح ربانی ہے ۔ اگر خدا آزاد ہے تو اس کی اس ذاتی صفت آزادی میں انسان بھی شریک ہے ۔ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ بنایا گیا ہے ، اس لئے وہ بھی تفویض شدہ آزادی رکھتا ہے ۔ حضرت آدم؏ سے آزادی کا پہلا استعمال نافرمانی کی صورت میں ظاہر ہؤا ۔ خواہ نافرمانی کتنی ہی ناپسندیدہ ہو ، یہ ایک ثبوت آزادی کا ہے ۔ اگرچہ کہ یہ آزادی اپنے خالق ہی کے خلاف کیوں نہ ہو ۔ ایک نوجوان کا شباب سے انحراف آمد پیری کی یقینی علامت ہے ۔ انسان کے یہ مقسوم میں ہے کہ وہ صفات

خداوندی کو حاصل کرے۔ یہی اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ اس کو خارجی ارادیت سے گزر کر خود ارادیت کی طرف آنا پڑتا ہے، جو مثل آزادی کے ایک ہی چیز ہے۔ اس کی انسانیت اور اس کی آزادی دونوں مماثل ہیں۔ ایک آدمی صرف اس حد تک انسان ہے کہ وہ آزادی سے عمل کرتا ہے۔ جب وہ آزادی کے ساتھ کوئی غلط عمل کرتا ہے تب بھی وہ نسبتاً اس حالت سے زیادہ انسان ہوتا ہے جب وہ جبر کے تحت صحیح عمل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

انسان کو آزادی عطا کرنا خدا کے فضل و بخشش کا ایک آزاد عمل ہے۔ اس سے خدا کی قدرت کاملہ میں کوئی کمی نہیں ہوتی، اور نہ اس کی محیط الکل رحمت میں کسی طرح کی تخفیف واقع ہوتی ہے۔ مگر اس آزادی میں بھی کوئی افراتفری نہیں ہے۔ یہ بھی خدائی قوانین کی تابع ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے، و ھدیناہ النجدین۔ ''ہم نے انسان کو دو راستے دکھلا دیئے ہیں''۔ یہ چیز انسان پر کھلی ہوئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو منعم علیہ بنائے یا مغضوب علیہ۔ انسان کے لئے خدا نے نظام اخلاق قائم کیا ہے۔ انسان کی آزادانہ انتخاب کردہ نیکی، اور اس کی آزادانہ اختیار کردہ بدی دونوں ایک دقیقہ سنج میزان میں تولے جاتے ہیں۔ چونکہ اخلاقی برائی خدا کی عطا کردہ آزادی کا نتیجہ ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آزادی کے سبب واقع ہونیوالی برائی خدا کی مشیت سے ہوتی ہے۔ سزا اور جزا اچھے اور برے اعمال سے حاصل ہوتی ہے، لیکن اخلاقی قانون کا خدا کی جانب سے اعلان ہؤا ہے۔ عقل پرستانہ منطق یا ناقص مادیت جو تمام انسانی زندگی کو، بشمول روح، بے بصر قوتوں کا ایک لازمی نتیجہ قرار دیتی

ہے ، اس آزادی کی نوعیت کو سمجھ نہیں سکتی ، لیکن انسان کی پوری زندگی اسی وجدان پر مبنی ہے ۔ اب مادیت بھی رفتہ رفتہ اپنی قدیم جبریت سے دست کش ہو رہی ہے ، اور سالمات کی بابت یہ خیال کر رہی ہے کہ وہ حرکت سے سرفراز کئے گئے ہیں ۔ حیاتیات بھی میکانی جبریت سے دور ہوتی جا رہی ہے اور تمام زندگی کو ایک مقصود تلاش سرگرمی سمجھ رہی ہے ۔

علوم طبیعی خواہ کوئی بھی مفروضہ پسند کریں ، آزادی انسانی روح کے لئے بطور ایک اصل کے باقی رہے گی ۔ آیات قرآنی خدا کی قدرت کاملہ اور انسان کی اخلاقی ذمہ داری کو ایک ساتھ بیان کرتی ہیں ، اور ایک سطح بیں منطقی اس گو مگو کی حالت سے حیران ہے ۔ لیکن اسلامی تصور کسی قسم کے باطنی تناقضات سے پاک اور آزاد ہے ۔ انسان کو آزادی عطا کر کے خدا اپنے تخت حکومت سے دست بردار نہیں ہوگیا ، اور نہ اس سے نظام کائنات میں کوئی خلاف ورزی ہوئی ہے ۔

انسان کے الوہیت کی جانب ترقی کرنے کیلئے آزادی ضروری ہے ۔ اسی میں انسان کی عظمت پوشیدہ ہے ۔ قرآن کہتا ہے ۔ کہ کائنات پر حکمرانی کے لئے انسان مقدر ہو چکا ہے ۔ اگر وہ فطری طاقتوں کا غلام بنا رہے تو انکا حکمران کس طرح ہوسکتا ہے جو اس کو اپنے جبری قوانین کے مطابق کھینچتی گھسیٹتی رہتی ہیں ۔ ایک ایسی مخلوق ، جس کے اندر اسکے خالق کی روح کارفرما ہو بجز آزاد ہونیکے اور کچھ کیسے ہو سکتی ہے ۔ لیکن آزادی بذات خود کوئی مقصد نہیں ہے ۔ اسلام اس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ ہم آزاد اس غرض سے بنائے گئے ہیں کہ ہم اپنے ارادہ کو آزادی کے ساتھ خدا کی مشیت کے حوالہ کر دیں ، جس سے انسان غلام نہیں بن جاتا ، بلکہ

خدا کی عالمگیر آزادی میں شریک ہو جاتا ہے ۔ صرف خدا کی روح ہمیں حقیقی آزاد بنا سکتی ہے ۔ آزادی بذات خود کوئی حقیقی قدر نہیں ہو سکتی ، بلکہ وہ زندگی کے تمام حقیقی اقدار کی وصولیابی کی ایک ناگزیر شرط ہے ۔ متلاشی صداقت کی آزادی اسے صداقت کی طرف لے جاتی ہے ۔ اگر یہ آزادانہ جستجو روک دی جائے تو حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی ۔ فنکار کی آزادی تمام فنون کی تخلیق کرتی ہے ۔ احتیاج سے آزادی انسانی روح کا راستہ روحانی اشیاء کی طرف ترقی کرنے کیلئے صاف کرتی ہے ۔ آزادی تمام ترقیوں کی جان ہے ۔ یہ انسان کا خاص استحقاق ہے ۔ وہ تمام چیزیں جو ایک وجود کو قابل قدر بناتی ہیں ان کا انحصار اسی پر ہے ۔ یہ ایسی ہی مقدس ہے جیسی کہ صداقت ۔ آزادی کے مقابلہ میں خود زندگی ایک حقیر عطیہ ہے انگرسال (Ingersoll) نے اس صداقت کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے : "جس طرح روشنی آنکھوں کیلئے ، ہوا شش کے لئے اور عشق و محبت قلب کیلئے ہے ، ایسے ہی آزادی انسان کی روح کیلئے ہے ۔ بغیر آزادی کے دماغ ایک قید خانہ ہے ۔ جہاں محبوس خیالات ، جن کے بازو بے قلابے کے دروازے سے باندھے گئے ہوں ، دب کے مر جاتے ہیں" ۔ یہ بہترین انسانوں کی بہترین تمنا ہے ۔ "آزادانہ زندگی اور آزاد گفتگو ہو اور آزاد پیدا شدہ انسان بااختیار ہوں" ۔

ہمیں زندگی جبر و اختیار کے امتزاج کی طرح پیش کی گئی ہے ۔ ایک حد تک ہم اپنے گرد و پیش اور اپنی موروثی خصوصیات سے مجبور کئے گئے ہیں یا ان قویٰ سے جن کے ساتھ ہماری پیدائش عمل میں آئی ہے ۔ یہاں فطری جبریت بھی ہے ، ہم مختلف التعداد اور متفاوت صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوئے

ہیں - یہاں معاشری جبریت بھی ہے ، جو اچھے برے میلانات ہمارے ذہن نشین کرتی اور ہمیں ان طریقوں پر چلنے کے لئے مجبور کرتی ہے جو مقدس رواج ، اور قدیم رسوم بنا چکے ہیں - خود ہمارے انفرادی وجود کے اندر جبلتیں بھی تحکم پسند بن جاتی ہیں اور خواہشات کے غلام بننے کا موجب ہوتی ہیں - اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ سب چیزیں یہاں موجود ہیں، لیکن پھر بھی انسان بالقوہ آزاد رہتا ہے - اس کی روح کی یہ حقیقت اس سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی - انسانی روح کو ایسا قوی کیا جائے کہ وہ ان تمام مقاومتوں پر غالب آ جائے - موانع پر غالب آ کر انسانی روح تقدیر کی یورشوں کے خلاف استحکام حاصل کرتی ہے -

انسان کو آزادی دلانا تمام سچے مذاہب کا مقصد ہونا چاہیئے - کیونکہ صرف صداقت ہی انسان کو آزاد کر سکتی ہے - تقریباً ایک صدی سے مذہب کے خلاف بغاوت کی جا رہی ہے ، کیونکہ یہ سمجھا جاتا ہے یہ انسان کے آزادانہ نشو و ارتقاء کی راہ میں حائل ہے - یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب انسان کی جہالت کا نتیجہ اور باطل امید و بیم کی پیداوار ہے - بعض خیال کرتے ہیں کہ یہ باطل علم کو پیش کرتا ہے ، اور آزادانہ حکمیاتی تحقیق کی راہ میں حارج ہے - اشتمالی کہتے ہیں کہ یہ عوام کے لئے مثل خواب آور دوا کے تجویز کیا گیا ہے - نٹشے نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اپنے آقاؤں کو بہکانے کے لئے یہ غلاموں کی ایک ایجاد تھی تاکہ ان سے خود اپنی حفاظت کریں - لوگ مذہب سے اس وجہ سے رو گرداں ہوئے کہ یہ انسان کی فطری صلاحیتوں کے فائدہ مند اور جائز استعمال کو روکتا تھا - دوسرا سبب مذہب سے انحراف کا یہ ہؤا کہ

لوگ اب ما بعد زندگی پر اعتقاد رکھنا ترک کر چکے تھے، اور اپنے دین و مذہب کے آخرت کے تصورات سے لا پروا ہو چکے تھے۔ علوم طبیعی کی حیرت انگیز ترقی، عقلیت کا نشو و ارتقاء، اور آزادی کے لئے ہمہ وقت بڑھتی ہوئی خواہش اس بغاوت کی ذمہ دار ہے۔ یہ بغاوت فطرت انسانی کی ضلالت کے سبب اتنی نہیں جتنی کہ ان عقائد کی گمراہی کے سبب ہے، جن پر انسان کو ایمان لانے کے لئے کہا جاتا تھا۔ ہر جگہ حقیقی مذاہب رجعت پسند یا قدامت پرست بن چکے تھے، اور تقلید پسندیاں عام ہو چکی تھیں۔ یہ بات تمام مذاہب پر صادق آتی ہے۔ الفاظ کی پرستش معانی کا گلا گھونٹ رہی ہے، انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور رسم و رواج زندگی سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں۔ اسی لئے ہم نے اسلام کی اصلی روح اور اس کا حقیقی نظریہ حیات بیان کیا اور اس پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ اسلام سے صدہا سال کے دوران میں بہت سی ایسی چیزیں وابستہ کردی گئیں جو نہ صرف اس کے لئے غیر ضروری تھیں، بلکہ قطعی طور پر اس کی مخالف تھیں۔ ہم کو مذہب کے اصل کی طرف رجوع ہونا چاہیئے۔

جب ہم اس زاویۂ نگاہ سے اسلام کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اصلی مقصد انسان کو آزادی دلانا اور اس کو کاملاً استحکام خودی کے لئے آزاد چھوڑنا تھا۔ اس آزادی نے انسان کی بے حد و نہایت توانائیوں کو ہر رخ پر آزاد چھوڑ دیا، اور عربی تہذیب و تمدن کا زبردست مورخ، فلپ حطی اپنے اس دعوی میں بالکل سچا ہے کہ اسلام نے بیس یا تیس سال کے عرصہ میں جتنے مشاہیر پیدا کئے، اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ہے۔ یہ

نہ صرف فاتحین اور ابطال عسکریت تھے بلکہ ان کی بطل وشی مختلف پہلوؤں کی حامل تھی ـــــ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے زندگی کے قدیم اقدار کا از سر نو جائزہ لیا اور شخصی، اجتماعی معاشی اور سیاسی زندگی کو نئے معیارات کے مطابق جدید تشکیل دی۔

ان تمام مشاہیر کی بطل اعظم خود ذات نبوتؐ تھی۔ آپ نبی، ناظم، مقنن، معلم اخلاق، مصلح اور ماہر سیاست و معاشیات تھے۔ یہ تمام امتیازی اوصاف ایک شخصیت میں مجتمع تھے۔ ہمیں اس نقطۂ نگاہ سے آپ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ انسانیت کے سامنے حقیقی انسانی اقدار رکھنے کے علاوہ آپ نے نمایاں طور پر بنی نوع انسان کو تمام قید و بند سے، جو انہیں داخلی اور خارجی دونوں طرح پر جکڑے ہوئے تھے، آزادی دلانے کی تدبیر فرمائی۔ انسانی غلامی کا مشکل سے کوئی ظاہر اور مخفی پہلو ایسا ہوگا جس کی طرف آپ نے توجہ مبذول نہ فرمائی ہو تاکہ آپ مرض کی تشخیص اور اس کا علاج تجویز فرمائیں۔

اب ہم اس بنیادی عقیدہ سے بحث کریں گے جو مذہب کی اساس کہا گیا ہے۔ آپ نے خدا کی یگانگت پر زور دیا، جس کے موجود ہونے کی ایک ظاہر علامت اس کی مخلوقات تھیں، لیکن جو بذات خود غیر مرئی تھا۔ ایبقورس (Epicurus) نے کہا تھا کہ انسان حقیقتاً اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خداؤں کے خوف سے آزاد نہ ہو جائے۔ آنحضرتؐ نے انسانیت کو مختلف خداؤں کے خوف سے رہائی بخشی۔ آپ نے فرمایا کہ حقیقت

میں خداؤں کا وجود نہیں ہے ، یہ انسان کی بیہودہ خواہشات کی تخلیق ہیں۔ غیر مرئی خدا جو حقیقتاً موجود ہے ، وہ کل مخلوقات کے لئے نور اور حیات ہے ۔ وہ بجز اعتدال اور نیکی کے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتا ۔ وہ زندگی کا نصب العین اور ساتھ ہی اس کا سر چشمہ بھی ہے ۔ وہ صفات حسنہ کا حامل ہے جو ایک محدود طریقہ پر انسانی وجود کے اقدار کی تشکیل کرتی ہیں ۔ کوئی چیز اس کے اور انسان کے درمیان حائل نہیں ہے ۔ وہ انسان کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے ۔ کسی طرح کے وسیلوں کی ضرورت نہیں ہے ۔ جب کوئی پکار انسان کے قلب سے نکلتی ہے تو وہ اس کا جواب دیتا ہے ۔ وہ کفارہ کے لئے کسی انسان یا حیوان کی قربانی کا طالب نہیں ہے ۔ ہر نفس بلا واسطہ اس کے آگے جوابدہ ہے اور قانون اخلاق سب اسکے آگے برابر ہیں ۔ انسان کو مظاہر فطرت سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ، کائنات اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہے ۔ انسان کو فطری اور اخلاق قانون کی اخلاف ورزی کے عواقب سے ڈرنا چاہئے ۔ یہ قوانین اپنا ماخذ مشیت الٰہی میں رکھتے ہیں ۔ یہ خوف اور ڈرخشیت الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ بذات خود خدا کوئی ڈرنے کی چیز نہیں ہے ، وہ شفیق و مہربان ہے اور جیسا کہ آنحضرت ؐ کا ارشاد ہے وہ اپنی مخلوقات پر اس سے زیادہ مہربان ہے جتنا کہ ایک ماں اپنے بچے پر ہوتی ہے ۔

اولیاء اور علمائے اسلام ہمیشہ اس بات کو محسوس اور یقین کرتے رہے کہ زندگی کی جانب تمام اصلاحی طریقے اسی اعتقاد سے بطور ضمنی نتائج کے پیدا ہوتے ہیں ۔ جب خیالی خداؤں اور فطری قوتوں کا خوف انسان کے قلب سے دور ہو جاتا ہے تو انسانی زندگی کے بے پایاں امکانات حقیقت کا رنگ اختیار کرنا

شروع کرتے ہیں۔ دانشمندی اور اولوالعزمی اس سے پیدا ہوتی ہے۔ جدید نفسیاتی تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ خوف اکثر دماغی اوہام کی تہہ میں کارفرما ہوتا ہے جس میں انسان کی ایک بڑی تعداد مبتلا ہوتی ہے۔ بیشمار دہشتیں بنی نوع انسان کی سرگرمیوں کو اپاہج بنا دیتی ہیں اور وہ زندگی کا مقابلہ کرنے کے ناقابل ٹھہرتے ہیں۔ کوئی شخص دل سے ایک قادر اور مہربان خدا پر ایمان رکھتا ہے تو اس سے اس کے تمام خوفوں کا علاج ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا آدمی زندگی کے کاروبار میں ادھر ادھر گھومتا ہے اور خوشگوار اور ناخوشگوار حالات کا قابل رشک طریقہ پرخندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا ہے۔ اس کو اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کائنات کی بے بصر یا معاند قوتوں سے برسرپیکار ہے۔ وہ ہر کام میں پوری کوشش کرتا ہے اور باقی چیزوں کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔

یہ نہ صرف خیالی خداؤں اور فطری طاقتوں کا خوف تھا جس نے انسان کو پست اور ذلیل اطاعت پر مجبور کیا بلکہ انسان کی انسان پر ناروا آقائی نے بھی اسکی بزرگی و عظمت کو بہت نقصان پہنچایا۔ حکمرانوں کو الوہیت کا درجہ دیا گیا اور انکی علانیہ خداؤں کی طرح پرستش کی گئی۔ انسان نے اپنے دیگر ابنائے جنس پر آقائی و سرداری حاصل کی گویا کہ وہ مویشی اور محض آلات پیدائش تھے۔ لکھوکھا انسانوں نے اپنی محنت کو فلک بوس اہرام کی تعمیر میں ضائع کیا تاکہ ان مردہ خداؤں کو دفن کریں جن کا تسلط مرنے کے بعد بھی موقوف نہیں ہوا تھا۔ غلاموں کو قتل کر کے ان کے ساتھ دفن کیا جاتا تھا تاکہ وہ حشر کے وقت ان کی خدمت کے لئے تیار رہیں۔ انبیاء کے حالات میں قرآن نے بارہا فرعون و موسیٰ کے قصہ کا

اعادہ کیا ہے تا کہ یہ چیز ثابت کرے کہ ہر اولوالعزم پیغمبر آزادی دلانے والا ہوتا ہے۔ حکمران ظالم وجابر بن جاتے ہیں جب وہ غیر مرئی خدا کی جگہ غصب کرلیتے ہیں اور عدل و انصاف کے ابدی قوانین کے مطابق حکومت کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے اس امر کا شدت سے احساس فرمایا تھا کہ ایک جابر سلطان انسانی حقوق کا زبردست غاصب ہوتا ہے۔ چنانچہ عموسی جمہوریت کی صورت میں آپ نے ایک مثالی مملکت کا نقشہ پیش کیا جس میں عوام کاروبار مملکت کے نظم و نسق کے لئے اپنے بہترین آدمی کا انتخاب کرتے تھے۔ بخاری کی ایک حدیث میں یہ بیان ہے کہ جب منبر سے لوگوں کو مخاطب فرماتے ہوئے آنحضرتؐ ان جابر، بد اخلاق، ظالم اور دیوتا بنے ہوئے حکمرانوں کی مذمت فرما رہے تھے تو شدت جذبات سے اس حد تک لرزہ براندام تھے کہ اندیشہ کیا جاتا تھا کہ کہیں آپ گر نہ پڑیں۔ آپ نے حضرت عیسیٰؑ کی طرح یہ نہیں فرمایا کہ "جو چیزیں قیصر کی ہیں وہ قیصر کو دی جائیں" بلکہ آپ نے قطعیت کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا کہ "اب قیاصرہ نہیں ہونگے"۔ کسی حکمران کو اس وقت تک تسلیم نہ کیا جائے جبتک کہ وہ خدائے یگانہ و برتر کو اپنے اقرار و عمل سے تسلیم نہ کرے اور سلطنت کا نظم و نسق ایک مقدس امانت کے طور پر انجام نہ دے۔ اس کو عوام کی چیزوں سے اپنی اقل ترین ضروریات سے زیادہ لینے کا حق حاصل نہیں ہے اور اس کو ایک سادہ اور ایماندارانہ زندگی کی ایک مثال قائم کرنا چاہئے۔ آنحضرتؐ نے اپنے انتہائی عروج و اقتدار کے زمانہ میں اسی طرح پر اپنی زندگی بسر

فرمائی اور یہی عمل آپ کے فوری بعد خلفائے راشدینؓ کا تھا۔ اسلامی مملکت ایک بہی خواہ مملکت تھی، اور صدر دولت عامہ اپنے باشندوں کے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوتا تھا۔ آنحضرتؐ جنہیں آپ کی قوم نے ''الامین'' کا محترم لقب دیا تھا، ایک ایسا نظام حکومت چاہتے تھے جس میں مملکت کے ساتھ ایک امانت کا سا برتاؤ کیا جائے۔ بعد میں فاروق اعظمؓ نے، جو معاملات حکومت پر کارفرما ہوئے، یہ ارشاد فرمایا کہ صدر مملکت کو اس طرح عمل کرنا چاہئے، کہ گویا وہ یتیموں کی جائداد کا نگران کار مقرر ہؤا ہے۔ اگر وہ اپنے ذاتی ذرائع سے بسر اوقات کر سکتا ہے تو بطور نظم و نسق کی اجرت کے یتیموں کی جائداد سے اس کو کچھ نہ لینا چاہئے۔ اور اگر وہ کچھ ذرائع نہ رکھتا ہو تو اسے صرف اپنی معمولی ضروریات کے لئے کم سے کم لینے کا حق حاصل ہے۔ صدر حکومت کا فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ کوئی شخص اس کی سلطنت میں فاقہ کشی تو نہیں کر رہا ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ دولتمندوں کو مجبور کرے کہ وہ غریبوں کی اعانت و دستگیری کریں۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اس امر کو دیکھے کہ قانون کے نزدیک سب لوگ مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں تمام امتیازات برخاست کر دئے جائیں۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اس چیز کی نگرانی کرے کہ کوئی طاقتور کسی کمزور سے ناجائز نفع نہ اٹھائے۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کا مختصر اور اثرانگیز خطبہ اس اعلان پر مشتمل تھا کہ آپ اس طاقتور کو کمزور بنائیں گے جس کی تائید میں حق نہیں ہے، اور اس کمزور کو طاقتور تصور فرمائیں گے جس کی جانب حق ہے۔ والیان صوبہ اور صدر

حکومت تک بلا واسطہ ہر ایک کو رسائی کا حق ہونا چاہئے اور غریب ترین باشندہ بھی یہ حق رکھے کہ وہ قاضیوں، والیوں اور صدر حکومت کے خلاف بھی عدالت میں اپنی شکایت پیش کر سکے۔ یہ محض مثالی معیارات یا اتمام و کمال کی نصیحتیں نہ تھیں، بلکہ ابتدائے اسلام میں ان پر واقعی عمل بھی کیا گیا۔ یہ اپنی اعلیٰ ترین صورت میں انسان کی سیاسی آزادی تھی، اور مابعد دور میں حقوق انسانیت کا کوئی انقلاب ان تعلیمات و عمل سے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔

دوسرا بڑا کارنامہ جس کو آنحضرتؐ نے کامیابی کے ساتھ تکمیل فرمایا وہ ملائیت سے انسان کو چھٹکارا دلانا تھا۔ متعدد قدیم تہذیبوں میں پیشوایان مذہب اپنی علیحدہ جماعت بنائے ہوئے تھے، اور انسانوں کی روحوں کے نگہبان بنے ہوئے تھے۔ یہ جماعت بطور ایک پیشہ کے مذہب پر عمل پیرا تھی جس کا احترام دیگر تمام پیشوں سے بڑھ کر کیا جاتا تھا۔ انہوں نے عیسائی تمدن میں پادریوں کی درجہ وار ترتیب کے ساتھ اپنی ایک مذہبی انجمن بنائی تھی جس کی انتہا پوپ کی خطا سے مبرا شخصیت پر ہوتی تھی۔ عیسائی بادشاہ اور عیسائی رعایا سب مذہبی حکومت کی ایسی کامل گرفت میں تھے کہ مذہبی حکومت کے غارت گرانہ اقتدار کے ساتھ دنیوی حکومت کا تعلق ان دو قوتوں کے درمیان آویزشوں کی ایک طویل تاریخ ترتیب دیتا ہے۔ منظم مذہب کے ساتھ مملکت کا تعلق یورپی ممالک میں ایک دشوار مسئلہ بن گیا تھا۔ عوام دوگونہ وفاداریوں کا شکار تھے جو بسا اوقات ایک دوسرے کی ضد ہوتی تھیں رومن پروٹسٹنٹ مذہب کیتھولک چرچ کے خلاف بغاوت کی صورت

میں رونما ہؤا ، لیکن پروٹسٹنٹ حکومتوں میں بھی یہ مصیبت
نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتی رہی - یورپ میں مذہب کے
خلاف بغاوت نے بالعموم تمام مذاہب کے خلاف ایک مخالفانہ
انداز پیدا کر دیا - جب کبھی مذہب نے منظم اور رسمی شکل
اختیار کی تو وہ رجعت پسند بن گیا اور لازمی حقوق انسانیت
کو پامال کرنے لگا - اسلام کے پاس ہمیشہ ایسے اشخاص
رہے جو خاص کر مذہبی علوم میں ماہر ہوتے تھے ، لیکن
وہ کبھی اس مفہوم مین پیشوایان مذہب کی جماعت نہ بن
سکے جس مفہوم میں دیگر مذاہب اور تہذیبوں میں یہ جماعت
پروان چڑھی تھی - مغرب کی طرز پر ہندومت کوئی منظم
مذہب کی تخلیق نہ کر سکا لیکن اس نے پروہتوں کی ایک
علحیدہ ذات بنائی - جو کوئی اس ذات میں پیدا ہوتا تھا وہ
پیدائشی پروہت سمجھا جاتا تھا - پیدائش سے لے کر موت
تک تمام اہم موقعوں پر اس ذات کے آدمی کی دست گیری
کی ضرورت ہوتی تھی - پوری زندگی پیر پرستانہ اور حد درجہ
رسم پرستانہ بن گئی تھی - پراسرار اور پچیدہ رسوم پرستیوں کو
گھڑنا اس جماعت کے مفاد کی خاطر تھا جس پر صرف ماہر ہی
عمل کر سکتے تھے - جوں جوں ملائیت نے ترقی کی اسی
رفتار سے لوازم مذہب کا فقدان ہوتا گیا ، حتی کہ اخلاقیت
بھی رسم پرستی اور اس بااختیار جماعت کی ہوس اقتدار کے
تابع ہوگئی -

اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس خطرہ کو محسوس کیا -
مذہب نے بنی نوع انسان کو آزادی دلانے کے بجائے ان کی
روحوں کو غلام بنا لیا تھا - اس خرابی کا علاج اس وقت تک
نہ ہوسکتا تھا جب تک کہ ہر شخص خود اپنا آپ مرشد

نہ بن جائے۔ آغاز کار کے طور پر اسلام نے عبادت و پرستش کے لئے مخصوص مقامات کی ضرورت کو، جن کے باہر خدا کی عبادت نہ کی جا سکتی تھی، ختم کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ مساجد کی تعمیر ہوئی، اور پہلی مسجد ایک چھپر کا سائبان تھا جس کی تعمیر میں بحیثیت ایک مزدور کے آنحضرت نے بنفس نفیس شرکت فرمائی تھی، لیکن یہ حضور ہی کا ارشاد گرامی ہے کہ میرے مذہب کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ خدا کی وسیع زمین کا ہر حصہ ہماری عبادت گاہ ہے۔ ''وجعلت لی الارض مسجد اًوطہورا۔'' ہماری عبادتوں کے لئے کسی خاص عمارت کی ضرورت نہیں۔ عبادت کے لئے کسی جمالیاتی سازوسامان اور منتر و افسوں کی ضرورت نہیں۔ جو شخص نمازوں کی امامت کرتا ہے وہ کوئی مقرر شدہ پیشوا نہیں ہوتا، وہ کوئی رسمی اور پیشہ ورانہ لباس نہیں پہنتا اور پر اسرار تقدس کی کوئی علامت اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔ کوئی مسلمان جو سرسری طور پر اپنے علم اور اخلاق کے سبب چن لیا جائے، نماز پڑھا سکتا ہے۔ نہ پیدائش کے وقت، نہ کسی قسم کے اصطباغ کے لئے، نہ شادی بیاہ کے موقع پر، اور نہ تجہیز و تکفین کے وقت کسی ملا کی ضرورت ہے۔ ہر اہم موقع اور ہر نازک حالت میں مسلمان کو بجز نماز کے اور کسی چیز کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ نماز میں بجز تعظیمانہ اور عبادت گزارانہ عمل کے کوئی ایسی رسم نہیں ہوتی جس کے لئے کسی پیشہ ور مذہبی آدمی کی ضرورت ہو۔ اسلام نے مذہب کو بحیثیت ایک پیشہ کے برخاست کر دیا۔ کوئی شخص مذہبی علوم میں مہارت خصوصی حاصل کر سکتا ہے مگر بطور ایک پیشہ کے مذہبی زندگی کو اختیار کرنے کی اسلام تائید نہیں کرتا۔

انسان کی آزادی کی طرف یہ ایک زبردست قدم تھا ، جو ملائیت کا غلام اور خالص دنیوی اور غیر مذہبی قوتوں سے جکڑا ہؤا تھا ۔ ملائیت ہر جگہ خود کو مختلف خداؤں یا خدا اور انسان کے درمیان ایک وسیلہ کے طور پر قائم کئے ہوئے تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ براہ راست خدا تک انسان کی رسائی نہیں ہو سکتی ۔ اس تک پہنچنے کے لئے کسی رسمی کرشمہ یا ملایانہ زینہ کی ضرورت ہے ۔ خدا کی بابت اسلامی تصور سے بلا توسط رسائی پیدا ہوتی ہے ، جو خدا کو انسان سے خود اس کی ذات سے بھی قریب تر کرا دیتا ہے ۔ مذہبی حکومت کا مسئلہ جو دیگر اقوام کو پریشان کئے ہوئے تھا ، کبھی اس نے اسلام کو پریشان نہیں کیا ۔ اور مذہب بمقابلہ مملکت کا مسئلہ کبھی اسلام کے نظام سیاست میں سر نہ اٹھا سکا ۔ کسی ملایانہ جماعت کو ترقی دینے سے زیادہ روح اسلام سے بعید کوئی چیز نہیں ہو سکتی ۔ مثل دیگر اقوام کے جو دیگر مذاہب کی پیرو ہیں مسلم قوم نے بھی فرقہ واری اختلافات اور غیر ضروری باتوں میں اعتقادی نوعیت کے اختلافات کو جگہ دی ، جن کو انسان کی جہالت بڑھا چڑھا کر موت و زیست کے مسائل بنا دیتی ہے ۔ لیکن اسلامی تاریخ کے انتہائی عقل پرستانہ اور آزاد منشانہ عہدوں میں بھی لوازم اسلام کی کبھی مخالفت نہیں کی گئی ۔ آجکل کے زمانہ میں بھی ترکی کی طرح نام نہاد دنیوی مسلم مملکتوں میں عام باشندگان ملک اصلاً مذہبی ہیں ۔ مسلم قوم نے مذہب کے خلاف عام عقل پرستانہ غیظ و غضب کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا ، جیسا کہ انقلاب فرانس اور اشتمالی روس میں خدا کے خلاف معرکہ آرائیوں میں دیکھا گیا ۔ اسلام کے

صوفیاء اور معقولیین نے اخلاق کی اصلاح کرنے والا اور دلوں کو موہ لینے والا ، ادب پیش کیا ھے - جس میں رسم پرستی اور بے جان تقلید پرستی کی مذمت کی گئی ھے - جو معانی سے زیادہ الفاظ کی پرستش کرتی ھے - لیکن نہ ملک کے روشن خیال طبقہ نے اور نہ عوام الناس نے اسلام کے بنیادی حقائق کے متلعق کبھی شک و شبہ کا اظہار کیا - چونکہ مقابلہ کے لئے کبھی کوئی مذہبی انجمن نہیں تھی اور نہ اسلام کی جمہوری روح کی خلاف ورزی کرنے کے لئے کوئی پیشوایان مذھب کی جماعت تھی ، اس لئے مسلم قوم اپنے تمام طبقات میں ، ہر سطح پر اور ھر دور میں ، بغیر تعصب اور تشدد کے اصلاً مذھبی رھی - صرف گاھے ماھے انفرادی صورتوں میں تعصب و تشدد کے ھیجان کا اظہار ھوا - اس ھم آھنگی کا سبب دو حقیقتیں تھیں - مذھب اسلام اتنا سادہ اور اتنا مطابق عقل ھے کہ اس کے بنیادی اصول پر آسانی سے حملہ نہیں کیا جا سکتا - ایک فلسفی ان کی قدر کرتا اور عقل کے مطابق انکی تشریح کرتا ھے ، اور ایک صوفی بطور مذھبی تجربہ کے ان کی تصدیق کرتا ھے - خدا کی وحدانیت کے علاوہ ، دوسری واحد ضرورت نیکوکارانہ زندگی ھے - نیکی کو انسان کی اصلی فطرت اور تمام نفوس قدسیہ کی مشترک میراث کے طور پر بیان کیا گیا ھے - اسلام بھی یقیناً دوسرے مذاھب کے طریقوں پر گامزن ھوتا، اگر وہ ملائیت کو بطور ایک فرقہ یا پیشہ کے ختم کرنے کی طرف توجہ نہ کرتا - انسانی روح کو آزادی دلانے میں انسانیت آنحضرتؐ کی کس قدر رھین منت ھے ، اس کا اعتراف تہذیب و ثقافت کے ھر دیانتدار مؤرخ کو کرنا پڑیگا -

آنحضرتؐ کا دوسرا زبردست کارنامہ غلامی سے

متعلق آپ کا طرز عمل تھا - آپ کی معاصر دنیا آقاؤں اور غلاموں کی دنیا تھی اور اس وقت آقاؤں سے زیادہ غلام تھے - قوم کا کل معاشی نظام غلامی کی بنیاد پر قائم تھا - ارسطو جیسے زبردست فلاسفہ نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ غلامی ایک فطری ادارہ ہے، کیونکہ وہ انسانوں کی معاشری اور معاشی زندگی کی تعمیر و قیام کا تصور بغیر اس غیر انسانی ادارہ کے کر ہی نہ سکتے تھے - یہ وثوق کے ساتھ کہا گیا ہے کہ تمام قدیم تہذیبیں ایک انسان سے دوسرے انسان کے انتفاع پر مبنی تھیں - تہذیب اعلیٰ مشاغل کے لئے فرصت کی متقاضی ہے اور یہ فراغت صرف غلاموں کی محنت سے حاصل ہوسکتی ہے - آدمی اب انسان نہیں رہے تھے بلکہ محض ذرائع تھے - یہ بطور خود مقصد نہ تھے اور حیوانوں یا دیگر مادی اشیاء کی طرح ان کے ساتھ بھی محض ذرائع پیدائش کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا - آنحضرتؐ نے لوگوں کو اپنے غلاموں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنے کی نصیحت فرمائی - غلام کے ساتھ بدسلوکی اس کو داد خواہی کا حق عطا کرتی تھی - بخاری میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک آقا کو دیکھا جو اپنے غلام کو بے رحمانہ طریقہ پر زد و کوب کر رہا تھا - چنانچہ آقا کو سختی کے ساتھ سر زنش کی گئی اور اس کے اظہار ندامت پر یہ فرمایا گیا کہ وہ اس گناہ کے کفارہ میں اس غلام کو آزاد کردے - اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے غلام کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی مزدوری کی بچت سے آقا کو اپنی قیمت ادا کردے - کئی صغیرہ و کبیرہ گناہوں کے لئے اسلام غلاموں کی آزادی کو جرمانوں یا دیگر سزاؤں کا قائم مقام قرار دیتا ہے - جب قرآن اعلیٰ خوبیوں کا شمار کرتا ہے تو

اس میں غلاموں کی آزادی کو اکثر شامل فہرست کر لیتا ہے۔ اسلام سے قبل یہ دستور رائج تھا کہ گرفتار شدہ دشمن کو یا تو قتل کر دیا جاتا یا اسے بطور غلام کے رکھا جاتا تھا۔ اسلام نے اسیران جنگ کو فدیہ لیکر چھوڑ دینے یا بطور احسان رہا کردینے کو ترجیح دی۔ جو تاوان طلب کیا جاتا تھا وہ ہمیشہ بصورت زر نہیں ہوا کرتا تھا۔چنانچہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی بچوں کو نوشت و خواند کی تعلیم دے سکتا ہے ، وہ آزاد ہو جائے گا۔ رضاکارانہ خیرات کے کاموں میں غلاموں کی آزادی کو ایک زبردست عمل خیر بتلایا گیا ہے۔ زکواۃ یعنی وہ رقم جو حکومت زائد از ضرورت دولت رکھنے والوں سے حاصل کرتی ہے وہ ہر قسم کی انسانی تکالیف کو دور کرنے کے لئے استعمال میں لائی جاتی ہے اور آقاؤں کو قیمت ادا کر کے غلاموں کو آزادی دلانا مصارف زکواۃ میں سے ایک مصرف ہے ۔ اس پر بھی جو آقا غلاموں کو اپنے پاس رکھنا چاہیں انہیں اس شرط پر اجازت دی گئی ہے کہ وہ انہیں وہی کھلائیں اور پہنائیں جو خود کھاتے اور پہنتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ حکم دیا کہ کوئی عرب بطور غلام کے نہیں رکھا جاسکتا۔ اگر زمانۂ مابعد میں مسلمان حکمران ان طریقوں پر ترقی اور قانون سازی کرتے تو کسی اور تہذیب و تمدن کے وہم و گمان میں آنے سے قبل مسلمان علاقوں سے غلامی کا خاتمہ ہوگیا ہوتا۔ یہ افسوسناک امر ہے کہ جب اسلام شہنشاہیت کے نامبارک دور سے گزرا تو اس کے اشتراکیت اور مساوات پسند لائحہ عمل کو ایک زبردست دھکا پہنچا۔ مگر اس دور میں بھی اسلام کا غلاموں کے ساتھ ایسا اچھا سلوک تھا کہ ان میں

سے بعض مسلمان گھرانوں کے قابل احترام افراد تھے اور بعض بڑے بڑے مراتب عظمت پر فائز تھے - غلاموں کے متعلق مسلمانوں ھی کے پاس یہ چیز دیکھی جاتی ھے کہ انہوں نے سلطنتیں قائم کیں ، وزارت کے عہدوں پر پہنچے اور فوجوں کی سپہ سالاری طاقت ور حکمرانوں کے زمانے میں انجام دی - ان میں سے بعض شہرۂ آفاق عالم بنے جن کے آگے عالی خاندان شرفاء کے بچے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے - حضرت بلال رض جو آنحضرت ص کے بے انتہا محبوب صحابی تھے ، ایک آزاد شدہ غلام تھے ، جن کا صنادید عرب سے زیادہ احترام کیا جاتا تھا - غلامی جو مسلم علاقوں میں صدھا سال تک جاری رھی ، آنحضرت ص کے نقطۂ خیال سے خواہ کتنی ھی افسوسناک ھو ، کیونکہ آپ ایک غیر طبقاتی جماعت دیکھنا چاھتے تھے ، لیکن اس کو اس بے رحمانہ ادارہ سے کوئی مماثلت نہیں جس کے مظالم کا دردناک منظر انکل ٹامس کیبن (Uncle Tom's Cabin) میں پیش کیا گیا ھے - عیسائی مغرب کسی پیغمبرانہ حکم سے غلامی کو موقوف نہ کرنے کا الزام اسلام کو نہیں دے سکتا ، جبکہ خود عیسائیت کو اسلام کے بعد بھی ایک ھزار سال سے زائد عرصہ غلامی کے خلاف اپنی مہم کے آغاز کرنے میں لگ گیا ، جس کی پشت پناھی پر امریکہ میں اخلاقی اور معاشی محرکات تھے - آنحضرت ص کو غلامی سے نفرت تھی ، اور آپ نے اس کو موقوف کردینے کی تدابیر تجویز فرمائی تھیں - اس لئے نہیں کہ غلاموں کی محنت صنعتی لحاظ سے غیر کفایت شعارانہ تھی ، بلکہ اس سے بنی نوع انسان کی عظمت کی توھین ھوتی تھی اور یہ ایک انسان کو دوسرے کا مالک و آقا بناتی تھی ، حالانکہ صرف خدا ھی

تمام بنی نوع انسان کا مالک وآقا ہے اور صرف یہی ایک مہربان آقا ہوسکتا ہے۔

عورتوں کی آزادی بھی اس تحریک کا اہم جزو ہے جس کو نبی عربی صلعم نے آغاز فرمایا۔ آپ نے دیکھا کہ ہر جگہ مرد نے عورت کو غلام بنا رکھا ہے، جو مثل اثاث البیت کے سمجھی جاتی ہے اور جس کی حیثیت تقریباً غلاموں کی سی ہے۔ لڑکی کا ہونا باعث ننگ سمجھا جاتا تھا، اس لئے پیدائش کے بعد، ان میں سے بہت سی دفن کر دی جاتی تھیں۔ آنحضرت نے اس ظلم و زیادتی کے خلاف اپنی پرجوش صدا بلند فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ خیر کم خیر کم لا ھلہ ط۔ ''تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنی اہل پر مہربان ہے''۔ ''جو کوئی اپنی دو لڑکیوں کی تربیت و پرداخت میں محبت و ہمدردی کے ساتھ ایثار و قربانی کرتا ہے، وہ جنت میں داخل ہوگا''۔ اور ''بہشت تمہاری ماؤں کے قدموں میں ہے''۔ مردوں کے ساتھ مساوی رتبہ حاصل کرنے کے لئے آنحضرتؐ نے عورتوں کی ہر ممکن طریقہ پر مدد فرمائی۔ قرآن کہتا ہے:
و لھن مثل الذی علیھن بالمعروف۔ (بقرہ۔ ۲۲۸)
''عورتوں کے تم پر ایسے ہی حقوق ہیں، جیسے کہ تمہارے حقوق ان پر ہیں''۔ قرآن دونوں جنسوں کو ہر لحاظ سے مشترک اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ بہت سے اخلاقی احکام میں دونوں جنسوں کا اظہار ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ عورتیں مردوں کے ساتھ قانون میں برابر کی حصہ دار ہیں۔ انہیں ایسے شہری حقوق عطا کئے گئے ہیں جنہیں آجکل بھی بعض متمدن ممالک عطا کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ نکاح، مرد اور عورت میں ایک عقد معاشرتی ہے، جس میں کوئی بھی جائز شرطیں

داخل کی جاسکتی ھیں ۔ دونوں کو حق وراثت اور اپنے نام پر
جائداد رکھنے کا حق عطا کیا گیا ۔ انگلستان کی عورتیں
ابھی حال حال تک اس ابتدائی حق کے لئے لڑ رھی تھیں ۔

بعض ناگزیر حالات میں تعدد ازدواج کی اجازت اسلام
کے خلاف انتہا درجہ نازیبا الزاموں میں سے ایک ھے ۔ لیکن
تمام قدیم تہذیبوں اور مذاھب میں سے ، جنھوں
نے بے قید کثرت ازدواج کی اجازت دے رکھی تھی ، صرف
اسلام ھی کو کیوں چنا جائے۔ عہد قدیم کے بہت سے انبیاء بشمول
حضرت سلیمان دانشمند ، بے قید کثرت ازدواج پر عامل تھے ،
جو پدر سری نظامات کا جزو لاینفک تھی ۔ اسلام کے نکتہ چین
اس بات کو فراموش کرگئے کہ یہی ایک مذھب تھا جس
نے اس کی ایسے شرائط کے ساتھ حد بندی کردی جن کو
پورا کرنا کسی ایسے آدمی کے لئے جو اس ذمہ‌داری
کے بوجھ کو بے سمجھے بوجھے اپنے سر لیتا ھے ، کس قدر
دشوار امر ھے ۔ قرآن صرف ان لوگوں کو اس کی اجازت دیتا
ھے جو ایک سے زائد بیویوں میں مساوی عدل قائم رکھ سکتے
ھیں ۔ اور ساتھ ھی اس امر سے آگاہ کرتا ھے کہ یہ تقریباً
ناممکن ھے کہ تم ھرلحاظ سے ان کے درمیان انصاف رکھ سکو ۔
نکاح محض عشق و محبت کا کوئی تخیئلی معاملہ نہیں ھے ، یہ
فی الاصل حیاتی معاملہ ھے جو ایک اھم معاشی پہلو لئے ھوئے
ھے ۔ ایک مختصر سی ملت جو مسلسل حرب و ضرب کے سبب
مردوں کی کافی تعداد سے محروم ھو جائے اس میں زائد تعداد
ایسی عورتوں کی ھوگی جن کی حفاظت و دستگیری ضروری
ھوگی ۔ جب تک کہ ان عورتوں کے جائز طریقہ پر نکاح ، مالی
امداد ، اور اجتماعی احترام کا انتظام نہ کیا جائے، یہ قوم

کے لئے رسوائی اور خطرہ کا موجب ہونگی۔ دو عالمی جنگوں
کے بعد جو کچھ مغرب میں رونما ہوا وہ ان تمام جھوٹے
معلمین اخلاق کے لئے چشم کشا ثابت ہوگا جو قحبہ گری
کو روا رکھتے اور ناجائز مخفی جنسی تعلقات کو اس محدود
اور جائز کثیر الازدواجی پر ترجیح دیتے ہیں جو بعض
حالات میں ایک اجتماعی لزوم کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔
اس میں شک نہیں کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت
کا اکثر غلط استعمال کیا گیا۔ اگر کسی قانون کی خلاف
ورزی کی جائے اور بد چلنی پر چشم پوشی کی جائے تو اس
سے قانون پر کیا الزام عائد ہوتا ہے۔ اگر ہم صحیح تاریخی تناظر
سے اس پر نگاہ ڈالیں تومعلوم ہوگا کہ یہ عورتوں کے لئے بجائے
باعث ذلت ہونے کے ان کی حفاظت کی ایک تدبیر تھی، جو انہیں
افلاس و رسوائی میں پڑنے سے بچاتی تھی۔ اس تدبیر نے مسلم
معاشرہ کو محفوظ اور صحیح المزاج رکھا اور عصمت فروشی
بطور ایک پیشہ کے مسلم قوم میں نشو نما نہ پاسکی جب تک کہ
دیگر تہذیبوں سے ان کا اختلاط نہ ہوا۔ لاکھوں بے کس
عورتیں مغرب کے معاشری نظام میں گھن کی حیثیت رکھتی ہیں
جن سے جسمانی اور اخلاقی امراض پھیل رہے ہیں۔ عیسائیوں کی
تبلیغی اور سیاسی مہم کے باعث اسلام کے خلاف یہ باطل خیال دنیا
میں اشاعت پذیر ہوگیا کہ اسلام نے عورتوں کی زندگی کو
بالکل جکڑ رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ گھروں میں
بند اپنی زندگیاں بسر کرتی ہیں اور یہ تاثر پیدا کرنے کے لئے
کہ یہ عورتوں کے لئے اسلام کی پیش کردہ زندگی ہے،
شیخ اور اس کے حرم کی بابت من گھڑت افسانے پھیلائے
جاتے ہیں۔ یہ رواج حقیقتاً زوال پذیر شاہی خانوادوں اور

طبقۂ امرا کا ناپاک ثمرہ تھا اور چونکہ متوسط طبقہ ان طفیلی جماعتوں کی تقلید کا میلان رکھتا ھے اس لئے اس طبقہ کے بعض افراد نے بھی ، بطور ایک شرافت کی علامت کے ، اس پر عمل کیا - اس قسم کے تمام رسم و رواج غیر اسلامی ھیں ، اور ان مواقع اور حقوق میں سے جو اسلام نے عورتوں کو عطا کئے ھیں ، بہت کچھ چھین لیتے ھیں - اگر اسلام پر صحیح طریقہ سے عمل کیا جائے تو مسلمان عورت ھر اس لحاظ سے جس میں فطرت اس کو مساوات کی اجازت دیتی ھے ، مرد کے برابر قرار پاتی ھے - جب کبھی غیر اسلامی رسومات راہ سے ھٹا دی گئیں تو مسلمان عورتیں شاندار حکمران ، مشیرکار اور فقیہہ و عالم ھوتی رھیں - انہوں نے فوجوں کی قیادت کی اور جب کبھی ضرورت پڑی تو وہ مثل سپاھیوں کے لڑیں ، جیسا کہ ابتدائے اسلام میں انہوں نے کیا تھا - اور حال میں مصطفٰی کمال کی قیادت میں ترکوں کی جنگ آزادی میں بھی معرکہ آرائی کی - موجودہ صدی میں دنیائے اسلام کی بیداری میں عورتیں نہایت اھم خدمت انجام دے رھی ھیں - جیسا کہ ھم نے اس سے قبل بیان کیا ھے عام طور پر مسلمان اسلام پر راسخ عقیدہ رکھتے ھیں - اگر اصل اسلام میں کوئی چیز ایسی ھوتی جو ان کی صحت بخش سرگرمیوں کو روکتی تو یہ حیرت انگیز عقیدت پیدا نہ ھوتی - جہاں کہیں عورتیں اپنے کھوئے ھوئے حقوق کو دوبارہ حاصل کرنے کی جد و جہد کرتی ھیں ، وہ ھر موقع پر اصل اسلام کی طرف توجہ دلاتی ھیں - اور یہ اس امر کا کھلا ثبوت ھے کہ انسان کو آزادی دلانے میں ، اسلام نے عورتوں کی طرف سے غفلت نہیں برتی - عورتوں کے حقوق کی بابت ، مختلف تمدنوں کے قوانین کے تقابلی

مطالعہ سے ان دعووں کی صداقت ثابت ہوجائیگی۔ یہ ایک وسیع موضوع ہے جس پر کما حقہ بحث کرنا اس مختصر مضمون میں دشوار ہے۔

اب ہم ایک نہایت اہم عنوان ، انسان کی معاشی آزادی ، کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔جدید اشتراکی بجا طور پر زندگی کے معاشی پہلو پر زور دیتے اور اسی پر اپنے نظریات کی بنیاد رکھتے ہیں ـ پیروان مارکس معاشئین کا کہنا ہے کہ تہذیب و تمدن کے دیگر تمام پہلو ، بشمول اخلاقیات ، فنون اور مذہب ، محض ضمنی پیداوار ہیں جنہیں وہ مجموعی طور پر طریق پیدائش سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلام سے قبل مذہب معاشی زندگی سے ہٹ کر انسان کی روحانی اور اخلاقی کیفیات پر زور دیتا تھا۔ دولت مندوں کو تلقین کی جاتی تھی کہ وہ غریبوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں۔ روحانیت افلاس کے ہمرتبہ قرار دی گئی تھی یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ غریب آسانی سے بہشت میں داخل ہونگے اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے نکل جانا آسان ہے لیکن ایک دولتمند کا بہشت میں داخل ہونا دشوار ہے۔ مذہبی آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ نعائم دنیوی سے کنارہ کش رہے گا اور آخرت میں اسے ان چیزوں کا بدلہ ملیگا جن سے وہ اس دنیوی زندگی میں مجتنب رہا ہے۔ غریبوں سے یہ کہا جاتا تھا کہ وہ تھوڑے عرصہ کے لئے صبر سے کام لیں ، کیونکہ یہ زندگی بہرحال چند روزہ ہے۔ قدیم عیسائی یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ دنیا کا اختتام نہایت قریب ہے ، اور جب تمام چیزیں بہت جلدفنا ہونیوالی ہیں ، تو پھر کیوں ان مادی فائدوں کے لئے تردد کیا جائے۔ حضرت عیسیٰؑ کا ارشاد تھا کہ انسان محض روٹی سے زندہ نہیں رهتا ، اس کے لئے روحانی

غذا بھی نہایت ضروری ہے۔ چونکہ سابقین عیسائیت نہایت مفلوک الحال تھے اس لئے وہ خدا سے اپنے روزانہ رزق کے لئے روز دعائیں مانگتے تھے۔ بدھ مت میں بھی روحانی آدمی روزی کمانے والا نہ ہوتا تھا بلکہ ایک بھکشو یا مذہبی فقیر ہوتا تھا، جو محنت سے روزی کمانے والوں کی خیرات پر زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ مذاہب دنیا کو مایا اور فریب سمجھ کر نفرت کرتے تھے اور غریب و امیر کو خالص اخلاقی طرز کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ تمام مذاہب انفرادی خیرات کی خوبیوں کی تلقین کرتے تھے، مگر انہیں معاشی نظام کو کسی ایسے طریقہ سے نئے سانچے میں ڈھالنے کا کوئی تصور نہ تھا جس میں کہ انتفاع اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جائے۔ پیغمبر اسلام ص کی ذات اقدس ایک عملی مثالیت پسند تھی اور اس امر کا آپ کو بخوبی علم تھا کہ ما بعد الطبیعی یا خیال پرستانہ تصوریت ایک عام انسان کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتی۔ اسلام کے پورے خاکہ میں جسم روح کے ساتھ نا قابل تحلیل طریقہ پر وابستہ ہے۔ روح جسم کی آفریدہ نہیں ہے، بلکہ موجودات کی اس سطح پر روحانی اور جسمانی پہلو کچھ اس طرح باہم مربوط ہیں کہ جو چیز ایک پر اثر انداز ہوتی ہے وہ دوسرے کو بالواسطہ یا بلا واسطہ متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ خدا کی پیدا کردہ دنیا حقیقی دنیا ہے کائنات میں ہر چیز خدا کا عطیہ ہے، جو اس کی مخلوقات کی کام جوئیوں کے لئے ہے۔ اس میں شک نہیں ایسے حقائق موجود ہیں جو مادی دنیا سے بر تر و اعلیٰ ہیں، لیکن مادی دنیا بھی اپنے طریقہ پر روحانی ہے۔ جسم کے موزوں، قوی اور پاک بننے کے لئے ایسے طریقہ پر اسکی نگہداشت کی جائے کہ

وہ روح کے ساتھ ہم آہنگی میں معاون ہو سکے۔ آنحضرتؐ نے ہر ایماندارانہ کام عبادت میں تبدیل فرمادیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو انسان اپنے خاندان کے لئے روزی تلاش کرتا ہے اس کا یہ عمل بھی خدا کی عبادت ہوتا ہے۔ ''الکاسب حبیب اللہ'' ۔ محنت کرنے والا خدا کا دوست ہوتا ہے۔ آپ پہلے زبردست مذہبی معلم ہیں جنہوں نے صریح الفاظ میں یہ اعلان فرمایا کہ عام آدمی کے لئے افلاس ایک بڑا عیب ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ غربت انسان کو کفر کے کنارے لا کھڑا کرتی ہے۔ قرآن میں خدا نے ان نعمتوں میں سے جو اس نے آنحضرتؐ پر نازل فرمائی تھیں، بطور ایک نعمت کے اس کا اظہار کیا ہے کہ آپ ابتداءً غریب تھے لیکن اللہ نے آپ کو محتاجی سے آزادی دلائی۔ آنحضرتؐ کی یہ مشہور حدیث ہے کہ افلاس سے انسان کا دونوں جہان میں منہ کالا ہوتا ہے، اس لئے ہر کوشش اس سے بچنے کے لئے کی جائے۔ لیکن یہ آپؐ کے معاشی نظریہ کا صرف ایک پہلو تھا اور اگر زیادہ نہیں تو اس کے قریب قریب آپ دولت کی کثرت سے بھی اندیشہ مند تھے، جو دولت مندوں کو عیش پسند، بے حس اور ظالم بنا دیتی ہے۔ ''میں تمہاری غربت سے اتنا متردد نہیں ہوں جتنا کہ تمہارے تمول سے'' ۔ انسان ناجائز طریقہ پر جمع شدہ دولت کا اتنا ہی غلام ہوتا ہے جتنا کہ غربت سے ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ معاشی فراغت و حفاظت کا درمیانی راستہ کامل معاشری عدل اور حقیقی تہذیب کی راہ ہے۔

آنحضرتؐ نے معاشی حیثیت سے انسان کو آزاد کرنے کا تہیہ فرما لیا تھا اور یہاں ہم ان خاص تدابیر پر نظر ڈالیں گے جن کو

آپ صلعم نے اختیار فرمایا :

(۱) موقعوں اور صلاحیتوں کے تفاوت کے سبب بعض لوگ دوسروں سے زیادہ کماتے ہیں اور بعضوں میں فطرتاً دوسروں سے زیادہ خدا داد قابلیت ہوتی ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ انسان یکساں صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ لہذا آزادانہ اپج اور اٹھان کو دبایا نہ جائے ، صرف ناروا حصول اور جمع دولت کے طریقوں کو آئینی پابندیوں اور اخلاقی احکام سے روکا جائے۔

(۲) سود کو تمام شکلوں میں اور سٹہ بازی کو تجارت میں ' آئینی طریق سے روکا جائے۔ دولت بلا محنت کے پیدا نہ کی جائے۔ سود کو تجارت کے ساتھ محفوظ نہ کیا جائے۔

(۳) تمام کاروبار اور تجارت میں ، یہاں تک کہ سرمایہ اور محنت کے درمیان بھی شراکت جائز ہو اور منافع اور نقصان دونوں میں اشتراک ہو۔

(۴) نفع کی غرض سے ضروری اشیائے تجارت کا احتکار ممنوع ہے۔

(۵) ایک معین قلیل ترین حد سے آگے ، جس کا تعین قانون کے ذریعہ ہونا چاہئے باقی دولت زائد متصور ہوگی اور اس پر محصول ان افراد پر صرف کرنے کے لئے عائد کیا جائے جو کم خوشحال ہیں۔

(۶) انفرادی خیرات ایک عمدہ چیز ہے ' لیکن غریبوں کے لازمی احتیاجات کی نگہداشت حکومت کے ذریعہ کی جائے جو ایک مملکت فلاح و خیر کی طرح کام کرے۔

(۷) منصفانہ قانون وراثت کا اعلان کیا جائے اور مرد اور عورت ایک مقررہ نظام کے مطابق ترکہ پائیں۔

(۸) اگرچہ ایک آدمی اپنی زندگی میں اپنی جائداد کا خود مختار مالک ہوتا ہے، لیکن یہ کل املاک کو بعض کے نفع اور دوسروں کے نقصان کے لئے وصیت نہیں کر سکتا بلکہ صرف ایک تہائی جائداد تک وصیت کر سکتا ہے۔ جائز ورثاء محروم نہ کئے جائیں۔

(۹) قانون کے ذریعہ تمام نمود و نمائش اور عیش پرستانہ زندگی ممنوع قرار دی جائے۔ سونے کا استعمال بجز سکہ کے نہ کیا جائے، یا قلیل مقدار میں عورتیں زیورات میں استعمال کر سکتی ہیں۔ مردوں کے لئے ریشم و حریر کا استعمال بھی ممنوع ہے۔

(۱۰) بے محنت کمائی پر زندگی بسر کرنا دولتمندوں اور غریبوں دونوں کے لئے مضر ہے۔ بھیک مانگنا انسان کے لئے ذلت ہے اور بجائے خیرات دینے کے یہ زیادہ بہتر ہے کہ سائل کو روزی کمانے میں مدد دی جائے۔ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ "قیامت کے دن بھکاریوں کے چہرہ پر گوشت نہ ہوگا، بھیک انسان کو بے شرم بنا دیتی ہے"۔

(۱۱) قانون وراثت کی رو سے چونکہ تمام جائداد مالک کے مرنے پر تقسیم ہو جاتی ہے، اس لئے قانون کلانیت نظام جاگیری کو برقرار رکھنے کے لئے جائز نہیں ہو سکتا۔

ہر شخص معاشی تشکیل جدید کے اس اسلامی لائحہ عمل کے خاص مدات دیکھ کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ دو انتہاؤں کے درمیان ایک معتدل راستہ ہے۔ "جو کوئی تمہارا قمیص مانگے اسے اپنا کوٹ حوالہ کر دو" یہ ایک مثالی محبت وخیر خواہی یا برائی کی عدم مقاومت کا اصول تو ہو سکتا ہے، لیکن عام انسانیت کے لئے یہ کوئی ممکن العمل نصیحت نہیں ہے، اور نہ کوئی مملکت اس

اساس پر منظم ہوسکتی ہے - پیغمبر اسلامؐ کی نظر آسمان پر رہتی تھی لیکن ان کے قدم ہمیشہ زمین پر رہتے تھے - اسلام دنیا دار مذہب نہ تھا، لیکن اس نے کبھی اس حقیقت سے غفلت نہیں برتی کہ انسان مادی جسم بھی رکھتا ہے اور مٹی سے بنایا گیا ہے، اور وہ آسمان پر اس وقت تک نہیں چڑھ سکتا جب تک کہ مضبوطی سے زمین پر قدم نہ جما لے - حضرت عیسیٰؑ یا گوتم بدھ کے برعکس آنحضرتؐ ایک مملکت فلاح وخیر کی بنیاد رکھ رہے تھے - مارکس سے اس امر میں اتفاق کئے بغیر کہ انسان کی معاشی زندگی اس کے کل وجود کے ہم زمان و ہم مکان ہے، اور دیگر تمام اقدار اسی سے اخذ کئے گئے ہیں، آنحضرتؐ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ معاشی زندگی روحانی یا غیر معاشی اقدار کی ترقی و تنزل پر نہایت گہرا اثر ڈالتی ہے - آپؐ یہ محسوس فرما چکے تھے کہ بغیر معاشی تحفظ کے انسان کی زندگی کی عظمت کو محفوظ نہیں رکھا جا سکتا، اور اجتماعی انصاف بڑی حد تک معاشی عدل پر مبنی ہے - آپ نے ایک ایسے نظام کی داغ بیل ڈالی جو معاشرہ کو دار و نادار (Haves and Have-nots) طبقات میں منقسم ہونے سے روکتا تھا - چنانچہ وہ تمام تدابیر اختیار کی گئیں جو دولت کو چند افراد کے ہاتھوں میں مجتمع ہونے سے روکتی تھیں - آنحضرتؐ اپنے زمانہ کے معاشی نظام کی بابت انتظام فرما رہے تھے، مگر جن عام اصول پر یہ تدابیر مبنی تھیں وہ آئندہ زمانہ کے اطلاقات کی بھی اساس ہیں - اس نظام کی روح اس طرح عیاں ہے کہ کوئی شخص سرسری طور پر بھی اسے معلوم کر سکتا ہے - آنحضرتؐ کی کئی احادیث ہیں، جو معاشی عدل کے بنیادی نظریہ پر مزید روشنی ڈالتی ہیں - صرف معینہ زکواۃ

ھی زائد آمدنی اور سرمایہ پر ایک محصول نہیں ھے بلکہ آپ کا منشا یہ ھے کہ اگر ضرورت ھو تو بہت کچھ اور بھی دولت مندوں سے لیا جا سکتا ھے اور مصیبت زدوں کی امداد میں صرف کیا جا سکتا ھے۔ آپ‌ؐ کے جانشینوں میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا بھی یہی خیال تھا ۔ یہاں پھر وھی قانون کا منشاء اس کے الفاظ سے زیادہ اھمیت رکھتا ھے۔ مسلمان مملکتیں اگر اسلامی نصب العین کو اپنا مقصد بنائیں تو موجودہ زمانہ کے انتہا درجہ پیچیدہ معاشی نظامات سے بحث کرتے وقت ایک بہتر معاشی نظام کے قیام کے ذریعہ بڑی خدمت انجام دے سکتی ھیں۔

آنحضرتؐ اس کا واضح نقشہ کھینچ چکے تھے کہ یہ انسانی روح کی آزادی تھوڑے ھی عرصہ میں کیا رنگ لائیگی۔ اپنی مفلس قوم سے آپ نے ارشاد فرمایا کہ ”وہ زمانہ بہت جلد آنے والا ھے جبکہ کوئی شخص خیرات دینے کے لئے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا جائیگا اور وہ کوئی خیرات لینے والا نہ پائیگا“۔ ملکی امن و امان کی بابت آپؐ نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ”اسلامی مملکت میں ایک عورت تنہا حیرہ سے مکہ سونا اچھالتی ھوئی سفر کریگی اور اس سے کوئی تعرض نہیں کریگا“۔ یہ دونو پیشین گوئیاں اسلام کے ابتدائی دہ سالہ دور میں پوری ھوئیں، جبکہ اسلام کی روح ھر جگہ کار فرما تھی۔

آنحضرتؐ کا دوسرا زبردست کارنامہ حیات کی بابت انسان کے فکری اندازوں میں عقلیت کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔ بعض لوگ خیال کرتے ھیں کہ مذھب کی بناء وحی و الہام ھے، حالانکہ سائنس استدلال پر مبنی ھے جس

کو مشاہدہ ، استقراء اور استخراج کی تائید حاصل ہے۔ جس طرح اسلام نے بظاہر متناقص نقطہ ہائے خیال کو ہر دائرۂ زندگی میں موافق کیا ہے ، اسی طرح اس نے عقل کو وحی کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ قرآن کی رو سے تمام کائنات ایک زبردست اعجاز ہے اور کائنات کا معجزہ الوہی نشانیوں سے مملو ہے۔ آسمانی کتابوں بھی میں خدا نے خود اپنی اجلوہ گری فرمائی ہے ، لیکن تمام کتابوں کی کتاب خود زندگی اور کائنات ہے۔ کتاب مقدس بحیثیت کتاب کے صحیفۂ فطرت کا ایک اشاریہ ہے ، جو ام الکتب ہے اور ابدی قوانین پرمشتمل ہے۔ یہی لوح محفوظ ہے۔ کتاب مقدس ایک ہدایت نامہ ہے اور کوئی شخص اس عظیم کتاب حیات کے مشمولات و مضامین کو نہیں سمجھ سکتا جو محض عنوانات کو پڑھتا اور دہراتا رہتا ہے۔ قرآن جب کبھی کسی عظیم صداقت کی تلقین کرتا ہے ، یا کسی قانون کا اعلان کرتا ہے ، تو اس کا سبب عقلی بھی ہمیشہ بیان کرتا ہے۔ خدا کی ہستی یا اس کے فضل و بخشش کے دلائل کائنات یا انسان کی زندگی سے اخذ کئے گئے ہیں۔ قرآن نسل انسانی کو کائنات کے نظام اور حسن ، ہر دو کے مطالعہ کی نصیحت کرتا ہے جو خدا پر ایمان لانے اور مخلوق سے خالق کی طرف پہنچانے کے لئے ایک ذریعہ ہے کائنات کو انسان کے مقاصد کا محکوم بنایا گیا ہے تاکہ وہ علم کے ذریعہ ہر قسم کا نفع حاصل کرے ، اور زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو۔ اسلام سے قبل ہر جگہ مذہب انسان کی آزادانہ تحقیقات میں حائل تھا۔ وحی اور عقل ہمیشہ باہم موافق نہ تھے۔ اور وحی کے متعلق یہ یقین کیا جاتا تھا کہ اس کا تعلق اسرار و اذعانات سے ہے ، جو یا تو خلاف عقل ہیں یا ماورائے عقل۔ یہ قرآنی وحی و تنزیل کی

امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ حیات و کائنات کا مطالعہ کرنے اور ان پر غور کرنے کی نصیحت کرتی ہے۔ "تم عقل کو کیوں کام میں نہیں لاتے"۔ "تم کیوں غور نہیں کرتے"۔ یہ آیات قرآن بار بار دھراتا ہے۔ اصحاب علم کی بے انتہا توصیف کی گئی ہے، اور حکمت کو خیر کثیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ کی بہت سی ایسی احادیث ہیں جن میں اہل علم کو عبادت گزاروں بلکہ شہداء سے بھی بڑھ کر بتلایا گیا ہے۔ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہوگیا اور اسیران جنگ اپنی آزادی بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا کر حاصل کر سکتے تھے۔ یہی وہ علم کی محبت تھی جس نے مسلمانوں کو اپنا بھوکا اور پیاسا بنائے رکھا تھا، اور ان کی طلب غیر تسکین پذیر معلوم ہوتی تھی۔ اسلام سے قبل عربوں کا علم نہایت قلیل تھا اور یہ کسی کتاب کے حامل نہ تھے، اس لئے قرآن میں ان کو 'امیین' یعنی ان پڑھ قوم کہا گیا ہے۔ خود آنحضرتؐ اُمی تھے، اگرچہ کہ آپؐ زندگی کے ابدی حقائق کے علم سے سرفراز کئے گئے تھے۔ آپؐ نے اپنے متبعین سے ارشاد فرمایا کہ اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔ "علم کی جستجو کرو اگرچہ کہ اس کی تلاش میں تمہیں چین تک سیاحت کرنی پڑے"۔ الحکمة ضالة المؤمن فحیث وجدھا فھو احق بھا۔ (ترمذی) "علم و حکمت کی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے، وہ اسکو جہاں پائے، اسکے لینے کا وہی زیادہ مستحق ہے"۔

یونان، روم اور ہندوستان کی قدیم تہذیبیں علم کے خزینوں کی مالک تھیں، جن کا استعمال وہ انسانیت کو ترقی

دینے میں کم کر رہی تھیں۔ مذہبی قدامت پرستی نے آگے
بڑھنے سے روک دیا تھا۔ عیسائیت بحیرۂ روم کی عظیم تہذیبوں سے
محروم ہوچکی تھی۔ مسلمان قوموں نے ان تمام دفینوں کو باھر
نکالا اور ان تمام تہذیبوں کے ابدی عناصر کے وارث ہوئے،
جو ان سے قبل گزر چکی تھیں۔ اولاً وہ طالب علم بنے۔ اور وہ
بڑے حریص طالب علم ثابت ہوئے۔ ان تمام علوم کی تحصیل کے
بعد جو دنیا میں موجود تھے، انھوں نے ان میں اپنی امتیازی
اختراعی قابلیت کے حیات افروز عناصر کو شامل کیا اور تقریباً
آٹھ صدی تک دنیا کے معلم و استاد بنے رہے۔ تاریخ انسانیت میں
کبھی مذھبی تہذیبیں آزادانہ تحقیقات میں ممتاز نہیں رہیں۔ ہرجگہ
پیشوایان مذہبی کی جماعت علم اور نجات کی اجارہ دار بن کر
ہر اس علم کی ترقی روکتی تھی جس سے ان کے مفادات کو
خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ منظم تقلید پرستیاں ہمیشہ رجعت پسند
رہی ہیں۔ لیکن اس لحاظ سے اسلام ایک استثنائی صورت رکھتا ہے۔
نہایت مختصر عرصہ میں دنیائے اسلام نے علم و تہذیب کے ہر دائرہ
میں جو فضیلت حاصل کرلی تھی اس پر مؤرخین حیران ہیں۔
بعض یورپی نکتہ چین کہتے ہیں کہ اسلام ایک شخص کا
مذہب اور ایک شخص کی تحریک تھی اور تمام اسلامی تہذیب،
اسلامی قوانین اور اسلامی نظریۂ حیات کا ماخذ بالآخر ذات
نبوتؐ ہی قرار پاتی ہے۔ مسلمانوں کا طریق زندگی ایک انسان
کے نصب العینوں کی صورت پذیری تھی۔ اگر یہ بڑی حد تک
صحت پر مبنی ہے تو دنیائے اسلام کی حیرت انگیز ذہنی
ترقی کی ابتدا بھی آنحضرتؐ کے حکیمانہ تصور کائنات سے
ہوتی ہے جس کو سنجیدہ غور و فکر سے سمجھا جاسکتا
ہے۔ آنحضرتؐ کو اس کا یقین کامل تھا کہ کائنات

میں عقل کی کارفرمائی ہے اور یہ من مانے ارادوں کی بازی گاہ نہیں ہے ۔ خدا حق ہے اور عقل حق تک رسائی پا سکتی ہے ۔ عقل اور کائنات بنی نوع انسان کو دیگر مدارج وجود کی طرف لیجا سکتے ہیں، لیکن وہ کسی حقیقی وحی کی تردید نہیں کر سکتے ۔ آنحضرتؐ نے بحیثیت عالم گیر آزادی عطا کرنے والے کے، انسانی عقل کو بھی آزاد فرمایا، اس کی تطہیر کی اور اسے کتاب اللہ کی وحی و تنزیل اور صحیفۂ فطرت کے مماثل قرار دیا ۔ یہ حضور اقدسؐ ہی کا فیضان تھا کہ مسلمانوں کا شعور و احساس کبھی عقل، زندگی، کائنات اور وحی کے مابین کسی آویزش سے پریشان نہ ہو سکا، جو عظیم عالمگیر صداقت کے مختلف پہلو ہیں ۔ قرآن کہتا ہے کہ ”و یضع عنهم اصرهم و الاغلال التی کانت علیهم پیغمبر تمہارے طوق و سلاسل کو نکال پھینکنے کے لئے مامور ہوا ہے“۔ اور آگے چل کر رومی نے یہ تشریح کی کہ ”ایک پیغمبر کا اصلی کام انسان کو آزادی دلانا ہوتا ہے“ ۔ اگر مندرجۂ بالا واقعات تاریخی حیثیت سے صحیح اور ممکن الثبوت ہیں تو اس حقیقت کے اعتراف میں کون پس و پیش کرسکتا ہے کہ آنحضرتؐ تاریخ عالم میں انسانیت کے عظیم ترین نجات دہندہ ہیں ۔